Registered No. L. 4534

منظورکردہ صوبہ سندھ و ریاست بہاول پور و ریاست بھوپال برائے گورنمنٹ سکول

مارچ ۱۹۴۴ء — جلد ۸ — عدد

ماہنامہ

پیغامِ حق

اِصلاحی اور اخلاقی، علمی اور دینی مضامین کا ذخیرہ

مرتبہ

سیّد محمد شاہ، ایم۔ اے

دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

ت سالانہ چار روپے

ہماری تازہ مطبوعات

اقبال کا تصور زمان و مکان

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی، ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی

زمان و مکان (Time and Space) کا مسئلہ قدیم زمانہ سے حکماء و فلاسفہ کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے، ناممکن تھا کہ اقبال علیہ الرحمۃ اس مسئلہ سے احتراز برتتے، چنانچہ آپ ٦ لیکچروں میں اکثر و بیشتر اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں، جب تک اس مسئلہ کو سمجھا نہ جائے ٦ لیکچروں کا سمجھنا بے حد مشکل ہوگا، ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن کا ممنون ہونا چاہئیے کہ انہوں نے اس مشکل کو اردو داں عوام اور اہل علم کے لئے آسان کر دیا ہے۔

قیمت ۱۰ آنے

موت و حیات
اقبال کے کلام میں

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن نے اس شاندار ادبی مضمون میں نہایت وضاحت سے ثابت کیا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک موت اور زندگی کا کیا مفہوم ہے اور ان کی کس قدر اہمیت ہے۔

قیمت ۴ آنے

اقبال کے چند جواہر ریزے

خواجہ عبدالحمید صاحب، ایم۔اے، پروفیسر فلسفہ، گورنمنٹ کالج، لاہور

نے

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی صحبت میں بیٹھکر جن ملفوظات کو سنا انہیں وہ گاہ بگاہ اپنی بیاض میں نوٹ فرماتے رہے، یہ کتاب انہی ذخائر بے بہا کا مجموعہ ہے۔

قیمت ۱۰ آنے

اشتراکیت اور اسلام

مولوی محمد مظہرالدین صدیقی، بی۔اے، حیدرآباد دکن

نے

اس پمفلٹ میں اشتراکیت اور اسلام کا اس قدر واضح طور پر موازنہ کیا گیا ہے کہ اشتراکیت کا تمام تار و پود کھول کر رکھدیا ہے۔ کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔

قیمت ٦ آنے

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے | وڈ سارنے چھ روپے

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد ۸	مارچ سنہ ۱۹۴۴ء	عدد ۳

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس بیرون اکبری گیٹ لاہور

میں طبع کرا کر دفتر رسالہ "پیغام حق" ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

اس وقت سب سے بڑی مصیبت جو مشرق اور بالخصوص اسلامی ممالک کے سروں پر منڈلا رہی ہے وہ ان کا قدیم جمود اور سکون ہے اس انجماد فکر نے ان آبادیوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ دنیا کے ایک بڑے حصے پر جو انقلاب اس وقت آنے والا ہے اس کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے کے لئے جہانِ اسلام فنی اور اصطلاحی اعتبار سے ابھی بہت پیچھے ہے۔ وقت کی سب سے بڑی مانگ یہ ہے کہ اس صورت حال کا ایک صحیح جائزہ لیا جائے، جو اس خوفناک صورتِ حال کا باعث ہے۔

سب سے اولین حقیقت جو اس راہ میں قدم اٹھاتے ہوئے ہمارے پیش نظر رہنی چاہیئے، وہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی تعلیمات کے بارے میں ہم ایک واضح مقدمہ اپنے سامنے رکھ لیں؟ جس کی تفصیلات کے گوشے دور دراز کونوں میں پھیلے ہوئے ہوں۔ ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ان کا ایک مختصر سا خاکہ جس میں اختصار اور جامعیت کے اجتماع کو بدرجہ اتم موجود رکھا گیا ہو، اپنے سامنے رکھیں۔ پھر اس کی روشنی میں ہم موجودہ وقت کے اہم مسائل پر اپنے قلم کو حرکت دے سکتے ہیں۔

حالات اور واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ جہانِ اسلام اس وقت نہ تو مغرب کو کوئی نیا پیغام حیات دینے کا اہل ہے اور نہ اس کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نے کسی خود دارانہ اقدام کا اظہار کیا ہے۔ مشرق کے جیب میں سب سے بڑا سرمایہ ایک رہبانیت آمیز روحانیت تھی، مگر وہ انسان جو کائنات مادی کا

تجزیہ اور تحلیل کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو، جس کے پیش نظر کائنات کی تسخیر ہو، اس کو دیانت ہوگا اور تصوف کا کوئی مشن بھی زندہ نہیں کر سکتا۔ پھر جوب کے بغیر کلیمی بھی کارِ بے بنیاد ہے۔ اس دیانت لوگ، اور تصوف کی حقیقت نجومی مسخروں سے بڑھ کر کیا رہ جاتی ہے۔ روحانی تجربہ، جب تک اس نوعیت کا حاصل نہ ہو کہ وہ زندگی کے اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر ایک نیا اجتماعی تصور وضع کرے، لاشے اور تحصیل حاصل ہے اس مذہبی تجربہ کا انجام گمراہی، غضب اور ہلاکت ہے۔ اس "ملا عفت اندر حرم" سے تو مغرب کا "کافر بیدار دل" ہزار درجہ بہتر ہے۔" کارل مارکس کا یہ نظریہ صحیح ہے۔ کہ ذرائع پیداوار کے نئے گوشوں کے انکشاف اور انسان کے فکر کے باہمی عمل پر اجتماعی زندگی کے ارتقاء کا مدار ہے۔ ایسی قوم جو فطرت کی تسخیر کے نصب العین کو ترک کر کے محض امکانات اور تصورات کی دنیا میں الجھی ہوئی ہو، اس پر زندگی کا اطلاق واجب نہیں۔ عربی دور میں مسلمانوں کی زندگی کے دو مظہر تھے، اوّل فکری استعداد کی زندگی، دوم پیدا وار کے نئے ذرائع کی دریافت کی جستجو۔ عجمی دور، جو خلافت عباسیہ کے انقراض پر شروع ہوا اس صحیح راہنمائی سے خالی دامان تھا مغلوں کی راہنمائی کے لئے زوال اسلام کے "علمی دماغ" تھے، اس لئے مغل ترک اپنی فطری تندہی کے بل پر صرف اسلامی ممالک کی حدود کی حفاظت کر سکے۔ وہ ملت اسلامیہ کی اصلاح اور احیائے دین کے لئے کسی نئی دعوت کا مرکز تنفیذ نہ بن سکے۔ جب اسلامی ممالک اس "رومن دور" سے گزر رہے تھے، اس وقت یورپ کے ممالک ایک نئے ذہنی انقلاب سے دوچار تھے، ان کا یہ ذہنی انقلاب رہبانیت، اور افلاطون کے اشراقی فلسفے سے انقطاع پر مبنی تھا۔ انہوں نے اپنی حکومت کی بنیاد عربوں کے استقرار (INDUCTION) پر رکھی اور کائنات کی تسخیر کی طرف لگ گئے۔ مغربی ممالک کے سامنے حکومت نے دو مسئلے پیدا کر دیئے۔ ایک مسئلہ کائنات فطرت کی تحقیقات تھا، دوسرا انسان اور جماعت کے انقلابات کے تعلقات کا مسئلہ تھا۔ اس دور میں اسلامی ممالک رہبانیت کے جیل خانہ میں بند رہے، وہ ترکوں اور مغلوں کی ستم کیشی کے باعث، اس انداز فکر و عمل کو بھول گئے، جس کی بنیاد آنحضرتؐ نے رکھی تھی اور جس کی مادی تفصیلات کو عربوں کے

ابتدائی علماء نے زیادہ واضح صورت میں پیش کیا تھا۔

اسلامی تاریخ کا نفسیاتی مطالعہ اسلام کے مقاصد کی تدریجی تخریب کا عجیب اور افسوسناک مرقع ہے۔ اسلام اپنے وقت کی سب سے بڑی انقلابی قوت تھا۔ اس نے ایک زبردست امت کا قوام حیات صالح عناصر کے ترکیب و امتزاج سے تیار کیا۔ پھر اس انقلاب کو قوت اور جبروت کے سروسامان سے مسلح کر کے اس کو نفاذ اور امر کے حقوق عنایت کئے۔ یہ انقلاب برق آسا سرعت سے اٹھا اور ایک قلیل المہلت وقفے میں اس نے قدیم تمدن دنیا کے ایک کثیر حصے کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ مگر دنیا کا ہر انقلاب اپنے ارتقاء اور شگفتگی کے لئے افراد کاملہ کا منتظر رہتا ہے۔ ان افراد کے گزر جانے کے بعد انقلاب اپنے نافذانہ پہلو کو بڑی دقت سے قائم رکھ سکتا ہے۔ اس وقت ہر ایک انقلاب دو صورتیں اختیار کرتا ہے، یا تو انقلاب ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ارتجاعی قوتیں قبضہ اور تصرف حاصل کر لیتی ہیں۔ یا انقلاب کی انجذابی شدت ختم ہو جاتی ہے صرف اس کی دفاعی قوت باقی رہ جاتی ہے۔ اسلام چونکہ ایک زبردست قوت تھا اس لئے اس میں دفاع اور انجذاب کی دونوں قوتیں آنحضرتؐ کی سیرت پاک کے طفیل جمع تھیں۔ آنحضرت کی وفات سے پچاس سال تک اسلام ایک انجذابی اور دفاعی قوت رہا۔ اس انجذاب اور دفاع کے اتحاد کو "خلافت" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے اس صورت حال کو "خلافت راشدہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کے بعد اسلام نے ایک مختلف صورت حال اختیار کی، اس کو آنحضرتؐ خود اپنی چشم حقیقت بین سے دیکھ چکے تھے اس کو حضور سرور کائناتؐ نے "خلافت ملوکی" یا ملک عضوض کے نام سے موسوم کیا۔ اس خلافت میں گو اسلام کے جذبی پہلو کا نقدان تھا، مگر اس میں فوائد بھی تھے۔ ان فوائد کو ہم حفظ ثغور و حدود اسلامیہ کے نام سے موسوم کریں گے۔ اس دور میں اسلامی معاشرت کے بنیادی خصائص مسخ ہو چکے تھے مگر پھر بھی ایک حد تک موجود تھے آنحضرتؐ نے اس دور کے حکمرانوں کو مورد طعن تو ضرور قرار دیا تھا، مگر ان کے خلاف خروج اور بغاوت کو آپ نے معیوب بھی قرار دیا تھا۔ آئندہ

دستوری اصلاح کے لئے امت کے اکابر نے ہمیشہ سعی کی۔ مگر خلافت ملوکی کے حکمرانوں سے بنزد آزمائی کے عقیدہ کو حضور سرور کائنات نے ہمیشہ نگاہِ عتاب سے دیکھا۔ اسلام کے سیاسی مقاصد کے بارے میں یہ ایک اہم بحث ہے، اس کو ہم کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں، اس وقت ہمارے سامنے صرف "پیغام حق" کے مسلک دعوت و تذکیر کی وضاحت ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو، جو دس کروڑ نفوس کی تعداد کے مالک ہیں، اسلام نے ایک زبردست امانت سپرد کی ہے اس سے قبل اس امانت کی حفاظت کے فرائض مغلوں، پٹھانوں اور ترکوں کے سپرد رہے، جو اسلام کے عبوری دور میں اس ملک میں وارد ہوئے، انہوں نے اپنی طبعی صلاحیتوں کے مطابق اس پیغام کو ہندوستان کی آبادی سے روشناس کیا۔ گو اس دور میں ان قبائل کے داخلی معاملات نے اسلام کی سیاست کو مکدر اور ملوث کیا مگر یہ ایک امر واقعہ ہے، کہ وسط ایشیا کی ان جنگجو قوموں نے اس بر اعظم کی ایک زبردست خدمت کی۔ انہوں نے علم و فضل، نظم و نسق اور رفاہِ عام کے مختلف گوشوں میں اس ملک کو جہالت کے غار سے نکال کر عروج کے بام پر پہنچا دیا۔ موت اور حیات کا قانون افراد کی طرح اقوام و ملل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے یہ قومیں اور قبائل اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد فنا کے بحر ذخار کا جز و بن چکی ہیں، مگر اسلام، جو ایک آگ ہے، وہ افراد اور قوموں کے عروج و زوال سے وابستہ نہیں بلکہ قومیں اور افراد وابستہ ہیں۔ ہماری زیست اور موت اسلام سے وابستہ ہے اسلام ہمارے دامن سے بندھا ہوا نہیں ہے اس لئے ہمارے سامنے اسلام کے فرزند ہونے کی حیثیت سے کچھ فرائض ہیں ان کو نبھانے سے ہی ہم اس بر اعظم میں ایک باعزت زندگی کے حق دار بن سکتے ہیں

ہمارے سامنے اس وقت ایک زبردست قوت ہے جو اس وقت انسانیت کے تمام شعبوں پر قبضہ اور تصرف کے لئے بیتاب ہے۔ اس قوت کا نام حکیمانہ زاویہ نظر (SCIENTIFIC METHOD) ہے۔ اس قوت کی ایجاد کا سہرا عربوں کے سر پر ہے۔ مگر عرب، جو اسلام کی روح کے صحیح نمائندہ تھے اپنے

پیغام کے وارثوں کے باب میں سخت بدقسمت ثابت ہوئے۔ اسلامی ثقافت کی بنیاد حقیقت کے ملہمانہ علم و بصیرت پر تھی۔ اس ملہمانہ علم و بصیرت کے لئے کائنات مادی کا علم ایک لازمی تکملہ تھا۔ اس لئے عربوں نے آنحضرتؐ کی ترغیب کے ماتحت استقرائی حکمت کی طرف توجہ کی، اور بہت جلد اس کے موجد اور مربی بن گئے مگر عجمی اقوام محض اسلام کی ذوقی زندگی کے نمائندہ رہیں۔ وہ صرف تخیلات کی دنیا تک ہی محدود رہے اس لئے خلافت عربی کے خاتمہ کے بعد استقرا اور تجربہ اسلام کی علمی زندگی سے خارج کر دیئے گئے۔ اب علم محض حاشیہ آرائی تک ہی محدود ہوگیا۔ بعینہٖ یہی صورت قدیم یونانی تہذیب کو پیش آئی۔ یونان والے، جب رومن عسکریت کے محکوم ہوگئے، تو اس خالص عسکریت نے علم کی طرف سے روگردانی کی، اور تہذیب کی بنیاد خالص عسکریت اور استعمار پر قائم کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ رومن تہذیب، جو یونانی تہذیب ہی کی ایک منزل تھی، ختم ہوگئی۔ آنحضرتؐ اس تاریخی تجربہ سے اپنی روحانی بصیرت اور ملہمانہ فہم کے باعث آگاہ تھے۔ اس لئے آپ نے یونانی اور رومن تہذیبی تصورات کو ٹھکرا دیا جن کی بنیاد نسل و خون کے رشتہ پر رکھی گئی تھی۔ اسلام نے تہذیب و ثقافت کی اخوت کے لئے عقائد اور اعمال کی بنیاد تلاش کی۔ اس عقیدہ کی بنیاد فرد اور سیرت کو قرار دیا۔ گویا اسلام کے نزدیک فیصلہ کن عامل فرد، سیرت، احساس اور ارادہ ہیں یہی وجہ ہے، کہ اسلام نے اپنی دعوت کا اعلان يُخْرِجُ الحی من المیت کے تصور سے کیا ہے۔ اسلام حیات کو اصل قرار دیتا ہے۔ معاشی عوامل، جنسی علائق اس ارادہ حیات کے برگ و بار ہیں اصل حیات ہے عقیدہ اور عمل کی بنیادوں کے بعد اسلام نے اپنے نظام کو ایک مسلسل تاریخی عمل (HISTORICAL PROCESS) کی حیثیت دے دی۔ اسلام نے تہذیب کے احساس بقا پر زور دیا، اور اس حقیقت نے اس نئے تصور کی تشکیل سے اسلام کو خلافت عربیہ کے سقوط پر کامل تباہی سے بچا لیا۔ آج بھی اسلام ایک زبردست ہلاکت کے نرغے سے نکلا ہے، اور وہ وقت دور نہیں جب ایک بار پھر ربع مسکون پر اسلامی سطوت کا پرچم لہراتا نظر آئے گا۔ عجمی خلافت اور سلطنت کے اجراء پر اگر اسلام کو

عسکریت مل گئی جس نے سات سو برس تک اسلام کے لئے سینہ سپر ہو کر اعداء کا مقابلہ کیا۔ مگر اس لئے تفکر اور حکمت کا خاتمہ ہو گیا، علم محض تصورات اور تخیلات تک محدود ہو گیا۔ ادب محض بناوٹ اور تصنع بن کر رہ گیا۔ فقہ اسلامی کے زیر ترغیب، انسان کے جماعتی مسائل کا جو تجزیہ عربوں نے شروع کیا تھا وہ اب ایک بند کتاب ہو کر رہ گیا۔ زندگی محض رسم بن کر رہ گئی۔

عین اس وقت یورپ کے لوگ ایک نئی کروٹ لے رہے تھے۔ یورپ کے علم پر کلیسا نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ارباب کلیسا کا علمی ماحول اور پس منظر رومن عسکریت کی احتیاجات کا پروردہ تھا، اس لئے اس خارجی لحاظ سے اس میں ارسطو کی منطق کی طرح جمود تھا۔ داخلی طور پر اس پر افلاطونی رہبانیت چھائی ہوئی تھی۔ رہبانیت اور کلام ایک ہی غیر معمولی مظہر حیات کے دو رُخ ہیں۔ اقتدار اور تصرف کے لحاظ سے جب ایک نظام اپنے تمام امکانات ختم کر دے، تو اس کا ردّ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یورپ نے جب پندرہویں صدی میں قدم رکھا، تو اقوام مغرب نے یکے بعد دیگرے ارباب کلیسا کے اقتدار سے کھسکنا شروع کیا۔ انہوں نے اس لایعنی روحانیت سے تنگ آ کر اپنے لئے نئے سامان دلچسپی پیدا کئے۔ انہوں نے قدیم دنیا کے تصور وطن کو اپنایا۔ یورپ کی قومیں اسلام کے زندگی بخش عقیدہ سے اس لئے محروم رہیں کہ سولھویں اور سترہویں صدی میں اسلام کی قیادت مغلوں، ترکوں، اور سلجوقوں کے ہاتھ میں تھی۔ اگر اس وقت انسانی فکر کی راہنمائی عربوں کے ہاتھ میں ہوتی جو روح اسلام سے حقیقی طور پر واقف تھے، تو یورپ کے کثیر حصے پر اس وقت اسلام کا پرچم لہراتا ہوا نظر آتا، مگر صورت حال اس توقع کے برعکس تھی۔ اس لئے مغلوں نے ایک مدت تک مسلمانوں کی آبادیوں کو یورپ کی اس نئی تہذیب کے حملوں سے بچائے رکھا، اور وقت وہ آ پہنچا کہ مغربی تمدن میں داخلی قوتوں نے ایسا رخ اختیار کیا جو اس کی شاخ حیات کو کاٹنے والی تھیں۔ یورپ نے کلیسا کی شکست کے بعد تہذیب کی بنیاد عقل اور خرد کے سریع الحرکت ہاتھوں میں دے دی، مگر عقل حیات کی کثرت کا مطالعہ کرتی اور وقت

کا احساس اس کے لئے ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ داخلی کشمکش کا مسئلہ اس وقت [illegible]
لاینحل ہے۔ حکمت اور خرد صرف زندگی کے مظاہر پر تنقید کر سکتی ہے۔ اجتماعی [illegible] زندگی کے لئے
کوئی مستقل بنیاد نہیں بنا سکتی۔

اسلام اس وقت خاموش ہے، وہ اس ہنگامہ دار و گیر میں جس کو مغربی تہذیب کی داخلی کشمکش
نے پیدا کیا ہے ایک منفی قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہ اب مغرب اس سے عناد رکھتا ہو
کفر اس وقت اپنے فساد کی آگ میں خود کود پڑا ہے۔ اسلامی ممالک کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے، کہ
وہ ابھی تک اپنی قوتوں سے بے خبر ہیں۔ ان کو اپنے تاریخی دورِ عظمت کا کوئی احساس نہیں۔ اگر ایک بار
ان قوموں کو اپنے مشن کا احساس ہو گیا تو وہ دن دور نہیں، جب ہم ایک نئی دنیا کے آفتاب کے
طلوع کا نظارہ اپنے سامنے دیکھیں گے۔

اس پرچہ سے ہم نے منظومات کا حصہ پیغامِ حق میں بڑھا دیا ہے تاکہ ثقیل خوراک
کے ساتھ ساتھ "ہاضم چورن" بھی مہیا ہو جائے۔ انشاء اللہ العزیز اس حصہ میں اچھے سے
اچھا انتخاب شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اقبال کی شاعری کا مرکزی نقطہ

(از مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب مدراسی عمری)

عام طور پر علامہ ڈاکٹر اقبال ایک ایشیائی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کے متعلق محض اتنا ہی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایرانی و عربی شعراء کی طرح ترانے گائے اور بس، اگر ظاہر بینی کو چھوڑ کر حقیقت بینی سے کام لیں تو اقبال کچھ اور ہی نظر آنے لگتے ہیں۔ کاش ظاہر بین لوگ اقبال کے کلام کو ایک غائر نظر سے دیکھتے اور سوچتے کہ انہوں نے امت مسلمہ کو کس قسم کی تعلیم دی اور اپنے انہی ترانوں کے اثر سے کیا سے کیا کر دکھایا۔ سچ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال قبل جو پیغام وادی بطحیٰ کی چٹانوں سے ایک منڈتے ہوئے سیلاب کی طرح نمایاں ہوا تھا اسی پیغام کو اقبال نے اپنی گمراہ ملت کے روبرو ان کی زبوں حالی پر آنسو بہا کر یاد دلایا اور بتایا کہ مسلمانو! جب تک تم اس پیام کی رسی کو مضبوط پکڑے رہو گے اس وقت تک تمہارے اندر کبھی پسپائی نہیں آسکتی اس کو ایک نہیں دو نہیں بیسیوں تجربوں نے ثابت کر دکھایا ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہمارے بزرگوں اور سلف صالحین نے دنیا میں کیسے کیسے حیرت انگیز کارنامے بطور یادگار چھوڑے جو تاریخ کے صفحۂ قرطاس پر ثبت ہو کر تا ابد جلوہ گر رہیں گے جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ انہوں نے پیغام نبیؐ کو اپنا لائحۂ عمل بنا لیا تھا اور اس کو ہمہ تن عمل ہو کر بالاستقلال انجام دیا تھا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ یہی وہ ذریعہ تھا جس کے باعث انہوں نے وہ کارنامے کئے جو ہر قرن کے مسلمانوں کے لئے طرۂ امتیاز اور مشعل راہ ہیں۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب آئیے ڈاکٹر اقبال کی اہم تعلیمات کی ہم کسی قدر تشریح کئے دیتے ہیں۔

اقبال نے کہا کہ ملت اسلامیہ کا نصب العین محض قرآن ہے اور بس کیونکہ یہاں تمام قوانین وضوابط کا مجموعہ ہے جس کے روبرو دنیا کے بڑے سے بڑے اہل اصول کو بھی سرنگوں ہونا پڑا۔اس نے ان تمام دیرینہ رسوم وآئین کے پردے چاک کروائے جن کو صدیوں سے جمیع بنی نوع انسان نے اپنا لائحہ عمل بنا رکھا تھا سب سے پہلا اور اٹل اصول توحید ہے اس کی یہ تاثیر ہے کہ جب وہ انسان کے دل میں مرکوز ہو جاتا ہے تو دنیا میں حوادثات کی ہوا کا کوئی جھونکا اس کو متزلزل نہیں کر سکتا اور اس کو کسی قسم کے فتنہ انگیز اور ہنگامہ خیز طوفان سے خطرہ نہیں ہو سکتا۔خوف وخطر اور یاس وبیم توحید کے بالکل منافی ہیں۔انہی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اقبال نے کہا ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اقبال کے کلام کا لب لباب اور اس کا نچوڑ وہ شرائط واصول ہیں جن کو انہوں نے اسرار خودی، اور رموز بیخودی، میں واضح کیا ہے، پہلی شرط خودی، دوسری بیخودی اور تیسری عشق کا استحکام ہے۔

اقبال کی شاعری کے پانچ دور مانے گئے ہیں اور یہ مثنویاں ان کے چوتھے دور کی تسلیم کی جاتی ہیں، ان دونوں مثنویوں میں تعلیمات اسلامیہ کا خلاصہ مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔

آج تک جتنے شعراء گذرے ہیں مغربی ہوں یا ایشیائی، ایرانی ہوں یا عربی ان کے کلام میں اگرچہ حقائق کا اظہار ایک حد تک ہے۔مگر اقبال ہی وہ شاعر ہے جس نے خودی و بیخودی کی تعلیم کو اپنا اصل اصول قرار دیا ہے جس میں انسانی تربیت کا راز مضمر ہے اس نے بالخصوص امت مسلمہ کو ارادوں اور ہمتوں میں بلندی، عالی حوصلگی ایثار اور قربانی کے جذبات پیدا کرنے کا بہترین سبق دیا۔اس خودی کو حضرت آدمؑ کے واقعات اور دیگر حکایات سے ثابت کیا اور کہا کہ قرآن عزیز میں شروع سے لے کر آخر تک اسی خودی کو مختلف پیرایوں میں واضح کیا گیا ہے ایک جگہ فرمایا:۔

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔انسان کا اپنے کیفیات نفسانی اور حالات باطنی کا گہرا مطالعہ کرنا

اور ان میں غور و خوض کرنا خودی ہے خودی سے مرد کی سیرت محکم اور مضبوط ہوتی ہے اور بیخودی سے
ملت کی۔ خودی کیا ہے؟ وہ ایک جوہر نوری ہے جو اس مشت خاک کے اندر پوشیدہ ہے اسی نور کا نتیجہ ہے
کہ انسان سے اندر ادراک قوت و توانائی، زندگی میں ہنگامہ آرائی، ہمتوں میں بلندی، اور بلند حوصلگی
اور چستی و چالاکی جلوہ گر نظر آتی ہیں یہی وہ نور ہے جو مقاصد کی بلندی، باطل سوز تابناکی اور حق کی
اشاعت کا باعث ہے، جد و جہد دریائے خودی کی موج ہے انسان کی عملی قوت خودی کی پیدا وار ہے
اور آرزو محفل خودی کی شمع حیات افروز ہے۔ خودی عشق سے پائدار ہوتی ہے عشق نام ہے کسی چیز کو
اپنے اندر جذب کر لینے کا اور اس کی جب تک کوئی جھلک اس جسدِ عنصری کے اندر پیدا نہوا اس کے اندر
خودی مفقود ہے عشق سے مراد عشق نبوی ہے نہ کہ عشق قیس عامری ہم اس جہاں کے اندر خودی کی
پرورش کے لئے آئے ہیں یہ جہاں خودی کی ابتدائی منزل ہے ع

این جہاں دیباچۂ افسانہ ما است ۵۰

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے   خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

بندہ خلاق تقدیر ہے نہ مخلوق تقدیر وہ تقدیر کا رہین منت نہیں بلکہ تقدیر اس کا شکار ہے۔
ہمارا نصب العین خودی کے مدارج و منازل طے کرنا ہے اور یہ بغیر عشق اور محبت کے ناممکن ہے یعنی
خودی پرورش اور ترقی کے لئے اتباع کتاب و سنت کا ولولہ اپنے دلوں میں جاگزیں کر لینا چاہئے۔

خودی کے تین مرحلے ہیں پہلا مرحلہ طاعت الٰہی اور آئین و حدود کی پابندی، یہ دستور محض انسان
کے ساتھ مختص نہیں بلکہ غور سے دیکھا جائے تو کائنات کا سلسلہ اس دستور کے ماتحت ہے موجودات
کے ہر ذرہ کے اندر یہ وصف نمایاں ہے اور ہر یک چیز اپنے کمال شخصی کو پہنچنا چاہتی ہے وہ اسی
آئینی پابندی کے ذریعہ پہنچتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کے لئے اس کے عروج و ارتقا کے
چند اصول ہوا کرتے ہیں مثلاً مشک نافۂ آہو میں مقید رہ کر خوشبو لاتی ہے شمشاد پا گل ہو کر چمن میں

آزاد کہلا جاتا ہے نباتات اپنے نشو و نما کے اصول کی پابندی سے نشو و نما پاتے ہیں اور سیارگان فلک اپنے ایک خاص آئین کے ماتحت چکر کاٹتے ہیں دن جاتا ہے تو رات آتی ہے موسم خزاں کے بعد موسم بہار پیدا ہوتا ہے تاکہ نظام کائنات میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہو غرضکہ کائنات کی ہر شے اسی قسم کی آئینی پابندی میں مصروف و منہمک ہے، اس پابندی کو قید و غلامی سے تعبیر نہیں کر سکتے اس طرح آئین الٰہی کی پابندی کرنا طاعت الٰہی کہلاتا ہے ؎

باطن ہر شے ز آئینے قوی تو چرا غافل ز ایں ساماں روی

خودی کا دوسرا مرحلہ ضبط نفس ہے۔ انسان کی مثال اس اونٹ کی سی ہے جس کی باگ اگر ہاتھ میں رہے تو اس کو جس طرف چاہیں اور جیسا چاہیں موڑ سکتے ہیں اور اگر اس پر ہمارا بس نہ رہا تو اس کا جدھر رُخ پھرے اس طرف ہم کو بھی رُخ کرنا پڑے گا اور اختیار کو ہاتھ سے کھو دینا پڑے گا ارکان اسلام کی پابندی درحقیقت ضبط نفس ہے جب تک ارکان خمسہ اسلام پر ہمہ تن ہو کر عمل نہ کیا جائے گا اس وقت تک ضبط نفس میں بھی ترقی ناممکن ہوگی۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج میں ضبط نفس کے علاوہ اور کچھ نہیں نماز بحر توحید کی موج ہے، زکوٰۃ مال کی محبت کو کم کرتی ہے اور اخوت و مساوات کے درجہ کو مستحکم کر دیتی ہے روزہ بھوک اور پیاس کو جو توائے بہیمیہ سے ہیں شکست فاش دیتا ہے اور حج مرکز کی طرف ہجرت سکھلاتا ہے اور حُبِ وطنی کی جڑ کو منہدم کر دیتا ہے۔ یہ پانچ ارکان وہ ہیں جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے، انہی ارکان کی پابندی کا دوسرا نام ضبط نفس ہے۔

خودی کا تیسرا مرحلہ نیابت الٰہی ہے جس کو خلیفۃ اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جب انسان اس مرحلہ میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنے کمال شخصی کے درجۂ اعلیٰ پر پہنچ جاتا ہے کیونکہ درحقیقت انسان دنیا میں حاکم اور خلیفہ بن کر آیا نہ کہ محکوم اور مقہور ہو کر۔ دنیا کی تمام کائنات اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہے اس کا فطری نصب العین نشر توحید اور اشاعت اسلام ہے اس میں جب وہ منہمک ہو کر پیہم کوشش کرتے

لگتا ہے تو دنیا کی بڑی سی بڑی قوت کو بھی اس کے روبرو سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔

یہ تین مرحلے ہیں خودی کے جن سے خودی تربیت پاکر کمال کے بلند زینہ پر پہنچ جاتی ہے گرخودی کے لئے جدوجہد لازمی ہے اس کا دار و مدار اسی جدوجہد پر رکھا گیا ہے۔ زندگی نام ہے اپنے ہی محور پر گھومنے کا اور اس خیاباں سے گل چننے کا ؎

زندگی از طوف دیگر رستن است   خویش را بیت الحرم دانستن است

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ زندگی دراصل نام ہے خودی کی تکمیل و تربیت اور اس کی نمود کا ؎

چوں خبر دارم ز ساز زندگی   با تو گویم چیست راز زندگی

غوطہ در خود صورت گوہر زدن   پس ز خلوتگاہ خود سر بر زدن

اب میں فلسفۂ خودی کی مختصر تشریح کر دینے کے بعد فلسفۂ بیخودی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کیونکہ انفرادی خودی کے بعد قومی خودی کی بھی تشریح کر دینی ناگزیر ہے۔

فرد کے ملت میں گم ہو جانے کا نام بیخودی ہے، فرد کا جو کچھ ہے وہ سب ملت کا ہے، فرد کی تمام ضروریات کا انحصار اگر ملت پر ہو تو نتیجہ یہ نکل آتا ہے کہ وہ اس قطرہ کی مانند ہو جاتا ہے جو اپنی وسعت طلبی کے باعث قلزم بے پایاں بن جائے ملت ایک لڑی ہے تو اس کے افراد موتی وہ کہکشاں ہے تو یہ اختر، چونکہ فرد کی پرورش ملت ہی سے ہوتی ہے اس وجہ سے وہ ملت ہی کے باعث احترام حاصل کرتا ہے اور جب ملت کا انحصار افراد ہی پر ہوتا ہے تو اس وجہ سے وہ افراد کے ذریعہ نظام حاصل کرتی ہے ؎

فرد میگیرد ز ملت احترام   ملت از افراد می یابد نظام

فرد و ملت ایک دوسرے کے آئینہ ہیں فرد کو ملت کی عینک سے دیکھنا چاہیئے اور ملت کو فرد کی عینک سے ؎

فرد و قوم آئینۂ یکدیگر اند   سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند

ملت اور فرد لازم و ملزوم ہیں ہر ایک کی بقا بغیر ایک دوسرے کے قائم نہیں رہ سکتی جب فرد ملت کے اندر گم ہو جاتا ہے اور اپنا سب کچھ ملت کی ضروریات پر نثار کر دیتا ہے تو ہر فرد بجائے خود ملت بنجاتا ہے گویا یہ بھی ایک خودی کا انتہائی درجہ ہوا مگر ملت کی پرورش کے واسطے ایک صاحب دل ضرورت پڑتی ہے اور اس وقت تک ملت پر جمود اور بیحسی طاری رہتی ہے اس کی مثال اس ساز کی ہے جس کو مطرب نے اب تک نہ چھیڑا ہو اس صاحب دل سے ملت کے ہر ہر فرد میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی کے ذریعہ اس کا نظم و نسق درست ہو جاتا ہے۔ ملت کا انحصار دو چیزوں پر ہے توحید اور رسالت توحید کا رتبہ یہ ہے ؎

دیں از و حکمت از و آئیں از و زور از و قوت از و تمکیں از و

اور اس کی تاثیر یہ ہے ؎

پست اندر سایہ اش گردد بلند خاک چوں اکسیر گردد ارجمند

اسود از توحید احمر مے شود خویش فاروقؓ و ابوذرؓ مے شود

توحید ایک فطری چیز ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے یونانی دلائل یا افلاطونی براہین کی ضرورت نہیں اور یہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ نوح علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر آج تک اسی توحید کی آواز جنگلوں اور صحراؤں میں گونجتی رہی ہر ایک نبی کی دعوت اپنے اپنے مخصوص قطعہ تک تھی مگر نبی آخر الزماں نے مبعوث ہو کر اس کو دنیا کے ہر حصہ میں پہنچایا نتیجہ یہ نکلا کہ بعضوں نے تو اس چراغ حیات افروز سے روشنی حاصل کی اور بعض، اسی کے بغض و عناد میں کفر و ضلالت کے کوچوں میں بھٹکتے پھرے۔ جب ملت اسلامیہ کے پاس توحید ایک اٹل قانون اور اساس اصلی ثابت ہو جاتا ہے تو اس کے عروج کے راستہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی بلکہ فتح و نصرت اس کے قدم چومنے کو تیار رہتی ہے توحید حزن و یاس اور خوف و خطر کے بالکل منافی ہے وہ ان امراض مہلکہ کے غلیظ مواد کو جڑ سے نکال کر پھینکتی ہے کیونکہ حزن و یاس جب انسانی ترقی کے لئے سد راہ ہیں تو توحید ان کے حق میں سم قاتل ہے۔

ملت کا دوسرا رکن رسالت ہے رسالت کا مقصود بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ اس کی بدولت انسان بہیمیت کی قید سے رہائی پاکر ایک ایسے عالم میں قدم رکھتا ہے جہاں خدا اور بندے کے میان گہرا ارتباط پیدا ہو جاتا ہے بندہ کی بندگی کا اظہار اس وقت درست ہوگا جب کہ وہ نبی مرسل کی دعوت کو لبیک کہے تاکہ خدا کی رضامندی ہر حال میں اس کے ساتھ قائم ہو جائے۔ رسالت قلوب متفرقہ کے اندر اتحاد و یگانگت اور اس کے ماننے والوں میں ہم نوائی اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے اور اسی کے ذریعہ سب کا مقصود و مدعا ایک ہوتا ہے ؎

از رسالت ہم نوا گشتیم ما   ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

رسول جب اپنے مقصد بعثت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے جانشینوں کا یہ فرض ہے کہ اس کے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت ساری دنیا میں کریں ؎

خدمت ساقی گری با ما گذاشت   داد ما را آخریں جامے کہ داشت

رسالت نے دوسرا بیج اخوت و مساوات اور مواسات کا بویا جس کا نتیجہ یہ نکلا ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز   نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

شہزادہ مراد اور معمار کی حکایت بیان کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں ؎

عبد مسلم کمتر از احرار نیست   خون شہ رنگین تر از معمار نیست

ع   پیش قرآن بندہ و مولا یکی است

قومیت کا نظریہ اہل مغرب کا نظریہ وطن کی جغرافیائی حدود پر مبنی ہے اور یہ نظریہ (THEORY) قومیت و ملت اسلامیہ کے نظریہ کے بالکل خلاف ہے جب مسلمانوں میں اہل مغرب کے اس نظریہ فاسد لی دبا پھیلی تو ان کے حق میں یہ تنزل و انحطاط کا پیش خیمہ ثابت ہوئی نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی حکومتوں میں سرے سے اخوت و یگانگت کا جذبہ تک مفقود ہو گیا ہر ملک کا مسلمان صرف اپنی جغرافیائی حدود کا مسلمان

رہ گیا اور وطنی امتیازات حقیقی سمجھے جانے لگے جس کی بنا پر اتحادِ باہمی کا رشتہ بودا ہو کر رہ گیا جو ادنیٰ سے جھٹکے سے ٹوٹ سکتا ہے مسلمانوں کے اس بھولے ہوئے سبق کو پھر از سرِ نو اقبال نے یاد دلایا اور سیر پہلو سے نرالے انداز میں اس کو سمجھایا چنانچہ تمثیلاً ہم چند اشعار پیش کرتے ہیں۔ ؎

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند　　بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند　　نوعِ انساں را قبائل ساختند
جنتے جستند در بئس القرار　　تا احلوا قومہم دار البوار

مسلم استی دل با قلیمے مبند　　گم شو اندر جہانِ چوں و چند
ہندی و رومی سفالِ جامِ ما است　　رومی و شامی گلِ اندامِ ما است
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست　　مرز و بوم او بجز اسلام نیست

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم (پیامِ مشرق) ۱۲

جس طرح اقبال نے امتِ مسلمہ کے لئے کوئی مکان یا حد مقرر نہیں کی اسی طرح اس کے لئے زمانہ بھی متعین نہیں کیا بلکہ اِنّا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون سے استدلال کرتے ہوئے ثابت کیا کہ ذکر کی حفاظت میں ذاکر کی حفاظت کا بھی وعدہ آچکا ہے اس لئے مسلمانوں کا وجود تا قیامِ قیامت قائم و باقی رہے گا۔

خلافت کا تصور

(تاریخی پس منظر)

(از جناب عبدالقدیر خاں صاحب)

اسلامی ریاست کا تصور اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہ جائے گا جب تک ایک نظر خلافت کی تاریخی حیثیت پر نہیں ڈال لی جاتی۔ کیونکہ اسلامی ریاست کے تصور کا تدوجزر بہت حد تک اس ادارے پر دارومدار رکھتا ہے۔ خلافت کی تعریف یہ ہے۔

"خلافت ایک ایسا اسلامی ادارہ (ISLAMIC INSTITUTION) ہے جو نظریہ کے اعتبار سے پیغمبر اسلام کی جانشینی کے تصور پر حاوی ہے اسلامی فقہ کی رو سے خلیفہ ملت اسلامیہ میں نائب خدا اور رسول ہے۔ خلیفہ ایک مستبد حاکم نہیں ہونا چاہیئے نہ اس کو ایسے مطلق اختیارات حاصل ہونے چاہئیں کہ کسی کے سامنے جوابدہ ہی نہ ہو۔ گو اس کے پاس بہت سے انتظامی اور عدالتی اختیارات ہوتے ہیں لیکن قانون سازی کے معاملات میں وہ اصول شریعت سے انحراف نہیں کر سکتا۔ استبداد (DESPOTISM) شریعت کی روح کے انتہائی طور پر منافی ہے۔ اب ذرا قضاۃ اور انتظامی محکموں کے روابط پر بھی غور کر لیں۔

"شریعت کے نزدیک قضاۃ اور انتظامی امور میں علیحدگی نہیں ہو سکتی۔ شریعت قبل الذکر کو مؤخر کے تابع کرتی ہے۔ لیکن یہ محکومیت (SUBORDINATION) عملاً کسی وقعت کے قابل نہیں کیونکہ خلیفہ اور قاضی دونوں قانون کے سامنے بے بس ہیں۔ یعنی قوت تشریعی کے سامنے دونوں کو سرنگوں

ہونا پڑتا ہے۔ تفریق اور انفصال کامل اگر ہے تو وہ عدالتی اور انتظامی معاملات اور تشریعی معاملات میں ہے اس تفریق میں عدالتی اور انتظامی معاملات ایک طرف ہیں اور دوسری طرف صرف تشریع معاملات (LEGISLATIVE PROBLEMS) یہ تفریق اس تفریق سے بھی زیادہ کامل ہے جو موجودہ قانون میں تسلیم کی گئی ہے "

قضاءۃ اور انتظامی معاملات کے بارے میں ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ کہ جج یا منصف پر عدل و انصاف کے امور میں کوئی خارجی اثر گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس بارے میں کسی انتظامی رکن کی مجال نہیں کہ دخل دے۔ اس لئے قضاءۃ ہر خارجی اثر سے بالا ہو کر انصاف کرتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانون سازی کا مبداء اور (SEAT OF LEGISLATIVE POWER) ماخذ کیا ہے قرآن کے نزدیک تشریع کا حق اللہ کو ہے اس کے علاوہ کوئی قوت اس حق کو استعمال نہیں کر سکتی۔ حکم اور امر کا حق صرف ذات باری کو ہے۔ مگر ذات باری اس قانون کو انسان پر باہر سے نافذ نہیں کرتی نہ ہی اس کے اذعان کے لئے کسی خارجی طاقت یا وسیلہ کی ضرورت ہے تشریع کا مبداء اور ماخذ قرآن حدیث۔ اجماع اور قیاس ہے۔ پھر ملت اسلامیہ کی اجتماعی قوت ارادی یا THE WILL OF THE WHOLE (MUSLIM COMMUNITY) ہے۔ اس بناء پر قانون سازی کا حق صرف ملت کو ہے یا اس نمائندہ جماعت کو جو ملت کی نیابت کرتی ہے اس طرح جدید عوامیہ طرز حکومت (REPUBLICAN FORM OF GOVERNMENT) اسلام کی منشا کے عین مطابق ہے نیز یہ عالم اسلام کے جدید وطنی رجحانات سے بھی موافقت رکھتی ہے۔ قرآن نے پھر اجتہاد کا تصور پیش کیا ہے۔ تاکہ ملت اسلامیہ وقت کی مصلحتوں کے مطابق قانون سازی کر سکے۔

" قانون سازی کا حق صرف ملت کو ہے۔ خلیفہ اپنی مرضی سے قانون وضع نہیں کر سکتا۔ جدید پارلیمانی طرز حکومت کی یہی بنیاد ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلامی حکومت میں منتخب نمائندے ہوتے تھے۔

ان کو نیابت کا حق اُن کے علم وفضل اور اجتہادی قوت کے باعث ملتا تھا۔"

اسلامی ملت میں اجتہاد کا مقام اس شخص کو نہیں مل سکتا جو ایک کثیر التعداد انسانوں کی بھیڑ اپنے پیچھے لگالے۔ اس کے لئے ایک طرح کے علم وفضل میں کمال و یکتائی کی ضرورت ہے۔ مغربی جمہوریت نے قانون سازی کا حق ماہرین (THE EXPERTS) کے سپرد نہیں کیا بلکہ اس حق کو تمام ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا ہے جن کا کام طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے ووٹ لینا ہے یورپ میں انتخاب بھی ایک کھیل ہے۔ آدمی قانون سازی میں خواہ کتنی ہی مہارت رکھے جب تک وہ اس شطرنج کا اپنے آپ کو ماہر ثابت نہیں کرتا اس کے لئے یورپ کی مجالس آئین ساز کے دروازے بند ہیں مغرب کے نظام زندگی کی اس سے بڑھکر حماقت اور بیوقوفی کیا ہوگی۔

انتخاب خلافت کے بارے میں سب سے اہم سوال اہلیت کا ہے امیدواروں میں خلافت کا سب سے زیادہ مستحق وہ شخص ہے ۔جو خلافت کی ذمہ داریوں کے اٹھانے کے لئے موزون ترین شخص ہو انتخاب خلیفہ کے بارے میں ملت کو اپنے ووٹ کا استعمال کرنے میں بہت احتیاط کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔

انتخاب خلیفہ کے بارے میں صرف بلا واسطہ انتخاب ہی ایک ذریعہ نہیں بلکہ اس کے لئے نامزدگی بھی ممکن اور جائز ہے۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مگر ایک خلیفہ کا جواز یا عدم جواز اس کے طریق انتخاب یا قانون وراثت پر منحصر ہے۔ بلکہ یہ لوگوں کے اعلان قبولیت پر ہے۔ اسلام نے اس کو رسم بیعت سے تعبیر کیا ہے۔

خلیفہ کے لئے قرشی ہونے کی شرط ایک پیش گوئی ہے نہ کہ حکم اور امر اس بارے میں ہم قاضی ابوبکر باقلانی اور ابن خلدون کی رائے نقل کر چکے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی یہی رائے ہے۔

خلیفہ جہاں مسلمانوں کی انتظامی زندگی کا کفیل ہے وہاں وہ قضاءت کے فرائض کی بجا آوری کے لئے بھی ذمہ دار ہے۔

خلافت کے تصور کے لئے حریت انفرادی کا قیام بہت ضروری ہے یعنی یہ کہ خلیفہ اسلام مسلمانان اور ماتحت غیر مسلم اقوام کے جان و مال کی حفاظت و صیانت کا ذمہ دار ہے۔ اسلامی طرز حکومت استبداد پر مبنی نہیں ہے اس کا مقصد ایک ذمہ دار حکومت کا قیام ہے۔

خلافت راشدہ کے ایام و وقائع اس بارے میں مشہور ہیں۔ دنیا کی تاریخ کا کوئی گوشہ خلافت راشدہ کے ایک ادنیٰ باب کے مقابلے میں بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے بڑے بڑے فاتح بھی حق گوئی کا کوئی ایسا کلمہ سننے کی تاب نہ لا سکے جس کا مقصد ان سے عوام کے حقوق کے بارے میں احتساب ہو۔ لیکن جناب عمرؓ سے ایک ایک فرد کو پوچھنے کا حق تھا کہ تمہارے کرتہ کی لمبائی کے لئے تمہارا وہ حصہ کفالت نہیں کر سکتا جو مال غنیمت سے تمہیں ملا ہے۔ دنیا کی تاریخ کے ورق الٹ دو۔ اس دور تہذیب میں آؤ۔ یہاں بھی ایسے امثال و نظائر نہیں مل سکتے۔ خلافت راشدہ عدل و انصاف کے لحاظ سے تاریخ انسانی کا ایک عدیم المثال باب ہے۔

خلافت کا قدیم تصور یہ تھا "خلیفہ کی عام حیثیت اختیارات کے لحاظ سے واحد بلا شرکت غیرے اور آزاد ہوتی چاہئے خلیفہ کی سیاسی ذمہ داریاں یہ ہیں۔

۱۔ مملکت اسلامیہ کی اندرونی اور بیرونی حملوں سے مدافعت۔

۲۔ مملکت کا انتظام و انصرام اور اس کی معاشی تنظیم۔

۳۔ مذہبی اور سیاسی حلقوں میں خلیفہ انتظامی قوت کا ایک جزو ہے۔ خلیفہ ان مذہبی قیود کی تکمیل کی نگہداشت کرتا ہے جن کا خاصہ معاشرت کی اصلاح ہے۔ یعنی زکوٰۃ کی فراہمی اور حج کا قیام

۴۔ خلیفہ ان فرائض میں جن کا تعلق ضمیر سے ہے۔ دخل نہیں دیتا۔"

اب ہم قدیم اسلامی ادب کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے سیاسی فکر کی نوعیت کا علم ہو جائے۔

فارابی المتوفی ۹۵۰ء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ فارابی کے نزدیک سلطان کی یہ تعریف ہے "سلاطین سب سے عقلمند آدمی ہونے چاہئیں ان کا کام یہ ہونا چاہئے۔ کہ لوگوں کو عالم آخرت کی مسرت سے آشنا ہونے کی تربیت دیں"

فارابی کا یہ خیال افلاطون سے لیا گیا ہے جس کے نزدیک سلطنت کا کام صرف فلاسفہ کے سپرد کرنا چاہئے تاکہ وہ انسانوں کو تکمیل ذات کی راہ پر چلا سکیں۔

اس کے بعد الماوردی المتوفی ۱۰۵۸ء (AL-MAWARDI) کی کتاب الاحکام السلطانیہ میں نظریہ خلافت بیان کیا گیا ہے۔ نیز خلیفہ کے خصائص پیش کئے گئے ہیں۔ مصنف نے انتخاب خلیفہ کے مختلف طریقوں، وزرا کے اختیارات، اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات و حدود کو نہایت شرح اور تفصیل سے بیان کیا ہے یہ کتاب اس مسئلہ پر ایک لازوال یادگار ہے۔

اس زمانہ کی ایک اور قابل ذکر سیاسی کتاب کا ذکر کر دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس کتاب کا نام ہے "تسہیل الظفر و تعجیل الظفر" اس میں اسلامی نظریہ سیاست کی توضیح کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں نظام الملک طوسی نے بھی ایک یادگار کتاب تصنیف کی ہے۔ کتاب کا نام ہے۔ "سیاست نامہ" نظام الملک نے مندرجہ ذیل تصریحات کی ہیں۔

۱۔ بادشاہ کا فرض ہے۔ کہ علماء کی تنظیم کرے۔

۲۔ بادشاہ کا ایمان کامل ہونا چاہئے۔

۳۔ بادشاہ مذہب کے حاکم نہیں ہیں۔ اس لئے ان کو قانون سازی کا کام فقہا کے سپرد کر دینا چاہئے

۴۔ سلطان کا بہترین مشغلہ اقتصادی کاموں میں دلچسپی لینا ہے۔

۵۔ بادشاہ کو چاہئے کہ ملک کی کاشت کے جدید وسائل و اسباب پیدا کرے پل تعمیر کرائے۔ نئے شہر آباد کرے۔ حفاظت و مدافعت کے لئے قلعے تعمیر کرے۔ راستوں کو درست حالت میں رکھے۔

نئی یادگاریں تعمیر کرے۔

سعدی المتوفی ۱۲۹۲ء نے سلطان کے فرائض پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر اس کو ہم ایک شاعر کے تخیل ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ "بوستان" کا موضوع شعر و ادب ہے۔ نہ کہ سیاست۔

سعدی کے نزدیک بادشاہ کو کمزوروں کی حفاظت میں سرگرم کار رہنا چاہیے اس کو غربا کی مرفع الحالی میں سعی کرنی چاہیئے۔ کمزوروں پر ظلم اور ستم سے اجتناب کرنا بھی اس کے نزدیک ایک اہم فریضہ ہونا چاہیئے۔ اس کے نزدیک معاشرت کے اہم طبقے یہ ہیں۔ مزدور۔ سوداگر۔ سپاہی اور اصحاب الرائے۔ جنگ پر مصالحت کو ترجیح دینا چاہیئے۔ تدبیر اور سیاست میں انتقام سے نفرت کرنی ضروری ہے۔

خلافت کے زمانی لحاظ سے یہ مختلف دور ہیں۔

خلافت مدنی ۶۳۲ء سے لے کر ۶۶۱ء تک۔

خلافت اموی ۶۶۱ء سے لے کر ۷۵۰ء تک۔

خلافت عباسی ۷۵۰ء سے لے کر ۱۲۵۸ء تک

خلافت مملوکی ۱۲۵۸ء سے لے کر ۱۵۱۷ء تک

خلافت عثمانی ۱۵۱۷ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک

۱۹۲۴ء کے بعد سے اب تک خلافت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے کیونکہ عالم اسلام اب ایسے حالات سے دوچار ہے۔ کہ خلافت کا زیادہ دیر تک باقی رکھنا کسی حالت میں مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ ملت اسلامیہ بحیثیت مجموعی اس وقت فتنہ یورپ سے دوچار ہے۔ جب تک یہ ابتلا اور محکومیت کا دور ختم نہیں ہو جاتا ہے اس وقت تک اسلامی ریاستوں کے وفاق کا تصور ناممکن الحصول ہے۔ اس سے قبل بھی عالم اسلام پر ایسے ابتلاآئے ہیں۔ جب عارضی طور پر خلافت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا عالم اسلام کو دولت امیہ کے بعد کبھی کامل داخلی اتحاد نصیب نہ ہوا۔ خلافت عباسی کے ساتھ

ساتھ اسپین اور مصر میں علیحدہ علیحدہ خلافتیں قائم تھیں، مگر عام تفوق مسلمانوں ہی کو حاصل تھا خلافت راشدہ اور مابعد کی خلافتوں میں ایک سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا زاویہ نظر تمام تر اسلامی تھا۔ اس نے سیاسی حیثیت کو کوئی علیحدہ مقام نہیں دے رکھا تھا۔ اس کے برعکس مابعد کی خلافتوں میں دیگر عوامل کارفرما تھے۔ وہاں شخصی اور سیاسی معاملات کی حیثیت اولین تھی یا اس کے برعکس مذہب یا تو لا کا رتھا۔ یا اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ افسوس کہ عربوں نے بہت جلد اسلام کے سبق کو فراموش کر دیا۔ مگر علمائے اسلام نے ہمیشہ سلاطین و رؤسا کے ان غیر معتدل رجحانات کی تردید و تکذیب کی۔ گو اس کی پاداش میں ان کو عقوبت اور تعزیر کے کتنے ہی دردناک مرحلوں سے گزرنا پڑا۔

خلافت اسلامیہ کے بعد کے دوروں میں مذہب اور سیاست کی اس حیثیت کو مدنظر رکھ کر ایک مصنف کا خیال ہے۔

"سیاست کا مذہب پر یہ مسلسل اور تدریجی حملہ اس ضرورت کو نمایاں کرتا ہے۔ کہ اسلام کا تصور حیات دوسرے مذاہب سے قطعاً مختلف ہے۔ اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں، بلکہ یہ ایک آبائی وطن (FATHERLAND) کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ غیر مسلسل خلافت ایک ذیلی اور عارضی ادارہ نہیں۔ اس کی اہمیت اس لئے بہت بڑھ جاتی ہے جب اس پر نگاہ کرتے ہیں کہ یہ تیرہ صدیاں زندہ رہی ہے۔"

درحقیقت ریاست اسلامی کی بنیاد بھی آنحضرت نے خود ہی اپنے دست حق پرست سے رکھی تھی اس کی ہیئت ترکیبی میں ٹیکسوں کی فراہمی، عدالتی نظم و نسق کا قیام، انتظامی اور فوجی ادارے شامل تھے۔ یہ ادارے گو اسلامی عقیدہ کے جزو کی حیثیت نہ رکھتے تھے مگر ان میں ارتقا اور توافق کی بہت گنجائش تھی۔ اسلامی ممالک کا طرز حکومت وحدانی (UNITARY) تھا۔ یعنی مرکز کو صوبجات سے ہر اہم امر کے بارے میں احکام نافذ ہوتے تھے۔ یہ شے اس لئے

ضروری تھی کہ اس وقت اسلامی اقتدار کے نفوذ کا ابتدائی دور تھا۔ اس لئے قیام سلطنت کی ذمہ داریاں ایک زبردست مرکزی حکومت کے قیام کی متقاضی تھیں۔

خلافت راشدہ میں سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق تھے آپ کو مسلمانوں نے منتخب کیا۔ گو حضرت علیؓ سے آپ کو ابتدا میں اختلافات پیدا ہوئے۔ مگر چھ ماہ بعد آپ سے اختلافات طے ہوگئے اور حضرت علیؓ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ حضرت ابوبکر نے جو تقریر خلیفہ منتخب ہونے کے بعد کی۔ وہ ایک یادگار اور تاریخی تقریر ہے۔ انسانی حقوق کا یہ پہلا چارٹر ہے جو اسلام کے ایک زبردست حاکم نے دنیا کو دیا۔ اس تقریر کے تین عناصر ہیں۔ اس میں اسلامی جمہوریت کا اعلان و اعتراف ہے پھر اس حقیقت کا اعادہ ہے کہ اسلامی قانون کی نگاہ میں سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر تقریر کا آخری اہم جزو یہ ہے کہ اسلامی ریاست کا سنگ بنیاد شریعت کی حاکمیت ہے۔ سیادت کا حق صرف شریعت کو ہے یہ تقریر اسلام کے تمام سیاستدانوں کے لئے سرچشمہ بصیرت ہے۔ جب ہم دنیا کی سیاسی تاریخ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ تو انسانی حقوق کے حصول کے لئے ہم خون انسانی کا ضیاع دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ یورپ ابھی تک آزادی کے صحیح تصور سے آشنا نہیں ہوا۔ ابھی تک اس کے مدبر معاشرتی مساوات اور اقتصادی مساوات کے لئے مصروفِ جدوجہد ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ابھی اس تاریکی سے نکلنے کے لئے یورپ کو کتنی مدت درکار ہے۔ مگر اسلام کا کمال دیکھو۔ کہ وہ تمنائیں جو دنیا کئی سو برسوں میں ابھی تک پوری نہیں کر سکی۔ اسلام کے ایک سب سے بڑے سیاستدان نے ان کی تکمیل آنکھ جھپکنے میں کردی۔

خلافت راشدہ کے اہم عناصر تین تھے۔ اتحاد و الامت۔ شریعت کا نفاذ۔ مذہب اور سیاست کا انضمام یہ خلافت حقیقی معنوں میں جمہوریت۔ (A REPUBLICAN DEMOCRATIC GOVERNMENT) تھی۔ اس جمہوریت میں آزادی کا تصور عدل اور ہمواری پر مبنی تھا۔ آزادی نہ تو اس قسم کی تھی کہ تمام قیود اور فرائض سے استخلاص کی نوبت پہنچ جائے اور نہ اس نوعیت کی تھی کہ قیود اور فرائض

کا ہجوم اور شدت آزادی فکر کی روح کو کچل دے۔ بلکہ اسلامی آزادی کا تصور آزادی اور ادائے فرض کے درمیان مصالحت پر مبنی تھا۔ یورپ میں آمریت اور جمہوریت کی کشمکش کا ظہور اسی افراط و تفریط کا لازمی نتیجہ ہے۔ خلیفہ کے انتخاب کے لئے بلا واسطہ انتخاب اور نامزدگی دونوں جائز تھے۔ مگر بیعت کی شرط ضروری تھی۔ یعنی خلیفہ وہی ہو سکتا تھا جس کو عوام بنظر استحسان دیکھتے ہوں۔ خلیفہ کے اختیارات محدود تھے اور وہ ملت کے سامنے اپنے اعمال کے لئے جوابدہ تھا۔ اسلام کا یہ دور حکومت ہر لحاظ سے انسانی تاریخ کا ایک شاندار ترین باب کہا جا سکتا ہے۔ اس مبارک و مسعود دور کے بعد اسلامی ریاست نے استبداد اور ملوکیت کی راہ اختیار کر لی۔ اس طرز عمل کے نتائج اب ظاہر ہیں۔

خلافت راشدہ کے بعد موروثی اور استبدادی (HEREDITORY & DESPOTIC) حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس دور خلافت میں عملاً اور معناً انتخاب خلیفہ کے اصول کو ترک کر دیا گیا مگر اس کو برائے نام ضرور بحال رکھا گیا۔ کیونکہ تخت خلافت پر متمکن ہونے کے وقت 'بیعت' لی جاتی تھی اس طرح اسلام کے ایک زبردست سیاسی مسئلہ کو ظاہرا طور پر قائم رکھا گیا۔ مگر اس کی روح اس سے سلب کر لی گئی۔ یہ پہلی ضرب تھی جو استبداد نے اسلامی معاشرت کے سر پر رسید کی۔ اس موروثی اور استبدادی خلافت میں سیاسی پہلو زیادہ واضح تھا۔ دین کو خلفا اعتنا اور توجہ کا مستحق خیال نہ کرتے تھے اس لئے فقہا اور محدثین کا ایک علیحدہ گروہ وجود میں آ گیا۔ یہ لوگ۔ اسلام کے قانون کے شارح تھے۔ فقہ اور حدیث جو اسلامی ریاست کی توجہ اور اعتنا کی سخت مستحق تھی گویا اس کی ترقی کے لئے اسلامی ریاست نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس بنا پر فقہا اور محدثین کو دین کی روایات کے قیام و بقا کے لئے خود ہی ذمہ دار بننا پڑا۔ ان لوگوں کی حیثیت سلاطین اسلام سے بھی زیادہ باوقار اور بہ وقعت ہو جاتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صرف یہی ایک گروہ ہے۔ جس کی ان تھک سعی سے اسلام زندہ رہا

اموی دور حکومت کا خاص وصف یہ تھا کہ اس میں عربی روایات اور قومیت کا استیلا اور

تسلط قائم رہا۔ مگر دورِ عباسی میں ایرانی عنصر نے زیادہ زور حاصل کر لیا۔ یہ شے اسلام کی ترقی کے لئے سخت مضر ثابت ہوئی۔ اسلام کی فکری حالت پر عجمی اثرات نے اثر ڈالا اور ایک ایسے رہبانی عقیدہ کا وجود عمل میں آیا۔ جو تکمیل اور تربیت شخصیت کے لئے دنیوی علائق سے رشتہ قطع کرنے کی دعوت دیتا تھا اس رہبانیت نے مسلمانوں کو ایک فعّال ملت کی حیثیت سے بہت نقصان پہنچایا۔ عمل کی جگہ مجہولیت (PASSIVITY) نے لے لی۔ انسانی شخصیت کا جو تصوّر اسلام نے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی تربیت کے لئے ہمیں اپنے آپ کو اجتماعی زندگی سے کبھی رشتہ نہیں کاٹنا چاہئے قطرہ تربیت کے لئے اس کو موجوں اور طوفانوں سے آشنا ہونا چاہیئے۔ مگر اس رہبانیت کی تکذیب محدثین و صوفیا کے طبقہ نے ہمیشہ کی۔ اس دور میں احیاء اسلامیہ کے لئے سعی کی گئی۔ مگر وہ ناکام ثابت ہوئیں۔

ابتدائی دورِ عباسیہ کی ایک اہم خدمت یہ ہے۔ کہ اس دور اسلامی میں حکمت کا ارتقاء ہوا اسلام نے دنیا کے اکثر بڑے بڑے حکیم، فیلسوف اور فقیہی پیدا کئے۔ اسلامی فقہ کی تدوین بھی اسی زمانہ میں ہوئی۔ یہ دورِ حکمت المامون کے بعد چند برس میں ختم ہو گیا اس کے بعد ممالک اسلامیہ ترقی کی بجائے تنزّل کی طرف حرکت کرنے لگے۔ اسلام کا ظاہرا دارہ گو قائم تھا۔ مگر سلطنت اندرونی طور پر کھوکھلی ہو چکی ہے اختلال اور اضمحلال کا یہ دور ۸۳۳ء سے ۱۲۵۸ء تک رہا۔

خلافت عباسیہ کے اس آخری دور میں مملکت کی حالت نہایت ابتر تھی ایک تو یہ ہوا کہ تنظیم و تنسیق حکومت میں اختلال پیدا ہو گیا۔ پھر ترکی اثر و رسوخ نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ خلیفہ کی حکومت محض برائے نام تھی۔ حکومت کا اصلی کاروبار وزیر اعظم کے سپرد تھا جو اکثر اوقات ایرانی یا ترک ہوتا۔ خلیفہ کا اثر اس کی مذہبی حیثیت سے تھا اس ابتر حالت میں اسلامی فقہ کی ترقی کو سخت نقصان پہنچا قانون کا حقیقی واقعات سے کوئی ربط نہ رہا۔ یہ محض تخیّل کی دنیا تک محدود ہو گیا۔ اس کی قوت نفوذ اور لچک اس سے سلب ہو گئی اس کے ساتھ ہی ممالک اسلامیہ کی قطع و برید شروع ہو گئی تھی۔ مختلف ممالک

میں اتحاد اسلامی کا رشتہ نہ رہا۔ بلکہ سردار برسر اقتدار آگئے۔ جو نہایت خود سر تھے اور مرکز کی قطعاً پروا نہ کرتے تھے۔ اس کے بعد ہلاکو نے حملہ کیا اور خلافت کے چراغ سحری کو گل کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط خلافت بغداد سے منتقل ہو کر اب مصر میں آگئی۔ یہاں ایک محل میں خلیفہ کو ٹھہرایا گیا خلیفہ کی حیثیت محض برائے نام تھی اس کے بعد خلافت دولت عثمانیہ میں آگئی۔ سب سے پہلے سلطان سلیم اول نے اس لقب کو اختیار کیا۔ ترکوں نے اس لفظ کو بہت عرصہ تک یورپ کے خلاف بطور ایک سیاسی حربہ کے بھی استعمال کیا۔ سلطان عبدالحمید نے سب سے پہلے امیر المومنین کا لقب اپنے لئے اختیار کیا۔ سلطان عبدالحمید دیگر ممالک میں اپنے آپ کو محافظ اسلام ظاہر کرتا۔ مگر اپنے ملک میں اس نے استبدادی نظام حکومت قائم کیا۔ نوجوان ترکوں نے ۱۹۰۸ء میں دستوری انقلاب کیا اور یورپ کی پارلیمنٹری طرز کی حکومت قائم کی۔ حفاظت حرمین کے نام پر ترکوں نے خلافت عثمانیہ کی تقدیس کے تصور کو زندہ کیا۔ جنگ عظیم کے بعد ترکی نے کمال اتاترک کی سیادت میں خلافت کی تنسیخ کر دی اور اس کی بجائے مغربی جمہوریت قائم کی۔ یورپ کی طرز کی معاشرت ترکی میں نافذ کی گئی اور ترکی کو ایک اول درجہ کی جدید حکومت بنانے کی طرف سعی کی گئی۔

خلافت کی تنسیخ پر اسلامی ممالک میں سخت احتجاجات کئے گئے۔ مگر یہ سب بے سود تھا۔

سر طامس آرنلڈ اپنی کتاب خلافت (THE CALIPHATE) صفحہ ۷۲ پر ایک اسلامی مفکر کی رائے یوں نقل کرتا ہے۔

خلیفہ کے فرائض یہ ہیں "مذہب کا احترام اور بقا، قانونی اختلافات کا فیصلہ، ممالک محروسہ کی حفاظت، مجرموں کے لئے سزا اور تعزیر کا تقرر، حدود سلطنت کی حفاظت کیلئے افواج کی تنظیم و ترتیب، ٹیکسوں کی فراہمی، تنخواہوں کی ادائیگی اور بیت المال کی تشکیل، عہدہ داروں کا تعین و تقرر پھر حکومت کے کاروبار میں ذاتی انہماک" الماوردی (AL-MAWARDI) کا زمانہ تصنیف

تالیف گیارہویں صدی ہے۔ لیکن اس کے مشہور معروف معاصر کی رائے ہے کہ خلیفہ کا دخل صرف مذہبی معاملات اور اعتقادی امور تک محدود ہوگیا تھا کیونکہ سیاسی معاملات میں اس کی رائے کی کوئی وقعت نہ تھی۔"

اس تصریح سے ثابت ہوجاتا ہے کہ دور عباسیہ کے آخر میں خلافت کی حیثیت ایک جسد بے روح کی سی تھی۔ اس سے اسلام کا کوئی مفید مطلب کام سرانجام نہیں دیا جاسکتا تھا خلافت عثمانیہ نے تحریک اتحاد اسلامی کو بطور ایک حربہ کے استعمال کیا کبھی انہوں نے خلوص نیت سے ان شرعی احکام (SHARIAT VALUES) کو زندہ کرنے کی طرف توجہ نہ کی۔ جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اس لئے کارکنان قضا و قدر نے اپنے تازیانہ عقوبت کو حرکت میں لاکر اس خلافت کا خاتمہ کردیا

تنسیخ خلافت کے بعد کمال پاشا نے حامیان خلافت کو یہ جواب دیا۔

"مسلمانوں کا یہ صدیوں کا خواب کہ خلافت ہی اسلامی حکومت کی اساس ہونا چاہیے کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ بلکہ خلافت اسلامیوں کے لئے اختلافات، منافقات، طوائف الملوکی، اور خانہ جنگی کا سبب بن گئی۔ اگر اس حقیقت کو اس کی واضح صورت میں سمجھا جائے تو تمام اسلامیوں کے مفاد اس امر کے متقاضی ہیں۔ کہ اسلامی ممالک علیحدہ علیحدہ اپنے لئے حکومتیں قائم کریں۔ اسلامیوں کے درمیان اس وقت صحیح رشتہ مودت اس اصول میں ہے کہ تمام مسلمان بھائی ہیں۔"

گو ہم کمال پاشا کی معاشرتی اصلاحات کی اکثر بے اعتدالیوں سے اتفاق رائے نہیں کرسکتے۔ مگر ممالک اسلامیہ کی سیاسی تنظیم کے بارے میں آپ کے یہ خیالات حق اور ثواب پر مبنی ہیں اور ان میں کلام کی کوئی گنجائش نہیں، اس بارے میں ہماری رائے یہ ہے۔

"جب تک مغرب کا استیلاء ممالک اسلامیہ سے ختم نہیں ہوجاتا اس وقت تک حق اور ثواب کی راہ یہ ہے کہ ہر اسلامی ملک دفاعی وطنیت (DEFENSIVE NATIONALISM) کو پیدا کرے، مغرب سے سیاسی

اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے استخلاص کی سعی کرے اس کا نصب العین جمہوریت اور احیاء شریعت ہو بالفاظ دیگر اس کو اسلامی ریاست کے تصور کو ایک ادنیٰ پیمانہ پر عملی صورت دینے کی سعی کرنی چاہئیے۔

ب۔ خارجی معاملات میں اسلامی ممالک کو ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہئیے۔ تعاون کی وجہ مغرب کے استیلاء سے نجات ہو۔

ج۔ اسلام کی تشریح و تعبیر کے پرانے اور فرسودہ طریقے ترک کر دینے چاہئیں۔ اسلام کو بحیثیت ایک بین الاقوامی تحریک کے پیش کیا جائے اس سیاسی اسلوب فکر و عمل کی بنیاد توحید الوہیت کا تصور ہے ہم اس سے قبل بتلا چکے ہیں کہ اس تصور کی اجتماعی افادیت کس قدر ہے

د۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اسلامیان ہند کی سیاست کا محور استخلاص وطن اور احیاء شریعت اسلامیہ ہو۔ غیر ملکی استبداد سے استخلاص کے بعد اسلامی ممالک میں خلافت کا قیام عمل میں آسکتا ہے خلافت بغیر سیاسی قوت کے ایک بے کار چیز ہے۔

کلامِ اقبال کا تحلیلی مطالعہ

(جناب غلام محمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) حیدرآباد دکن)

"خداوندانِ مکتب" سے اقبال کی شکایت بیجا نہ تھی[1]۔ کیا آج بھی خود اُن کے کلام کو "درسِ خاکبازی" کا آلۂ کار بنایا نہیں جا رہا ہے؟ ——— کسی کی فہم نارسا نے "ہمالہ" کے دامن میں ایک نیا شوالہ تعمیر کر کے "قومیتِ متحدہ" کے بھجن گانے کو کلامِ اقبال کا منشاء اصلی تصور کیا[2]۔ کسی کی خیرہ نگاہیں اقبال کے انقلاب کی صحیح روشنی سے فیضیاب نہ ہو سکیں اور "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں" مراد اُسی قسم کا انقلاب سمجھا جیسا کہ روس میں پیدا کیا گیا[3]۔ غرض جتنے اس قسم کے "خداوندانِ مکتب" ہیں اتنی ہی "خاکبازی" کی تاویلات بھی کی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ ع

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد تجلّی کی نامسلمانی سے فریاد

دنیا کے کسی بڑے مفکر کے فکر کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ "عمرِ فکری" بالکل "عمرِ حیوانی" کے مماثل ہے۔ حیوانی عمر میں اگر لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا پایا جاتا ہے تو

---

[1] ملاحظہ ہو بال جبریل ع

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

[2] اس خیال کا اظہار نظام کالج کے اُستاد ادبیات اردو مولوی آغا حیدر حسن صاحب نے یوم اقبال منعقدہ ۱۳۵۲ف (بمقام زمرد محل ٹاکیز) میں فرمایا تھا۔

[3] یہ تاویل اشتراکیت کے پیرو مخدوم محی الدین صاحب ایم۔ اے عثمانیہ نے اسی جلسہ میں فرمائی تھی۔ دراصل انہی دو محرکات کا نتیجہ حسبِ بالا مضمون ہے۔

عمر فکری میں بھی طفلی شباب اور پختگی کے ادوار نمایاں نظر آتے ہیں ـــــ مغرب کے شاعر فطرت ورڈز ورتھ کو دیکھئے اُس نے خود اپنی نظم "(LINES ABOVE THE TINTERN ABBEY)" میں اپنی عمر فکری کی تشریح کی ہے ...... ہر بڑا شاعر و مفکر ابتدا ہی سے خاص صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ لڑکپن میں بھی ورڈز ورتھ فطرت کے حسین اور دلکش نظاروں سے محظوظ ہوتا تھا۔ لیکن یہ حظ غیر شعوری تھا اُسے پتہ نہ تھا کہ آخر خوشی کے یہ ولولے دل میں کیوں پیدا ہوتے ہیں پھر دورِ شباب آیا تو شاعر میں ایک طرح کا شعور پیدا ہوا اب وہ شاہد فطرت کی اداؤں کو سمجھنے لگا لیکن قوت اظہار اب بھی مفقود رہی خود ہی سمجھتا اور خود ہی لطف اندوز ہوتا لیکن دوسروں کو شریک مسرت نہ کر سکتا تھا اس کے فوراً بعد پختگی کا دور آیا جس میں نہ صرف وہ فطرت کی گوناگونیوں کو سمجھنے اور انبساط حاصل کرنے لگا بلکہ فطرت کے رازہائے سربستہ کو واشگاف کرنے لگا اور دوسرے بھی اس سے مزہ اٹھانے لگے۔

علامہ اقبال پر بھی اسی قسم کے ادوار گذرے ہیں ہم اُن کے کلام کو اولاً دو شقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) بہ لحاظ فکر (۲) بہ لحاظ اثرات احول ـــــ شق اول کو پھر تین ذیلی شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (i) دورِ استفہام (ii) دورِ تجسس (iii) دورِ پختگی ..... اسی طرح دوسری شق کے بھی تین ذیلی حصے ہو جاتے ہیں۔ (i) سفر یورپ سے قبل کا ہندوستانی زمانہ (ii) غربی سیاحت کا دور (iii) سفر مغرب کے بعد کا حصہ عمر جو ہندوستان میں گذرا۔
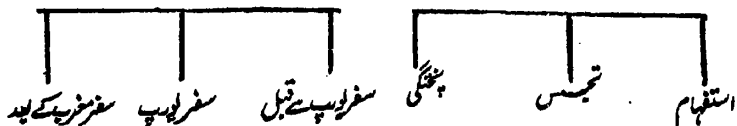
دورِ استفہام | فکری نقطہ نگاہ سے مطالعہ کریں تو پہلے ایک ایسا دور ملتا ہے جس میں شاعرِ مشرق شاعرِ مغرب کی طرح فطرت کے حقائق کے سمجھنے سے عاری ہیں ابھی نہ تو شرح صدر ہوا ہے اور نہ ان کی نظر ہوشیار بنی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر چیز دکھائی دیتی ہے سجھائی نہیں دیتی "گل رنگین" کے حسن و جمال کا مظاہرہ کرتے ہیں، باوجود بلبل کی بیتابی کے گل کو خاموش پاتے ہیں بلبل کی حالت زار سے دل بھر آتا ہے ترس کھا کے گل سے پوچھ اٹھتے ہیں:۔

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں　　　اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں

دنیا کے مصائب و آلام پر نظر ڈالتے ہیں تو "قیدِ حیات" اور "بندِ غم" دونوں لازم و ملزوم بلکہ ایک ہی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جب عاقبت کا خیال آتا ہے تو عالم عقبیٰ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر "خفتگان خاک سے استفسار" کرتے ہیں:۔

آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا؟　　　اُس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟

اس جہاں میں اِک معیشت اور سو افتاد ہے　　　روح کیا اُس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے

کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے　　　قافلے والے بھی ہیں اندیشۂ رہزن بھی ہے؟

"شمع و پروانہ" پر نظر پڑتی ہے لیکن پتہ نہیں چلتا کہ آخر شمع میں وہ کونسی جاذبیت اور حسن ہے کہ پروانہ اُس پر نثار ہوا جاتا ہے شمع سے دریافت کرتے ہیں۔

"پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں؟　　　یہ جانِ بیقرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟

"آزار موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا؟　　　شعلے میں تیرے زندگی جاوداں ہے کیا؟"

آفاق کی حقیقت کو نہ سمجھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ انفس میں غور کریں: "کائناتِ صغیر" کی حقیقت کو عریاں دیکھنا چاہتے ہیں تو خود پر نظر ڈالتے ہیں لیکن سمجھ یہاں بھی کام نہیں کرتی۔

میں حُسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں　　　کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں"

کائناتِ صغیر کی اجمالی حقیقت کی فہم سے عاجز آ کر جزدی مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

"دل" کو لے کر اس پر غور کرنے لگتے ہیں، پروانۂ فکر کے بال و پر یہاں بھی جل جاتے ہیں۔ آخر تنگ آکر سرچشمۂ عقل سے پوچھنے لگتے ہیں۔

"یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی؟ جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل"

غرض اس دور کا کلام پورا کا پورا استفہام سے بھرا پڑا ہے۔ ؎۱

دورِ تجسّس اس دور سے گذر کر علامہ موصوف ترقی کا ایک اور زینہ چڑھتے ہیں جسے میں منزل جستجو سے تعبیر کرتا ہوں یہاں استفہام کے بجائے تلاش حقیقت کی کوشش نمایاں نظر آتی ہے اقبال سراپا تجسّس بن جاتے ہیں سمندِ استقلال پر سوار دشتِ تجسّس میں سرگرداں نظر آتے ہیں، کبھی محمل کو پا لیتے ہیں اور کبھی محض غبارِ راہ میں پریشان و متحیّر رہ جاتے ہیں، چنانچہ "انسان" والی نظم میں قدرت سے گلہ کرتے ہیں۔

بیتاب ہے ذوق آگہی کا کھلتا نہیں بھید زندگی کا

حیرت آغاز و انتہا ہے آئینہ کے گھر میں اور کیا ہے

لیکن باوجود اس "تحیّر" کے تجسّس کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور برابر فکرِ عمیق میں مستغرق رہے اور یہی وجہ تھی کہ حقیقت کو پا لیا۔

"جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے"

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے

اب وہ بھانپ چکے ہیں کہ انسان "عبث" پیدا نہیں کیا گیا ؎۲ بلکہ اس کی آفرینش کا کچھ نہ کچھ مدعا ضرور ہے ـــ آفرینش انسانی کو فعل عبث نہ سمجھتے ہوئے حقیقت خلقت کی جستجو اس شعر سے بخوبی

؎۱ ملاحظہ ہو ابتدائی حصہ بانگ درا۔

؎۲ جیسا کہ خود قرآن مجید میں فرمایا گیا "أفحسبتم إنما خلقناكم عبثاً"

واضح ہے۔

"اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں   نگہ کو نظارہ کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا"

اسی مسلسل اور متواتر تجسس کا نتیجہ ہے کہ اقبال حسنِ فطرت کو خود پر طاری کر رہے ہیں اور اس طرح اس میں کھو کر حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

حب سے آباد ترا عشق ہوا سینہ میں   نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینہ میں"

دور پختگی | یہ دونوں ادوار کل عمر فکری کی مناسبت سے بہت مختصر رہے ہے "تجسس" کے فوراً بعد "پختگی" کا زمانہ آیا کلام اقبال کا بیشتر حصہ اسی دور سے متعلق ہے "شاعر مغرب" کی طرح اب اقبال کی نظر ہوشیار بھی حقائق فطرت کو اُن کی پوری جلوہ تابیوں کے ساتھ دیکھ رہی ہے۔ ایقان کامل پیدا ہو چکا ہے، شک وشبہ کو کوئی دخل نہیں۔ اسی وجہ سے سربستہ رازِ دل کو پورے تیقن کیساتھ وا شگاف دیکھ رہے ہیں اور دکھا رہے ہیں

"کھلے جاتے ہیں اسرار نہانی   گیا دور حدیث لن ترانی"[1]

اب حقیقت زندگی کوئی معمہ نہیں ہے اس لئے علی الرؤس کہہ رہے ہیں۔

"چوں خبر دارم ز سازِ زندگی   با تو گویم چیست رازِ زندگی

غوطہ در خود صورت گوہر زدن   پس ز خلوت گاہ خود سر بر زدن

زیر خاکستر شرار اندوختن   شعلہ گردیدن نظرہا سوختن"[2]

مقصد وجود جو پہلے سجھائی نہ دیتا تھا اب نہ صرف معلوم کر چکے ہیں بلکہ دوسروں کو بتلا رہے ہیں۔

"وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود   کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا"[3]

---

[1] بال جبریل صفحہ ۱۴۱ [2] ملاحظہ ہو اسرار خودی" اندازے بر نسخات نقشبند المعروف بہ بابا ہلئے صحرائی کہ برائے مسلمانان ہندوستان رقم فرمودہ است۔ [3] ضرب کلیم "افرنگ زدہ"

حقیقت عشق جو دور اول میں حد فہم سے باہر تھی اب کامل طور پر فہمیدہ ہے، چنانچہ عشق اور زندگی کا باہمی تعلق اس طرح واضح فرماتے ہیں۔

"عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر — ہم درون خانہ ہم بیرون در"[1]

حیات کے لئے تو عشق کو ضروری قرار دیا لیکن خود عشق کی پختگی کے لئے دو شرائط عائد کیں — اولاً

"عشق را از تیغ "لا" آگاہ کن — آشنائے رمز "الا اللہ" کن"

پھر فرمایا۔

شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام — شورش طوفاں حلال لذت ساحل حرام[2]

حیات انسانی کی حقیقت، اُس کی غرض اور اُس کے ادعا کو کس خوبی سے واضح فرمایا۔

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب — حقیقت در مجازش آشکار است

ز خاک تیرہ محارو ید و لیکن — نگاہش بر شعاع آفتاب است[3]"

اسی طرح "حیات دوام" کا صحیح مفہوم بھی بتلایا۔

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل — چیست حیات دوام سوختن ناتمام"

غرض اس دور میں تمام اسرار آشکار ہیں۔ اب فہم اقبال نہ کہیں عاجز نظر آئے گی اور نہ متحیر کیونکہ اب وہ ہوشیار ہو چکی ہے — تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

آئیے کچھ شق دوم یعنی اثرات ماحول کا بھی جائزہ لیں —

ابتدائی ہندوستانی دور | مغربی سیاحت سے پہلے کا دور اقبال کی فکر و شاعری کا ابتدائی زمانہ ہے۔ اس میں اُن کی نظر محدود ہے۔ اسلامی حقائق قلب میں پوری جلوہ افروزیوں کے ساتھ موجود نہیں اسی لئے کبھی "نیا شوالہ" تعمیر کر کے "قومیت متحدہ" کے گُن گانے لگتے ہیں[4] تو کبھی۔

---

[1] اسرار خودی، "دعا" [2] ضرب کلیم، "علم و عشق"۔ [3] پیام مشرق (۱۰۸) [4] بانگ درا، "نیا شوالہ"

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا[1]"

کا نعرہ بلند کر کے جذبۂ وطنیت پیدا کرنا چاہتے ہیں یہی نہیں بلکہ ع

"خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے"

کی صدا بلند کر کے کٹّر وطن پرستوں کے زمرہ میں شامل ہو جاتے ہیں اسی دور کے بعض اشعار کو لے کر آج کل کے خیرہ نظر افراد اقبال کو "قوم پرست" اور "وطن پرست" ثابت کرنے کی سعیٔ عبث کرتے ہیں اور آئندہ ان بتوں پر جو ضرب لگائی گئی اس پر نظر دوڑانا گوارا نہیں کرتے وجہ صرف یہ ہے کہ حقیقت کے متلاشی نہیں بلکہ پرستارِ نفس بنے ہوئے ہیں۔

مغربی سیاحت | غرض اس کے بعد جب حضرت اقبالؒ کو مغربی سیاحت کا موقع ملا تو وسعتِ مشاہدہ سے وسعتِ نظر بھی پیدا ہو گئی۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا مغربی کلچر سے مقابلہ کیا ہر شے کو بنظر غائر دیکھا اور ہر چیز کا گہرا مطالعہ کیا ــــ وہاں کی "ہر تعمیر" میں بجز "تخریب" اسے کچھ نہ دکھائی دیا۔ حقیقت شناس مردِ خدا کہہ اٹھا۔

"دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا"

مغربی جنس کو جب اس جوہری نے اسلام کی کسوٹی پہ پرکھا تو اس کی ظاہری نظر فریبی حقیقت کو روپوش نہ کر سکی اور جوہری پکار اٹھا۔

"فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ اس کی مدنیت رہ سکی نہ عفیف[2]"

فرنگی مدنیت جو سطحی نظروں کے لئے بڑی "فاتحانہ" دکھائی دیتی ہے نظرِ ہوشیار کے آگے اس کی شکست اس طرح عریاں ہے۔

---

[1] بانگ درا "ترانۂ ہندی" [2] ضرب کلیم: "مغربی تہذیب"

"بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات"[۱]

بہرکیف مغربی ماحول کے اثرات جو موصوف کے قلب و دماغ پر مترتب ہوئے اُن کا اجمالی خاکہ ان اشعار سے بخوبی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے

"جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل عقل ناپروا متاع عشق را غارت گر است
در ہوائش گرمی یک آہ بیتابانہ نیست رند این میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست"[۲]

آخری زمانہ | اس سفر سے جب علامہ موصوف واپس ہوئے تو چونکہ مشرقیت اور مغربیت کے حقائق یکساں طور پر واضح ہو چکے تھے پھر اُن کے مقابل اسلام کی حقیقت اور کاملیت بھی ظاہر ہو چکی تھی اس لئے اب اُن کا ایمان اور ایقان پختہ تر ہو چکا تھا۔ قرآنی حقائق اُن کے قلب میں ایقانِ کامل کے درجہ تک پہنچ چکے تھے —— وہ ایک حقیقت کے متلاشی تھے، اُن کی طبیعت میں "تقویٰ" تھا یہی وجہ ہے کہ کلام اللہ سے اُنہوں نے صحیح رہبری حاصل کی حقائق و معارف کھلنے لگے اور کیسے نہ کھلتے جب خود بھیجنے والے نے اپنی کتاب بھیجتے ہوئے بتلایا تھا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ـ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ[۳] غرض جوں جوں اسرار کھلتے گئے علامہ نے اُن کو بلاکم و کاست ہمارے سامنے رکھ دیا۔ جو غلط تخیلات دورِ اوّل میں پیش کر چکے تھے اُن کی بلا تذبذب تردید کر دی کیونکہ اُس وقت اُن کے خیالات اور نتائج نکھرے ہوئے نہ تھے اور اب اُن کا فلسفہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکا تھا —— یہ چیز اُن کی وقعت کو گراتی نہیں بلکہ جویائے حقیقت ہونے پر دلالت کرتی ہے اور حقیقتاً یہی وہ مقام ہے جو اقبال کو عام مفکرین سے ممتاز کر دیتا ہے۔ حقانیت کے عصا سے اُنہوں نے غلط تخیلات کے بت خانہ پر جو ضرب کلیمی لگائی اُس سے وہ مردانِ حق کی صف میں شامل ہو گئے۔ اگر وہ اُس بت خانہ پر ضرب نہ لگاتے تو ندراستہ چھوٹتا

---

[۱] بال جبریل صفحہ (۱۴۱) [۲] ... [۳] پارہ الٓمٓ

اور نہ وہ جلوۂ حقیقت سے دوچار ہوئے جو صرف "مومنین" کا مقام ہے۔ اس دور کی ہر بات سے نہ صرف صداقت اور پختگی ٹپکتی ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمات محمدی ان کے قلب و دماغ کے آئینوں سے منعکس ہو کر ہم تک پہنچ رہی ہیں۔

اگر اقبال نے پہلے وطنیت کے راگ الاپے تھے تو سننے والے سنیں کہ اسی بربط سے اب کچھ دوسری ہی لے نکل رہی ہے جو حقیقتاً پہلے سے کہیں زیادہ دلکش اور دلنشیں ہے کیونکہ اس اژدہائے وطنیت کو عصائے صداقت نے ہضم کر لیا ہے پھر اب اس کا ذکر کیا! علامہ نے فرمایا اور بجا فرمایا۔

" ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے[1]

اگر اقبال نے ابتداءً "ترانہ ہندی" لکھا تھا تو کیا نظریں اب "ترانۂ ملی" کو نہیں دیکھ سکتیں جو اُنہیں دیکھ سکتیں جو اُنہیں کی فکر کی پیداوار ہے ؟ دیکھو اب حقیقت بین نے قومیت کے زہریلے اثرات کو جان کر اس کی تردید کر دی ہے اب وہ "قومی" نہیں بلکہ "بین الاقوامی" بن چکا ہے، جب ہی تو کہہ رہا ہے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا[2]

اب علامہ، زمان و مکان کے قیود سے بالاتر ہو چکے ہیں اور ہر مسلم کو ایسا ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

"مسلمانیم و آزاد از مکانیم برون از حلقۂ نہ آسمانیم[3]

کسی خاص خطۂ زمین سے غیر وابستگی اور صرف اُس ایک سے لگاوٹ، جس سے بغیر رشتہ جوڑے نہ اخوت ممکن ہے نہ ترقی، مسلم کا شعار ہے۔ اسی چیز کو علامہ موصوف نے پیام مشرق میں یوں پیش کیا۔

---

[1] بانگ درا: "وطنیت" [2] بانگ درا: "ترانۂ ملی" [3] ارمغان حجاز: "حضور حق"

"نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم"[1]

غرض اسی دور کی بات اسی اقبال کا منشا و مقصد یا پیام تصور کی جا سکتی ہے کیونکہ یہی دورِ فکر کی پختگی اور کاملیت ہے اس دور میں جس چیز کی دعوت دی گئی وہی اُن کا منشا اصلی قرار دیا جا سکتا ہے شپرہ چشم اُن کی ابتدائی تاریکی میں تو کچھ دیکھ لیتے ہیں لیکن اس دور کی تابانیوں سے چوندھیا جاتے ہیں اور کچھ دکھائی نہیں دیتا — اگر یہ حقیقت ہے تو چشمۂ آفتاب کا کیا گناہ؟ خیرہ نگہی قابلِ ملامت ہے .... اقبال کے منشا اصلی کے سمجھنے کے لئے اُن کی یہ نصیحت بہت کافی ہے۔

"بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبیست"

اس تحلیلی مطالعہ کی غایت یہ ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اُن خیالات کو لے کر جن کی خود حضرت اقبال نے بعد میں تردید فرمادی یہ سمجھنا کہ اُنہوں نے وطنیت یا قومیت کا درس دیا سراسر غلطی ہے۔ کیا اقبال حاملِ وحی تھے کہ اُن کی حرکتِ زبان سے نکلا ہوا ہر کلمہ اور جنبشِ قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ صحیح ہوتا؟ وہ پیغمبر نہیں بلکہ ایک "مردِ مومن" تھے، حقیقت جُو اور حقیقت شناس انسان تھے۔ جب اُنہوں نے خود کسی خیال کی تردید کر دی تو پھر اُسی کو اُن کا منشا یا پیام قرار دینا اُن پر ظلم نہیں بلکہ کہنے والے کی نفس پرستی پر دلالت کرتا ہے۔ اقبال یقیناً انقلاب کے خواہاں تھے لیکن کیسا انقلاب؟ وہ جو روس میں بپا کیا گیا؟ جس میں بربریت تھی اور بہرحال انسانیت کو برباد کرنے کا جذبہ موجود تھا[2] — نہیں ہرگز نہیں وہ پہلے "انفس" میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے

---

[1] پیامِ مشرق [2] اشتراکیت میں اگر مزدوروں کو ابھارا جاتا ہے تو دوسری طرف سرمایہ دار طبقہ کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے اس طرح بربریت یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ سرمایہ کی مساوی تقسیم اصلاح ہو کہ نہ سرمایہ دار مزدور کو پنجۂ ظلم میں جکڑ سکے اور نہ مزدور آتشِ انتقام میں سرمایہ دار کا گلا گھونٹے — تاریخِ عالم شاہد ہے کہ ایسا انقلاب جس میں باطل مٹ جائے لیکن انسانیت متاثر نہ ہو صرف اسلام ہی نے پیدا کیا جس میں سب کے اذہان بدل دیئے گئے جو برتری یا کم تری کے جذبات کے حامل تھے اور جن میں توازن قائم ہونے سے خود بخود مساوات پیدا ہو گئی۔

ہیں اور پھر "آفاق" ہیں۔ ایک ایسا انقلاب جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے رحمت العالمینؐ نے پیدا کیا تھا جس میں مردم کشی نہ تھی۔ بلکہ باطل کشی تھی اور جس میں اس وجہ سے کل انسانیت کے لئے فلاح دارین تھی ـــــ انسانی غارت گری کے انقلاب دنیا بہت دیکھ چکی۔ اس لئے اقبال کی روح اب ایسے انقلاب کے لئے تڑپ رہی ہے جو باطل کو جلا کر خاکستر کر دے ...... جو انسانیت کے لئے باعث رحمت ہو۔ فقط

ہمارے ہندستانی مسلمان

ولیم ہنٹر آئی۔سی۔ایس ریٹائرڈ نے ۱۸۷۲ء میں انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام (OUR INDIAN MUSALMAN) ہے۔ اس کتاب میں فاضل مولف نے سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین پر ایک مفصل تبصرہ لکھا ہے۔ یہ تحریک ہندستان میں اسلامی حکومت کے احیاء و تجدید کی ایک آخری کوشش تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد شہید رح اور اُن کے رفقاء نے کس طرح مسلمانوں کو حیرت انگیز طور پر منظم کیا اور کس طرح اُن کو ایمان افروز قربانیوں کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اس جماعت نے مسلسل ۲۵ سال تک سکھوں اور انگریزوں کی حکومت کو آتش زیر پا رکھا۔ کتاب میں اسلامی تحریکات اور مسلمانوں کی ذہنیت پر خوب کھل کر تبصرہ کیا گیا ہے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ کیا تھے اور ہم کیا ہیں کتاب اردو زبان میں پہلی مرتبہ اس ہفتہ چھپ کر آئی ہے اور ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔ اپنی فرمائش جلد بھیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت دو روپے بارہ آنے

منظومات

کلام اقبال

تن بتقدیر

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر!

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر!

تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

(ضرب کلیم)

انتخاب اقبال

(ازما خوذات ڈاکٹر غلام محمد صاحب)

گر زیک تقدیر خون گردد جگر ۔ خواہ از حق حکم تقدیر دگر

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست ۔ زانکہ تقدیرات حق لا انتہا است

ارضیان نقد خودی در باختند ۔ نکتۂ تقدیر را نشنا ختند

رمز باریکش بحرفے مضمر است ۔ تو اگر دیگر شوی او دیگر است

خاک شو نذر ہوا سازد ترا ۔ سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

شبنمی ؟ افتادگی تقدیر تست ۔ قلزمی ؟ پائندگی تقدیر تست

ہر زماں سازی ہماں لات و منات ۔ از بتاں جوئی ثبات اے بے ثبات

تا نجود تا ساختن ایمان تست ۔ عالم افکار تو زنداں تست

رنج بے گنج است، تقدیر این چنیں ۔ گنج بے رنج است، تقدیر این چنیں

اصل دیں ایں است اگر اے بے خبر ۔ مے شود محتاج از محتاج تر

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا ۔ باز در خواب گراں دارد ترا

سحر و افسون است یا دین است ایں!

حب افیون است یا دین است ایں!

نفیر عمل

(از جناب سید اظہر حسن زاہدی بی اے)

جو آرزو ہے کہ حاصل ہو پھر تجھے عزت جو چاہتا ہے کہ بڑھ جائے سطوت و عظمت
جو شوق ہے کہ میسر ہو پھر تجھے راحت
نفاق چھوڑ دے آپس میں متحد ہو جا

خدا کے واسطے ملت کی کر لے اب تنظیم کہ اس سے دہر میں ہوتی ہے قوم کی تکریم
ترے لئے ہے یہی اک کلید "فوز عظیم"
درست ہوگی اسی طرح اب تری حالت

ہراس کیا ہے جو اغیار ہو گئے دشمن گزند تجھکو نہ پہنچا سکے گا سیل فتن
نکل عمل کے لئے اور لپیٹ سر سے کفن
جو خوفِ حق ہے ترے دل میں خوف مرگ نہ کر

خدا کے حکم "اعدّ ولھم" کی کر تعمیل اور اپنے ضعف کو قوّت میں کر دے پھر تبدیل
حصولِ عظمت کونین کی یہی ہے سبیل
بڑا گناہ ہے دنیا میں آج آزادی

عجب زندگی ہے

(از جناب کامل، بی۔ اے جونپوری)

کبھی خواجگی ہے کبھی بندگی ہے
عجب زندگی ہے عجب زندگی ہے

ابھی تک خدا و خودی کے ہیں جھگڑے
یہ کیا ماجرا ہے یہ کیا دل لگی ہے

زمانہ جسے جانتا ہے محبت
وہ بیچارگی ہے وہ محتاجگی ہے

قسم عاشقی کی رہ عاشقی میں
سراسیمگی ہی سراسیمگی ہے

بہت دن ہوئے ہم کو ہستی میں آئے
ابھی تک مگر اس سے بیگانگی ہے

محبت میں کھوئی ہوئی ہے طبیعت
نہ فرزانگی ہے نہ دیوانگی ہے

بہت سوچ کر دل لگایا تھا کامل
مگر آج تک اس پہ شرمندگی ہے

(غیر مطبوعہ)

ناکام کوشش

بہت زور اقوام مغرب نے مارا
کہ بنیادِ تہذیبِ مشرق اڑا دیں

وہ اسلام جس کا ہے چرچا ہر اک جا
اٹھیں، آؤ دنیا سے اس کو مٹا دیں

اٹھے اک نیا اور نبی قادیاں سے
مسلماں کو اس کے طریقے بھلا دیں

وہ خود مٹ گئے جو مٹانے کو اٹھے
گرے خود، جو نیچا دکھانے کو اٹھے

(جناب عزیز الدین پال)

شرابی

(از سید حسن عباس جعفری)

اک شرابی نو عروسِ بے خودی سے ہمکنار
دخترِ رز کی کمندِ زلف کا بیکس شکار

جسم پر نالی کی کیچڑ بال بکھرائے ہوئے
راہ میں غافل پڑا تھا پاؤں پھیلائے ہوئے

اپنے ہم صورت کو جو اس حال میں پاتے ہیں لوگ
چلتے چلتے خود بخود اُس جا ٹھٹک جاتے ہیں لوگ

جب مصائب گھیر لیتے ہیں دل صد چاک کو
اور کھو دیتا ہے انساں قوت ادراک کو

کُند پڑ جاتی ہے عقل و ہوش کی تلوار جب
ذہن ہو جاتا ہے غور و فکر سے بیزار جب

رُوح دب جاتی ہے جب مایوسیوں کے بار سے
زندگی کے دن نظر آتے ہیں جب دشوار سے

بے کسی کی وادیوں میں عقل کھو جاتی ہے جب
زندگانی اک مسلسل آہ ہو جاتی ہے جب

پے بہ پے ناکامیاں کرتی ہیں جب جینا محال
سست پڑ جاتی ہے اسپ عمر کی یہ تیز چال

کھیلتا ہے زیست کی کشتی سے جب طوفانِ غم
ناچنے لگتے ہیں گرد و پیش جب سامانِ غم

زندگی جب اپنے اوپر بار آتی ہے نظر
ہر رگِ گل ایک نوکِ خار آتی ہے نظر

شدتِ افکار سے انساں بہک جاتا ہے جب
اسپ غور و فکر بارِ غم سے تھک جاتا ہے جب

آتشِ سیال کو تسکینِ دل گردان کر
اس کی جانب دوڑنے لگتا ہے یہ ناداں بشر

کاش اس ناداں کو اتنا تو سمجھائے کوئی
کیا مٹا سکتی ہے تیرے درد کو یہ بے خودی

زندگی میں درد سے تسکین پا سکتا ہے تو
اس سے چھٹ کر کونسی دنیا میں جا سکتا ہے تو

غور کر ناداں سرشتِ آب و گِل میں درد ہے
یعنی اس دنیا کے ہر ذرہ کے دل میں درد ہے

فکر و غم کے اک تسلسل کا جوانی نام ہے
اور مسلسل درد ہی کا زندگانی نام ہے

دردِ پنہاں مطربِ رنگیں نوا کے ساز میں
دردِ مضمر آبشاروں کی حسیں آواز میں

اہلِ دولت کے مسرت خیز کاشانے میں درد
اور مسجد میں کلیسا میں صنم خانے میں درد

رعد کی آواز میں اک درد جو پوشیدہ ہے
برقِ سوزاں میں وہی سوزِ دلِ خوابیدہ ہے

زندگانی حسرتوں کے خوں کی تفصیل ہے
درد وہ حسرت ہے جو شرمندۂ تکمیل ہے

زیست کی مے جن میں بٹتی ہے وہ غم کے جام ہیں
زندگی اور درد یہ اک چیز کے دو نام ہیں

ہماری تازہ ترین مطبوعات

ہمارے ہندستانی مسلمان:۔ جس میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین پر مفصل تبصرہ ہے۔ یہ تحریک ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیاء و تجدید کی ایک آخری اور زبردست کوشش تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سید احمد شہید اور اُن کے رفقاء نے مسلمانوں کو کس طرح منظم کیا اور کس طرح اُن کے اندر بلالی روح پیدا کر دی تھی قیمت دو روپے بارہ آنے ۔ (عـ۱۲/)

اسلامی پارٹی کا آئین:۔ مسلمانوں کو ہندستان میں کن خطوط پر منظم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ہندستان میں اسلامی حکومت کے احیاء کے لئے کوشش کی جا سکتی ہے۔ ان سوالات کا جواب معلوم کرنا ہو تو اس کتاب کو مطالعہ کیجئے قیمت عـہ

شرح اسرار خودی:۔ علامہ اقبال کا بنیادی فلسفہ مثنوی اسرار و رموز میں بیان کیا گیا ہے۔ اصل کتاب فارسی میں ہے یہ شرح پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی نے اُردو زبان میں تحریر فرمائی ہے بے حد مقبول ہے دوسرا ایڈیشن اس گرانی کے زمانہ میں طبع ہوا ہے قیمت وہی ہے جو پہلے تھی صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (عـہ)

اقبال کا تصور زمان و مکان:۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی نے علامہ اقبال کے نظریہ زمان و مکان کی تشریح اُردو زبان میں کر کے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے علامہ کے چھ لیکچروں میں سے دو لیکچروں میں اسی مسئلہ پر بحث ہے اور یہی دو لیکچر مشکل ترین لیکچر ہیں اس لئے اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ قیمت دس آنے۔ (۱۰/)

موت و حیات اقبال کے کلام میں:۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی نے علامہ اقبال کے اس نظریہ پر سیر حاصل بحث کی ہے جو وہ زندگی اور موت سے متعلق رکھتے تھے یہ چھوٹا سا مضمون بے حد پُر از معلومات اور روح پرور ہے۔ قیمت چار آنے (۴/)

اقبال کے چند جواہر ریزے:۔ یہ علامہ اقبال کے ملفوظات کا ایک نادر مجموعہ ہے جو جناب خواجہ پروفیسر عبد المجید صاحب گورنمنٹ کالج لاہور نے جمع کیا تھا۔ قیمت صرف دس آنے۔ (۱۰/)

اشتراکیت اور اسلام:۔ مولوی محمد مظہر الدین صدیقی بی۔ اے کا یہ مضمون ہر لکھے پڑھے کے مطالعہ میں آنا چاہیے۔ قیمت صرف چھ آنے (۶/)

انتخاب غالب:۔ غالب کے کلام کا یہ ایک ایسا نادر مجموعہ ہے جو اب تک شائع نہیں ہوا۔ اس مجموعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ غالب نے خود اپنے کلام کا یہ انتخاب جمع کیا تھا۔ قیمت چھ آنے (۶/)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

بخدمت قارئین "پیغام حق"

مکرمی برادران، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

"پیغام حق" علامہ اقبال کی یاد میں ۱۹۶۴ء سے متواتر شائع ہو رہا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس سالہ میں صرف مضامین شائع ہوتے ہیں جو اسلامی فلسفہ اور تعلیماتِ قرآنیہ کی شرح کرتے ہیں۔ اس پر آشوب زمانہ میں جبکہ اسلام و قرآن کے قوانین سے لوگ بُعد اختیار کر رہے ہیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اسلامی نظریات اور تعلیمات کو عام کیا جائے ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی حدی را تیز تر مے خواں چو محمل را گراں بینی

میں آپ سے اس سلسلہ میں صرف اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ اگر آپ "پیغام حق" کے خریدار ہیں تو کم از کم چھ ایسے حضرات کے نام و پتہ سے مجھے آگاہ کیجئے جو آپ کے خیال میں اس پرچہ کی خریداری منظور کر لیں گے تاکہ اُن سے خط و کتابت کی جائے۔ اگر آپ سے ممکن ہو تو آپ خود بھی کچھ تھوڑا سا وقت نکال کر اس پرچہ کی توسیع اشاعت کے لئے کام کیجئے اور اگر آپ خریدار نہیں ہیں تو آپ خود بھی خریداری قبول کریں اور احباب کو بھی اس طرف متوجہ کریں اور کم از کم چھ حضرات کے نام و پتہ سے مجھے آگاہ کریں۔ آپ اسی فارم پر ایسے حضرات کے نام لکھکر مجھے ارسال فرما سکتے ہیں۔ جس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ والسلام۔

نیازمند محمد شاہ ایڈیٹر

بنام ایڈیٹر "پیغام حق"

جناب من، سلام مسنون آپ کی اپیل کے پیش نظر ذیل میں چھ حضرات کے پتے درج ہیں۔ آپ ان سے خط و کتابت کیجئے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ حضرات آپکے پرچہ کی خریداری منظور فرمالیں گے۔ والسلام۔

....

مکمل نام و پتہ:- ....

Registered No. L. 4584.

منظور کردہ صوبہ سندھ و ریاست بہاول پور و ریاست بھوپال برائے گورنمنٹ سکولز

اپریل ۱۹۴۴ء — جلد ۸ — عدد ۴

ماہنامہ

پیغامِ حق

مرتبہ

سید محمد شاہ، ایم۔ اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت سالانہ چار روپے — قیمت فی پرچہ ۵ آنے

ہماری تازہ مطبوعات

ہمارے ہندوستانی مسلمان

ولیم ہنٹر، آئی۔ سی۔ ایس

نے

ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے عہد میں مسلمانوں کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اور مسلمانوں کی اسلامی ذہنیت اور اس کے تبدیل کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہیں، یہ تاریخی کتاب مسلمانوں کی دماغی کیفیت اور ان کی تحریک ہائے آزادی کا ایک مرقع ہے، ضمناً وہابی تحریک، سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ اور جماعت مجاہدین سرحد کی مساعی کا مختصر مگر قابل وثوق اور نہایت سبق آموز ذکر آگیا ہے،

قیمت مجلد ۲ روپے ۱۲ آنے

انتخاب غالب

مرزا غالب دہلوی نے اپنے کلام کا ایک انتخاب خود تیار کرکے فنانشل کمشنر پنجاب کو بھیجا تھا اور ایک چٹھی اس کے ہمراہ ارسال کی تھی، یہ انتخاب اب تک کہیں طبع نہیں ہوا، اور اس قابل تھا کہ شائقین ادب اردو کے لئے اسے طبع کیا جاتا ہے،

قیمت ٦ آنے

اقبال پر ایک نظر

علامہ اقبال کی شاعری اور ان کی شخصیت پر مختلف اہل علم نے تنقید کی ہے، ہم نے اس میں سے چند بلند پایہ مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، اس میں مولانا ظفرعلی خاں، جناب سالک اور مولانا عبدالسلام ندوی ایسے ادباء کے مضامین ہیں،

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

اسلامی پارٹی کا آئین

اسلامی ہند میں مسلمانوں کو کن خطوط پر منظم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ان کے اندر ضبط (Discipline) قائم ہو سکتا ہے اور کس مقصد کو لیکر تمام مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہیں، ان سوالات کا جواب اگر آپ دیکھنا چاہیں تو جناب عزیز ہندی کی کتاب «اسلامی پارٹی آئین» کا مطالعہ فرمائیں، قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے — رؤسا سے چھ روپے

پیغام حق

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد ۸ | بابت ماہ اپریل ۱۹۴۴ء | عدد ۴

سید محمد شاہ ایم۔ اے پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس بیرون اکبری گیٹ لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ پیغام حق ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخنہائے گفتنی

پنجاب میں ان دنوں ایک عجیب سیاسی کشمکش جاری ہے۔ پنجابی مسلمانوں نے سر فضل حسین مرحوم کی قیادت میں ایک سیاسی پارٹی کو تشکیل کیا تھا جس کا مقصد ہمارے خیال میں، صرف یہ تھا کہ ہندوؤں نے انگریز حاکم کی خوشامد اور اس کی عنایت سے باوجودیکہ وہ اقلیت میں تھے پنجابی مسلمانوں پر جو اکثریت میں ہیں اتنا سیاسی اقتدار، اتنا مالی تفوق اور اتنا اخلاقی اثر ڈال لیا تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی ہستی بالکل معرضِ خطر میں پڑ گئی تھی۔ اُن دنوں مسلم مفکرین سوچ رہے تھے کہ کس طرح اپنی قوم کو ہندوؤں کے سیاسی اور اقتصادی دباؤ سے نکالیں۔ سر فضل حسین کو یہ سوجھی کہ اگر کوئی ایسا طریقہ نکالا جائے جس سے انگریز حاکم ناراض نہ ہو بلکہ اُس سے اُسے کوئی خاص فائدہ پہنچنے کی توقع ہو تو وہ ایسے طریقے کو اگر پنجاب کے ہندوؤں کے خلاف استعمال کریں گے تو یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔

سر فضل حسین مرحوم کے زمانہ شناس دماغ نے سوچا کہ اگر مسلم اکثریت کو پنجاب میں مضبوط کرنا ہے تو بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے مفاد کے نام سے کام کریں انہیں زمینداروں کے مفاد کے نام سے کام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ پنجاب میں زمینداروں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے اُس کے بعد دوسرے نمبر پر سکھ آتے ہیں اور تیسرے نمبر پر ہندو جاٹ۔ اب جو اسکیم مسلمان زمینداروں کے نفع کی خاطر بنتی ضروری تھا کہ اُس سے سکھ زمیندار اور ہندو جاٹ بھی فائدہ اُٹھاتے۔

سر فضل حسین نے اس کو گوارا کر لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ اگر ہم ایک روٹی پیدا کر سکیں اور اس میں سے ایک چوتھائی سکھوں اور ہندو جاٹوں کو دے دیں تو تین چوتھائی ہمارے پاس بچ رہے گی اور اس طرح ہم آہستہ آہستہ یارانِ وطن سے بہت زیادہ موٹے ہو جائیں گے۔

سر فضل حسین مرحوم نے اس سکیم کو بہمہ وجوہ کامیاب بنانے کے لئے اس کے تمام پہلوؤں پر خوب غور و خوض کیا اور کام شروع کر دیا۔ اُن کی اسکیم وقت کی راگنی تھی۔ وہ شاطرانِ مغرب کے ہتھکنڈوں سے بھی خوب واقف تھے۔ لہٰذا جب انہوں نے کام شروع کیا تو سب سے پہلے انگریز حاکم نے اُن کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا کہ تمہاری اسکیم بہت خوب ہے۔ تم نے اس کی بنیاد مغربی طرز کی جمہوریت اور ہندوستانی قومیت پر اُٹھائی ہے۔ اور یہی ہمارا منشا ہے۔ تمہاری اس اسکیم سے اگر ایک طرف مسلمان زمیندار کو کچھ اقتصادی فوائد حاصل ہوتے ہیں تو دوسری طرف برطانوی ملوکیت کی جکڑ بندیاں بھی مضبوط ہوتی ہیں۔ لہٰذا تم کام کرو، ہم تمہاری پشت پناہ ہیں۔

دوسری طرف سکھ اور ہندو جاٹوں نے جب دیکھا کہ ہندو بنیا کے دستِ تعدّی سے اُن کو چھٹکارا دینے کی ایک اسکیم میاں صاحب نے بنائی ہے اور انگریزی حکومت کی تائید بھی اُس کو حاصل ہے تو وہ بھی سر فضل حسین کے گرد جمع ہو گئے۔ اب وہ جماعت جو میاں صاحب کی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے بنائی گئی اُس کا نام "یونینسٹ پارٹی" یا "اتحاد پارٹی" تجویز پایا۔ اِس میں "مسلم زمیندار" سکھ زمیندار اور ہندو جاٹ شامل ہوئے اور لیڈر شپ میاں صاحب اور اُن کے جانشینوں کے ہاتھ میں آئی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو بنیا نے پنجابی مسلمانوں کو پیس ڈالنے کے لئے جو اسکیم بنا رکھی تھی، میاں صاحب کی یونینسٹ پارٹی نے اُس میں روڑا اٹکا دیا اور کسی حد تک مسلمانوں کے مفاد کو پنجاب میں فائدہ بھی پہنچا مگر یہ سب فوائد عارضی تھے اور مقامی۔ مغربی طرز جمہوریت میں پارٹی برسرِ حکومت

ہوتی ہے آج اگر یونینسٹ برسر اقتدار ہو کر مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں تو کل یہ پارٹی کمزور بھی ہو سکتی ہے اور آج کا حزب مخالف کل برسر اقتدار آ کر پنجابی مسلمانوں کے اس حاصل کردہ نام نہاد مفاد کو آن واحد میں خاک میں ملا سکتا ہے۔ لہٰذا میاں صاحب مرحوم کی اسکیم دائمی اور لازمی طور پر مسلمانوں کے امراض کا مداوا نہ ہو سکتی تھی ضرورت تھی کہ ہندی مسلمانوں کی ایک جماعت بنائی جاتی، اُس کو برسر اقتدار لایا جاتا اور تمام مسلمان من حیث القوم مل کر ایک طرف ہندو کے حرص و آز کا شکار ہونے سے بچنے کی کوشش کرتے دوسری طرف برطانوی ملوکیت کے پنجۂ استبداد سے رہائی پانے کے لئے جد وجہد کرتے۔

خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت یہ مقصد اور یہ نصب العین لے کر بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اُس نے مسلم لیگ کے مردہ جسم میں تازہ روح پھونکی اور جناب محمد علی جناح کے زیر قیادت کام کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ ابتدار ابتدار میں جو لوگ جناب جناح کے ساتھ شامل ہوئے اخلاقی اور سیاسی لحاظ سے بہت کمزور تھے مگر حتی المقدور تھوڑا بہت کام کرنے لگے۔ جناب محمد علی جناح نے اپنی دولت، اپنا آرام، اور اپنا کام سب قوم پر نثار کر دیا اُس نے کسی سے کچھ نہیں مانگا اور اپنی جیب سے خرچ کر کے قوم کا کام کیا۔ اپنے پرائے سب کی دشمنی مول لی۔ گالیاں سنیں۔ انگریزی حکومت کو ناراض کر لیا مگر مسلم لیگ کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں دن رات ایک کر دیا۔

آپ یہ تو دیکھ چکے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کی تاسیس کن اصولوں پر کی گئی تھی اب یہ بھی دیکھ لیجئے کہ مسلم لیگ کی بنیاد کن چیزوں کے پیش نظر رکھی گئی تھی۔ مسلم رہنماؤں نے دیکھا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت آہستہ آہستہ اپنے پنجہ کو ڈھیلا کر رہی ہے اور تھوڑے تھوڑے اختیارات ہندوستانیوں کو دے رہی ہے۔ ہندوستانیوں میں اکثریت ہندوؤں

کی ہے۔ مسلمان بہت زیادہ اقلیت میں ہیں۔ انگریزی حکومت برطانوی طرزِ جمہوریت کی حکومت ہندوستانیوں میں قائم کرنا چاہتی ہے اور اس کے لئے ہندوستانی قومیت کو اصل قرار دینا چاہتی ہے اس اصول کی بنا پر ہندوستان کی حکومت ایک دن برطانیہ کے ہاتھوں سے نکل بھی جائے تو مسلمانوں کو من حیث المسلمان کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے کوئی مطالبہ نہیں کر سکتے۔ اُن کو جو کچھ مل سکتا ہے وہ ہندوستانی ہونے کے لحاظ سے مل سکتا ہے۔ مگر ہندو مسلمانوں کا اتنا گہرا اور شدید دشمن ہے کہ وہ اُسے ہندوستانی ہونے کے لحاظ سے بھی کچھ نہیں دے گا۔ وہ سو حیلہ بہانہ کرے گا جیسا کہ اُس کی عادت سے ظاہر ہے اور جیسا کہ تجربہ ہو چکا ہے۔ پس اندریں حالات کوئی ایسی تجویز سوچنی چاہیئے جس سے مسلمانانِ ہند کی حیثیت من حیث القوم تسلیم کی جائے۔ وہ ہندوستانی نہیں بلکہ ہندوستانی مسلمان تسلیم کر لئے جائیں۔ اُن کی اپنی تنظیم ہو اپنی لیڈرشپ ہو اور اپنا ضابطہ اور اگر مغربی طرزِ جمہوریت پر ہی حکومت قائم کرنا مقصود ہے تو ہندوستان میں دو قومیں تسلیم کر لی جائیں۔ ایک ہندو اور دوسرے مسلمان۔ یہ دونوں قومیں مل جل کر رہیں اور ہمسایوں کا سا معاملہ کریں۔ جہاں ہندو اکثریت میں ہیں وہ اپنی حکومت قائم کریں اور مسلم اقلیت کے حقوق کی حفاظت اپنے ذمے لیں۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ اپنی حکومت قائم کریں اور ہندو حقوق کی حفاظت کریں۔

مسلم رہنماؤں کی یہ تجویز نہایت بے ضرر اور انصاف پر مبنی تھی مگر انگریز کے مفاد کو بھی اس سے نقصان پہنچتا تھا اور ہندو کے مفاد کو بھی۔ انگریز کا نقصان یہ تھا کہ مسلمان غلامی سے نکل کر اپنی تنظیم آپ کر سکتا تھا جو انگریز کو کسی طرح منظور نہیں ہندو کا نقصان یہ تھا کہ ہندوستان کا وہ حصہ جہاں ہندو کم ہیں اور مسلمان زیادہ وہ ہندوؤں کے تسلط

سے نکل مسلمانوں کے تسلط میں آجاتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہندی مسلمان ہندستان میں حیثیت القوم زندہ رہ سکتا تھا اور یہ بات ہندو کو ایک منٹ کے لئے منظور نہیں۔ ہندوؤں نے جب لیگ کے ان عزائم کو بھانپا تو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہندستان میں لیگ کے خلاف زہریلا پراپیگنڈا شروع کر دیا اور تو اور مسلمانوں کو بھی لیگ کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کے لئے ڈورے ڈالے گئے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ جب لیگ نے ان بنیادوں پر قوم کے لئے کام شروع کر دیا تھا تو پنجابی مسلمان سب سے پہلے میدانِ عمل میں اترتا مگر اس پر یونینسٹ پارٹی کے تازہ تازہ اثر کا جادو سوار تھا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم تو پنجاب میں میدان مار رہے ہیں اور لیگ کی کامیابی ابھی موہوم ہے کہیں یہ نہ ہو کہ لیگ میں شمولیت کے باعث ہماری اس کامیابی میں ہی فرق آجائے اس لئے انہوں نے خلوص دل سے لیگ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا مگر اپنی منافقانہ ٹانگ اس میں اڑا دی اور "نیمے درون نیمے برون" کی پالیسی پر عمل کرنے لگے۔ لیگ کے وقت شناس لیڈر نے دیکھا کہ یہ وقت ان کے ساتھ اُلجھنے کا نہیں اس لئے وہ خاموش رہا۔ مگر اب ۱۹۴۴ء میں اُس نے سمجھا کہ لیگ اس قدر مضبوط ہو چکی ہے اور اتنی اہم ہے کہ کسی منافق کا وجود اس میں گوارا نہیں ہونا چاہیئے اس لئے اُس نے برملا کہہ دیا کہ دیکھئے اب "دوعملی" کا دَور گیا۔ تمہارے اور ہمارے مقاصد میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تم صرف مقامی اور عارضی فوائد کے پیچھے پڑے ہو اور ہم قومی اور دائمی حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تم ایک طرف ہندوؤں کے آلۂ کار بن رہے ہو اور دوسری طرف برطانوی ملوکیت کی جڑیں مضبوط کر رہے ہو مگر ہم ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں سے بھی ہمیشہ کے لئے نجات چاہتے ہیں اور برطانیہ کی غلامی سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے

ہیں۔ لہذا ہمارے تمہارے درمیان اشتراک عمل کی کوئی صورت نہیں۔ ھٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَ بَیْنِکَ۔

یہ ہے اُس مطالبہ کی حقیقت جس کی رو سے جناب جناح نے وزیراعظم پنجاب سے مطالبہ کیا تھا کہ جو کوئی لیگ میں شمولیت کا دعویدار ہے اُسے یونینسٹ پارٹی سے اور ہر دوسری پارٹی سے قطعی انکار کر دینا چاہیئے۔ اور اسی مطالبہ پر یہ سب شور و غوغا ہے۔

کون ہے جو لیگ کے اس مطالبہ کو غیر معقول اور خود سرانہ قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہے؟

امام ولی اللہ اکیڈمی کا قیام

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی بانی محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی کے مشورہ سے ایک علمی ادارہ کو قائم کیا جا رہا ہے جس کا نام امام ولی اللہ اکیڈمی ہو گا۔ اس اکیڈمی کے پیش نظر یہ کام ہو گا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی جملہ تصانیف کو جو اس وقت دستیاب ہو سکتی ہیں اس ادارہ میں برائے فروخت جمع کرے اور جو تصانیف موجود نہیں ہیں اُن کے نہایت اعلیٰ اور محشی ایڈیشن شائع کرے۔ اس طرح یہ اکیڈمی امام ولی اللہ کی جملہ عربی فارسی تصانیف کی اشاعت و فروخت کا ایک مرکز بنے گی۔ آگے چل کر جوں جوں مناسب ہو گا جناب مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے مشورہ سے جن کتابوں کے تراجم اور ملخصات شائع کرنے کی ضرورت سمجھی جائے گی اُن کے تراجم اور ملخصات بھی اُردو اور انگریزی میں شائع کئے جائیں گے۔ رسید محمد شاہ مہتمم امام ولی اللہ اکاڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

نعرۂ فنا فی الرسول (صلعم)

کلام درویش (جمالی)

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغ تجلّی بسوزد پرم
(سعدیؒ)

کلامِ قلندر (جلالی)

کجا نوری کہ غیر از قاصدی چیزے نمے داند
کجا خاکی کہ در آغوش دارد آسمانے را
اقبالؒ

حافظؒ کی بیخودی

"اقبالؒ کے نظریۂ خودی کی روشنی میں"

(جناب بشیر محمد صاحب القادری علمی کراچی)

ہوائے بزم سلاطین دلیل مردہ دلی | کیا ہے حافظؒ رنگیں نوا نے راز یہ فاش
گرت ہواست کہ با خضر ہمنشیں باشی | نہاں ز چشم سکندر چو آبِ حیواں باش

(اقبالؒ)

اپنے معمول کے مطابق ایک دن حضرت جدّا مجد قبلہؒ کے ذاتی "کتب خانۂ علمیہ" کی سیر کر رہا تھا کہ میری نظر مکتوبات شریف "بحر المعانی" مصنفہ حضرت سید محمد جعفر مکی الحسینی نظامی علیہ الرحمۃ مطبوعہ مطبع احتشامیہ مراد آباد پر پڑی جسے ایک مرتبہ یہ ناچیز علمی نمائش منعقدہ سلور جوبلی انجمن ترقی اردو کراچی میں بھی پیش کر چکا ہے پہلے ورق پر ایک قلمی فارسی غزل تحریر کردہ نظر آئی جو جذباتِ عارفانہ کی آئینہ دار تھی اور یہ غزل ہندوستان کے مشہور بزرگ حضرت مولانا شاہ محمد سلامت اللہ صاحب کشفی بدایونی علیہ الرحمۃ کی تھی جو آپ نے خواجہ حافظؒ کی مشہور غزل "آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند" کے انداز میں لکھی ہے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں ع

---

[1] مخدوم الملت افضل الفقرا قدوۃ الحفاظ حضرت مولانا الحاج حافظ قاری صوفی محمد علم الدین القادری علیہ الرحمۃ متوطن ضلع گجرات پنجاب آپ کے حالات و خدمات کا تذکرہ کتاب "فیضِ علمی یا تجلّیِ فیض" مطبوعہ ہلالی اسٹیم پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ میں موجود ہے ۱۳۱۲ھ ۱۲

حرفِ حزیں بگفتۂ حافظؒ نمی رسد
کشفیؔ تو کیستی کہ ترا مرحبا کنند

اس غزل کے اثرات نے مجھے ان ناچیز سے خیالات کے اظہار پر مجبور کیا حافظؒ شیرازی کی شہرۂ آفاق ہستی علمی اور روحانی مراتب کی بدرجۂ اتم حامل ہے ایران کے صوفی اور غزل گو شعراء میں خواجہ حافظؒ کا ایک بلند مرتبہ ہے حافظؒ ایک غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت سے بھی کافی شہرت رکھتے ہیں حافظؒ کی غزلیں آج نہ صرف عیش و طرب کے جلسوں میں دلچسپی اور مسرت کا باعث ہیں بلکہ اہل دل اور سوختگان عشق و محبت کے روحانی حلقوں میں بھی سوز و گداز پیدا کر کے خراج عقیدت حاصل کرتی ہیں حافظؒ کی شاعری کی دھوم یورپ کے کانوں میں بھی پڑی اور اس قدر کہ یورپ کے ادیبوں[1] اور مستشرقین سے طبقے خصوصی طور پر انس رکھنے لگے کچھ مدت ہوئی کہ پروفیسر سید عارف شاہ صاحب گیلانی ایم۔ اے نے سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی کے سالانہ رسالہ "کرانیکل" گولڈن جوبلی نمبر میں خواجہ صاحب کی شاعری اور حالات و ارشادات پر انگریزی زبان میں (HAFIZ A STUDY) کے عنوان سے ایک بلند پایہ مقالہ لکھا تھا حافظ کی مقبولیت خداداد کا اندازہ اس کے کمالات کی شہرت و عقیدت اور قدر دانی سے بخوبی ہو سکتا ہے

ع
فگند زمزمۂ عشق در عراق و حجاز
نوائے بانگ غزلہائے حافظؒ شیراز

حافظؒ کے کلام و شاعری اور حالات پر مختصر اور متعدد تبصرے ہو چکے ہیں اور تنقیدات بھی شائع ہوئی ہیں ارباب ادب اور طبقۂ صوفیہ نے حافظؒ کے ارشادات و احساسات جذبات و خصوصیات اور عارفانہ نکات پر بہت کچھ لکھا ہے مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے محققانہ طور پر آپ کی شاعری و حالات اور فکر و نظر پر اپنی تصانیف میں عمدہ تبصرہ کیا ہے حافظؒ کی سوانح حیات سے یہ بات روشن ہو سکتی

---

[1] مسٹر پامر پروفیسر نکلسن براؤن ولیم جاکسن وغیرہ۔

ہے کہ زاہدانہ مذاق اور جذباتِ محبت کا اثر حافظؔ پر فطری تھا حافظؔ بیباکانہ طور پر خود پرستی کے عزائم اور ریاکاری کے جذبات ترک کرنے کے اسباب بتلاتا ہے ع

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

آزاد منش، قلندر مشرب، حافظؔ گویا عجائباتِ اسرار و حقانیت کا پیکر ہے مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ "اُن کے اشعار اور جستہ جستہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سادگی اور آزادی سے زندگی بسر کرتے تھے قرآن مجید کے نکات اور حقائق پر درس دیتے تھے لیکن بایں ہمہ اظہار تقدس سے نہایت نفرت رکھتے تھے صاف دل اور بے تکلف تھے جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا کوئی برائی کرتے تو ریاکاری کے پردے میں چھپا کر نہ کرتے" (حیات حافظ صفحہ ۱۱)

حافظؒ کے کلام میں مجاز و حقیقت کا عکس یکساں نظر آتا ہے رندان خمکدۂ حافظؔ خُم کے خُم پی کر بھی "ہل من مزید" کا نعرہ لگاتے ہیں درد و گداز اور عشق و محبت کی دولت مبداء فیاض سے حافظؔ کو خوب عطا ہوئی ہے اور یہی چیز ایران کے صوفی شعراء میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ مولانا شبلی نعمانی "الغزالی" میں لکھتے ہیں کہ "امام غزالیؒ نے جب فارسی زبان کو تصوف سے آشنا کیا اور فارسی کے لٹریچر کے رگ و پے میں صوفیانہ خیالات سرایت کر گئے تو شاعری میں بھی سچے جذبات و احساسات آ گئے۔ خواجہ فریدالدین عطار المتوفی ۶۳۱ھ نے جو اس طرز کے بانی تھے سادگی کے ساتھ صوفیانہ خیالات ادا کئے عارفِ رومؒ نے اس میں گرمی پیدا کی اور پھر سعدیؒ و حافظؒ اور عراقیؒ نے اس شراب کو اس قدر تیز کر دیا کہ ع حریفاں را نہ سرماند و نہ دستار

غرض فارسی شاعری میں تاثیر کا جو نشہ پیدا ہوا وہ "تصوف" کی بدولت اور تصوف کا جو مذاق زبان میں آیا وہ امام غزالیؒ کی بدولت آیا۔ حافظؒ کی زندگی عملی طور پر سیاسی رموز سے بالکل

علیحدہ بھی "بانگ درا" میں شاعر مشرق مفکر اعظم حضرت مرشدنا علامہ ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمۃ نے قرب سلطان کی نظم سے اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے جس میں "پیام مرشد شیراز بھی مگر سن لے" کہہ کر کمالات حافظ کو روشن تر کر دیا ہے حافظ کا درس اتحاد انسانیت بالکل مخلصانہ تھا اور یہ چیز حافظ کی روحانی فکر و نظر میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے حافظ کے کمالات باطنی کا نظارہ اہل دل اور عرفائے کاملین کے ارشادات سے بخوبی ہو سکتا ہے

تا اقتدا بہ حافظ شیراز کردہ ایم

گردیدہ مقتدائے دو عالم کلام ما

نظیری

حافظ اتحاد و محبت کا فطری شائق ہے وہ فرقہ بندیوں کا قائل نہیں وہ اپنے آئین و روش کا واضح اعلان کرتا ہے ع

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ... چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

بروایں دام بر مرغ دگر نہ ... کہ عنقا را بلند است آشیانہ

در عشق خانقاہ و خرابات شرط نیست ... ہر جا کہ ہست پرتو روئے حبیب است

نقش ظاہر مبیں کہ حافظ را ... سینہ گنجینۂ محبت اوست

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

شاعر مشرق علامہ اقبال نے "اسرار خودی" میں جو کچھ خواجہ حافظ کے نظریئے سے اختلاف کیا وہ چند وجوہ پر تھا۔ بعد میں آپ کا نظریہ بدل گیا تھا" جوہر اقبال" میں حضرت اقبال کا مکتوب اس پر بھی و محترمی مولانا عبدالمالک صاحب آروی لکھتے ہیں کہ "اقبال نے فارسی شعراء بالخصوص صوفیانہ شاعری سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے اس سلسلے میں سنائی، عطار، رومی، خاقانی کا نام

لیا جا سکتا ہے اُن کی شاعری پر زبانِ فارسی کے دیگر ہندی اور ایرانی شعرا کا بھی اثر پڑا ہے مثلاً حافظؒ و صائبؔ۔ طالبؔ آملی و بیدل وغیرہ کا کلام بھی اُن کے زیرِ مطالعہ رہا ہے"

(اقبال کی شاعری صفحہ ۱۲ سلسلۂ مطبوعات ادارۂ طاقِ بستان آمنہ)

اقبال کی سیاسی زندگی اور حکیمانہ نظریوں میں ایک حد تک دورِ حاضر کے انقلابی خارجی اور داخلی اثرات بھی شامل تھے اور پھر اقبالؒ نے صوفیۂ کاملین ہی کی فلاسفی "عرفانِ نفس خودشناسی" کا نظریہ لے کر اپنے اجتہادی اصول میں "خودی"[1] یعنی خود آگہی سے بالیِ نشوونما اور تربیت دینی چاہی حافظ ایک خود آگاہ زندہ قلندر ہے جس نے اپنی آنکھوں سے کئی انقلاب دیکھے وہ جمود اور اثرات پھیلانے کا باعث نہیں ہو سکتا ہم اگر غور و فکر کریں تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ حافظؒ کی فلاسفی "بیخودی" کی مستانہ کیفیتوں میں بھی "خود آگہی" اور "ہمت و عمل" کی آئینہ دار ہے اب اگر اُس کے اسٹ و نظریہ سے عوام کچھ اور مطلب نکال لیں تو حافظؒ کی شاعری موردِ الزام نہیں ہو سکتی حافظ فطری جذبات اور عرفانی مشاہدات کی جھلک دکھلاتا ہے" روحانیت" کے فطری مقاصد ہر دور میں فطری تربیت کو نشوونما دینا چاہتے ہیں اور اُس کے لطیف اثرات ظاہر و باطن میں یکساں ظہور میں آتے ہیں اس حقیقت کا انکشاف مرشدنا اقبالؒ نے "قلندریت" کے دور میں خوب کیا ہے اس میں شک نہیں کہ حافظؒ نے بھی اپنے اشعار میں بعض جگہ ملکی انتشار اور اُس دور کے زوال کے اسباب پر اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے مگر عملی طور پر وہ بھی حضرتِ اقبالؒ کی طرح" یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں۔

ع کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش"

---

[1] گو بظاہر اقبالؒ اُس نظریہ میں جرمنی متفکر نطشہ کے خیالات سے بھی استفادہ کر چکے تھے ۱۲ منہ

[2] فردوس میں رومیؔ سے یہ کہتا تھا سنائیؔ ۔۔۔ مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلاجؒ کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر ! ۔۔۔ اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

(بالِ جبریل)

کی صورت رکھتے ہیں حافظؒ نے کسی محدود ماحول کو پسند نہ کیا بلکہ اپنے فطری مذاق کی بنیاد وسیع النظری اور آزاد منشی پر رکھی تھی ملک کے مشہور ادیب و شاعر جناب میر ولی اللہ صاحب بی۔ اے ایل ایل بی وکیل ایبٹ آباد مصنف "گلبانگ" "ذروقی" وغیرہ نے نہایت محنت سے یہ علمی کارنامہ پیش کیا ہے کہ آپ نے حافظ کے ارشادات پر اُردو زبان میں ایک عالمانہ شرح لکھی ہے جو کئی جلدوں میں طبع ہو چکی ہے حافظؒ کی زندگی میں سلاطین وقت اُمراء اور ہمعصر شعرا آپ کے عقیدت مند اور مُعترف تھے بلکہ دور دراز ملک کے فرمانروا آپ کو طلب کیا کرتے تھے مگر شیراز کی خاکِ پاک سے قدم باہر رکھنا گوارا نہ تھا مخدوم زمن حضرت مولانا شاہ محمد حسن چشتی صابری رامپوری علیہ الرحمۃ ہمعصر حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اپنی مشہور ضخیم تصنیف "تواریخ آئینہ تصوف" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت خواجہ حافظ شیرازیؒ ۲۴ ماہ صفر ۷۰۹ھ کو پیدا ہوئے بروز دوشنبہ وقت مغرب خوزستان میں (از تواریخ ظہرت نامہ) ۲ ماہ شوال ۷۹۱ھ میں بروز جمعہ بوقت بعد نماز حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بمقام فیصاریہ خلافت پروانہ حاصل کی خلیفہ اکبر آپ سے اس سلسلہ خاص میں حضرت میراں شاہ لاہوری ہوئے ہیں مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ "قرآن مجید اور تفسیر کے ساتھ خاص لگاؤ تھا دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ کشاف پر حاشیہ بھی لکھا ہے خود فرماتے ہیں ع

زحافظانِ جہاں کس چو بندہ جمع نہ کرد
لطائفِ حکما با کتاب قرآنی

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب قرآن مجید کی تفسیر میں معقول کو منقول سے تطبیق دیتے تھے فنِ قرأت میں کمال تھا اس کے ساتھ خوش آواز بھی تھے معمول تھا کہ ہمیشہ جمعہ کی رات کو مسجد کے مقصورہ میں تمام رات خوش الحانی کے ساتھ قرآن مجید پڑھتے قرآن مجید حفظ تھا اور اس مناسبت

سلہ حضرت مخدومؒ صاحب قبلہ کی یہ تصنیف نایاب ہے ایک نسخہ "قدیم کتب خانہ علمیہ" میں ہے ۔۔ ۱۲ منہ

سے حافظ تخلص رکھا قرآن دانی پر اُن کو ناز تھا چنانچہ اشعار میں جا بجا اس کے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ع

ندیدم خوشتر از شعرِ تو حافظؔ
بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظؔ
آنچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم (حیات حافظؔ)

آج میرا مقصد یہی ہے کہ حافظ اتحاد و محبت کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اپنے حکیمانہ درس سے ذاتی ارتقا اور عرفان خودی کا بھی پیغامبر ہے اس سلسلے میں حافظؔ و اقبالؒ کے چند ارشادات کے موازنہ سے حقیقت ظاہر ہو جائے گی

محترمی میر ولی اللہ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل ایبٹ آباد کے چند گراں قدر افادات پیش کرتا ہوں۔

---

(۱) سعی ناکردہ دریں راہ بجائے نرسی
مزد اگر می طلبی طاعتِ استاد ببر

ترجمہ:۔ کوشش کے بغیر اس راستے میں منزل تک نہیں پہنچے گا اگر تو صلہ چاہتا ہے تو اُستاد کی خدمت کر مطلب یہ ہے کہ بغیر سعی کے تو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔

خواجہ صاحب اگرچہ جبری خیالات کے ہیں مگر سعی اور کوشش کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

گفت پیغمبر بآوازے بلند
با توکل زانوئے اُشتر ببند

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو
از توکل در سبب کاہل مشو! (رومیؒ)

حافظؒ کے اس ارشاد میں علمی اخلاقی روحانی قومی ملی اور مذہبی عزائم کے لئے بہترین درس عمل ہے اس شعر سے استاد روحانی کی اطاعت و خدمت کا بھی سبق ملتا ہے عمل و زندگی کے ارتقا کے لئے کتنا نفیس نکتہ ہے۔

---

(۲) حافظا در کنج فقر و خلوت شبہائے تار
تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

ترجمہ:- اے حافظا فقر کے گوشے اور سیاہ راتوں کی خلوت میں جب تک دعا اور قرآن کا درس تیرا ورد ہوگا تجھے کچھ ڈر نہیں خواجہ صاحب کی سوانح عمری پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تمام عمر درس قرآن میں گذری آپ بڑے درجے کے شب بیدار اور سحر خیز عابد تھے فرماتے ہیں کہ جب تک دعا اور درس قرآن تیرا ورد ہے تجھے کچھ خطرہ نہیں سعادتِ دارین تجھے حاصل ہوگی ہر ایک مسلمان کو یہ نصیحت گوش ہوش سے سننی چاہیئے کہ مسلمانوں کی دینی اور دنیوی فلاح و بہبودی قرآن کریم سے وابستہ ہے:-

(۳) چو باد از خرمن غیراں ربودن خوشہ تا چند
زہمت توشہ بردار و خود تخمے بکار آخر

ترجمہ:- اغیار کے خرمن سے ہوا کی طرح تو کب تک خوشہ چینی کرے گا ہمت سے توشہ اٹھا اور آخر خود بھی تو بیج بو۔

ایک نہایت زرین اصول اور بہت قیمتی نصیحت ہے فرماتے ہیں کہ ہوا کی طرح دوسرے لوگوں

کے خرمن سے کب تک خوشہ چینی کرے گا خود کمر ہمت باندھ اپنے ہاتھ پاؤں ہلا اور خود بیج بو تاکہ تو بھی خرمن کا مالک ہو اور دوسرے لوگ تیرے خرمن سے خوشہ چینی کریں ایک عام فہم مثال سے خواجہ صاحب نے ایک عظیم الشان اصول کی تعلیم دی ہے ذوق عمل پر اس سے بہتر کوئی شعر نہیں ہو سکتا۔

(۴) فیضِ رُوح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

ترجمہ:۔ رُوح القدس کا فیض اگر پھر مدد فرمائے تو اور لوگ بھی وہ بات کر سکتے ہیں جو مسیحا کرتا تھا شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر تائید غیبی اور فضلِ خدا شاملِ حال ہو تو ہر ایک آدمی ایسے کام کر سکتا ہے جو حضرت عیسےٰؑ کیا کرتے تھے یعنے مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے اس شعر میں خواجہ صاحب نے ایک نہایت حوصلہ بخش اور اُمید افزا اصولوں کی تلقین کی ہے حقیقت میں انسان کو بڑے سے بڑے کام کے سرانجام دینے سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئیے۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو کام ایک شخص نے کیا وہ دوسرا بھی کر سکتا ہے ع

(۵) بخواری اے مُنعم ضعیفاں و فقیراں را
کہ صدر مسندِ عزت فقیر رہ نشیں دارد

ترجمہ:۔ اے دولتمند ضعیفوں اور فقیروں کو حقارت سے نہ دیکھ کیونکہ مسندِ عزت کا صدر رہ نشین فقیر کے پاس ہے یعنی اصلی عزت فقیروں ہی کو حاصل ہے تو اُن کو حقارت سے نہ دیکھ تیری دُنیاوی عزت کچھ نہیں ؎

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

خواجہ حافظ کی مشہور غزل ع

یاری اندر کس نمے بینیم یاراں را چہ شد

دوستی کے آخر آمد دوستداراں را چہ شد"

جناب میر ولی اللہ صاحب ایک طویل تبصرے کے بعد لکھتے ہیں کہ "یہ غزل موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی مذہبی اخلاقی تمدنی اور ملکی حالت کا بالکل صحیح نقشہ ہے" اسی غزل کا ایک شعر ہے ع

(۴) عقلے از کانِ مروت بر نیآمد سالہا است

تابشِ خورشید و سعی وابر باراں را چہ شد

ترجمہ:- کئی سال ہوئے کہ مروت کی کان سے کوئی لعل نہیں نکلا آفتاب کی تابش کو اور ابر وباراں کی سعی کو کیا ہوا۔

تابش خورشید اور ابر و باراں کے اثر سے پتھر لعل بنتے ہیں فرماتے ہیں کہ کوئی لعل نظر نہیں آتا تابشِ خورشید کو کیا ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں کوئی مرد پیدا نہیں ہوتا دست قدرت کو کیا ہوا اس سوال کا جواب خواجہ صاحب خود شعر و عشہ۱۱ میں دے چکے ہیں ع

طالب لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید

ہمچناں در عمل معدن و کانست کہ بود

اسی مضمون پر ہے ع

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں

ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں — اقبال رح

---

(۷) فرشتہ عشق نداند کہ چیست اے ساقی
بیار جام شرابے بخاک آدم ریز

ترجمہ:- اے ساقی فرشتہ نہیں جانتا کہ عشق کیا ہے پیالہ لا اور آدم کی خاک پر شراب گرا۔
ساقی میخانۂ عشق کو مخاطب کرکے خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ فرشتوں کو معلوم نہیں کہ عشق کیا چیز ہے یہ نعمت انسان کے حصہ میں آئی ہے اس لئے شراب صرف آدم کی خاک پر ہی گرانی چاہئے پہلے کئی بار لکھا جا چکا ہے کہ رابطۂ عشق صرف خدا اور انسانوں کے درمیان ہے خدا اور فرشتوں کے درمیان نہیں عشق کی شراب صرف آدم کی مٹی میں ملائی گئی ہے:۔

(۸) طریق خدمت و آئین بندگی کردن
خدائی را کہ رہا کن بیاد سلطان باش

اسی غزل کے ایک شعر پر شاعر مشرق نے "بانگ درا" میں "قرب سلطان" نظم لکھی ہے۔
ترجمہ:- خدمت کا طریقہ اور بندگی کرنے کا قاعدہ خدا کے لئے چھوڑ آ اور بادشاہ بن مطلب یہ ہے کہ آزاد خیال ہو اور دل کا بادشاہ بن جا اغیار کی خدمت اور بندگی چھوڑ غلو ہمت اور آزادمنشی کی تعلیم ہے۔

اب حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی تعلیمات جدید جہد فلسفۂ خودی کو بھی دیکھئے کہ آپ کا نصب العین لسان الغیب خواجہ حافظ کے حقیقی درس سے کس قدر قریب ہے حافظ کا "پیام بیخودی" فی نفسہ صحیح معنوں میں "اسرار خودی" کے رموز عریاں کرتا ہے:۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے — پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے — دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل — اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات — علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات

زباں نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

متاعِ دین و دنیا لٹ گئی اللہ والوں کی — یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود — کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو — یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب

آنکھ کا نور دِل کا نور نہیں

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی — کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

نہ میں عجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی — کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے — روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال — عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی   الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی

نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

یہاں پر تو اقبالؒ و حافظؒ کی فکر و نظر میں کوئی تضاد معلوم نہیں ہوتا البتہ بظاہر بیان مقام اور ماحول جداگانہ ہے اقبالؒ کی قومی اور ملی زندگی نے جو احساسات پیدا کئے لازماً وہ ماحول سے بھی وابستہ تھے ایک قومی مصلح اور رہنما کی حیثیت سے اقبالؒ کا پیغام انہیں تاثرات کا حامل ہے لیکن اقبالؒ علم عرفان اخلاق و روحانیت کے رموز و نکات بھی عریاں کر چکا ہے خواجہ صاحبؒ بھی اپنے یکتا انداز میں یہی دولتِ بے بہا لٹاتے ہیں اگر صحیح احساسات کے اظہار و تفکر کو علم و عمل کا نظام تصور کر لیا جائے تو آج بھی اربابِ نظر اور اہلِ بصیرت حافظؒ کی "بیخودی" میں اقبالؒ کی "خودی" کے اسرار و جوہر پا سکتے ہیں حضرت علامہ کی بلند و بالا نگاہ اور بلند پرواز تخیل اپنے نزدیک مشرق و مغرب کے اہل کمال کی قدر افزائی پاتا ہے اور جو غالبؔ، داغؔ، حالیؔ، بیدلؔ، صائبؔ، رومیؒ، سنائیؔ، عطارؔ، خاقانیؔ، زامؔ، نانکؔ، گوئٹے، نیٹشے، آرنلڈ وغیرہ کی یکساں انسیت رکھتا ہے کیا وہ ایران کے روحانی عارف اور بے مثال شاعر خواجہ حافظ شیرازیؒ سے کچھ بھی انس نہیں رکھتا؟ اقبالؒ جب فلاسفیٔ اسلام قدوۂ عارفاں حضرت مولانائے رومی علیہ الرحمۃ کا حلقہ بگوش ہوتا ہے تب قلندریت کے اسرار و رموز کا عقدہ حل ہوتا ہے اور اس لحاظ سے تو اقبالؒ داعیِ انقلاب و آزادی ہوتے ہوئے حافظؒ کی فکر و نظر کا بھی ایک حد تک قائل اور سپرد ہے ع

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور   عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود

میکدۂ شیراز کے رندِ سرمست حافظ کی بارگاہ میں ایک عرصے کے بعد الحانی فلسفی شاعر گوئٹے ہدیۂ نیاز پیش کرتا ہے۔" راز" ادب" اثر جلیلی چشتی امیری" شاعر" آگرہ دسمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۶)

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ۔۔۔ کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ

جہاں میں جوہر اگر میرا آشکارا ہوا ۔۔۔ قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبالؔ ۔۔۔ جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؔ

ز رومیؒ گیر اسرار فقیری ۔۔۔ کہ آں فقر است محسود امیری

غواص تو فطرت نے بنایا ہے مجھے بھی ۔۔۔ لیکن مجھے اعماق سیاست سے ہے پرہیز

قلندریم و کراماتِ ما جہاں بینی ۔۔۔ ز ما نگاہ طلب کیمیا چہ مے جوئی

لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازیؒ نے تو آج سے بہت پہلے پکارا تھا ؏

آنچہ زر میشود از پرتوِ آں قلب سیاہ ۔۔۔ کیمیا است کہ در صحبت درویشاں است

جناب پروفیسر آغا حشر حشری شیرازی جرنلسٹ مدیر "برق" بمبئی نے تشریح غزل زندہ رود کے عنوان سے ہمارے درویش شاعر کی ایک غزل پر نہایت عمدہ شرح لکھی ہے چنانچہ آپ اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں ؏

نظر ز صحبت روشن دلاں بیفزاید ۔۔۔ ز درد کم بصری توتیا چہ مے جوئی ۔۔۔ (اقبالؒ)

ترجمہ:۔ کم نظری یا کوتہ نظری کا علاج توتیا سے ناممکن ہے اگر تو اپنی نظر کو وسیع اور فراخ کرنا چاہتا ہے تو اُن لوگوں کی صحبت کا شرف حاصل کر جو روشن ضمیر ہیں اور نورانی قلب کے مالک ہیں یعنی حجاب لامکان اور وہ حجاب جن کا تو متمنی ہے تیری آنکھیں اُس وقت تک اُن حجابوں کو نہیں دیکھ سکتیں جب تک کہ تو ایسے بزرگوں کی صحبت کا شرف حاصل نہ کرے جن کی نظروں سے قدرت کے حجاب اُٹھ چکے ہوں اور جن کی نظر سے قدرت کے حجاب اُٹھ چکے ہوں اور جن کے منہ سے یہ آوازیں بلند ہو رہی ہوں "نحن حجاب اللہِ اکبر" کوتہ نظری کا علاج توتیا سے نہیں بلکہ اُن کی صحبت سے ہو سکتا ہے جو فنا فی اللہ کی منزل میں پہنچ کر طبقات آرض و سما کے مناظر دیکھ سکتے ہیں۔" (الاصلاح بمبئی مورخہ ۱۷ جون ۱۹۳۶ء صفحہ ۹) یہی حقیقت اسلامک صوفی ازم کی روح رواں ہے ؏

فقر خواہی آں بہ صحبت قائم است ۔ نے زبانت کار می آید نہ دست
دست مردے گیر تا مردے شوی جُز بمردے نیست راہ رہبری
تا نیفتد بر تو از مردے نظر از وجودے خود کجا یابی خبر
فلسفی گشتی و آگہ نیستی تو کجا و از کجا و کیستی

خود شناسی کار باشد اے فلاں
کار دیگر ہیچ پوچ و ہیچ داں

عرفانِ نفس اور خود شناسی و فقر کی دولت مرشدِ معنوی سے اقبالؒ نے پائی کیا پا مقصود حقیقی پالیا ع

علاج آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہے تیرا تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
خرد نے مجھکو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے مجھکو حدیث رندانہ
مقام عقل سے آساں گذر گیا اقبالؒ مقام شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ
گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز ابتک کہ تو ہے نغمۂ رومیؒ سے بے نیاز ابتک

پسند آگئی سب کو قلندری میری
دگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

حضرت مولانا عبد المالک آروی تحریر فرماتے ہیں کہ اقبالؒ کے کلام پہ صوفی ادب کا بہت بڑا اثر پڑا ہے قدیم فارسی شعرا میں اکثر بڑے پایہ کے صوفی بھی تھے چنانچہ سنائیؒ و عطارؒ اور رومیؒ کے مطالعہ نے اُن کے اندر تصوف کا بہت بلند ذوق پیدا کر دیا" (اقبالؒ کی شاعری صفحہ ۲۵)
شروع شروع میں اقبالؒ حافظؒ کے رندانہ مذاق پر معترض تھے حافظؒ نے اس کے متعلق خود ہی کہہ دیا ہے۔ ع

خرم دل آنکہ ہمچو حافظؒ
جام ز مے الست گیرد

میر ولی اللہ صاحب نے شرح لسان الغیب جلد سوم" میں اس اعتراض کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے کہ "شراب شیراز ہول رتا خیز کا علاج نہیں ہو سکتی یہ کوئی اور ہی شراب ہوگی"
حضرت مولانا ناطق لکھنوی "بستان معرفت" میں لکھتے ہیں کہ مولانا حافظ شیرازی جو شرابی مشہور ہیں یہ غلط ہے وہ ہرگز شراب نہ پیتے تھے نہ کبھی انہوں نے نشہ استعمال کیا البتہ بحالت جذب ان کی عمر زیادہ گذری، ان دنوں اس سلسلے میں اقبالؒ کے اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے ایک طویل مضمون "سر اسرار خودی" لکھا تھا جو رسالہ "صوفی" پنڈی بہاؤالدین گجرات پنجاب میں چھپا تھا۔ اقبالؒ سے خط و کتابت بھی ہوئی تھی اور جو کچھ جناب مولانا اسلم صاحب جیراجپوری نے حافظؒ کے متعلق "جوہر اقبالؒ" میں لکھا ہے میں نے اس سلسلے میں حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی سے بھی استفادہ کا شرف حاصل کیا ہے "شاعر" آگرہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۳ء میں وہ مکتوبات بعنوان "کراچی سے اعظم گڑھ تک" شائع ہو چکے ہیں حضرت علامہ نے میرے سوالات کا مندرجہ ذیل جواب عنایت فرمایا تھا:۔

سوالات:۔

(۱) کیا حضرت حافظ شیرازیؒ کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ آپ "شراب نوش" تھے؟

(۲) حافظؒ کی فکر و نظر مجاز و حقیقت میں کیا جمود و رہبانیت کی آئینہ دار ہے؟

(۳) حافظؒ کا پایہ محض شاعرانہ نظریہ سے بلند تھا یا روحانی حقائق کی بدولت۔

(۴) اقبالؒ کا حافظؒ سے اختلافی نظریہ کن اسباب پر متصور تھا؟

جواب:۔

(۱) حافظؒ کی شراب نوشی پر استدلال اُن کے اشعار سے کرنا صحیح نہیں صوفیہ نے شراب کا لفظ عشق اور جوش و مستی کے معنے میں استعمال کیا ہے اور اس کو اُن لوگوں نے بھی استعمال کیا ہے جن کا نہ پینا مسلم ہے غالب جیسے اقراری میخوار کو بھی یہ کہنا پڑا ع

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

ہمارے زمانے میں ریاض خیرآبادی خمریات کے سب سے بڑے شاعر تھے مگر انہوں نے عمر بھر نہیں پی۔

(۲) حافظؒ کی فکر و نظر عشق و مستی پر مبنی ہے جو کام کیا جائے اسی جذبے سے کیا جائے وہ خواہ خدا پرستی ہو یا دنیا پرستی ہو شاعر کے الفاظ ذو جہتین ہوتے ہیں یہ سامع کے اختیار میں ہے کہ وہ کس چیز کو اختیار کرتا ہے۔

(۳) دونوں حیثیتوں سے۔

(۴) اقبالؒ کا خیال تھا کہ حافظؒ بیخودی کی شراب فنا سے مست ہیں اور اس سے قوم کے قوائے عملی میں افیون کی سی سستی اور بے عملی پیدا ہوتی ہے اور اقبالؒ خودی کی تعلیم دیتے تھے جس میں قوائے عمل کے جدّ و جہد اور طوفان آب و باد سے ستیز کی خاصیت ہے۔

(۲۴ ر مئی ۱۹۴۳ء اعظم گڑھ)

ناچیز نے پھر اپنے عریضے میں گذارش کی تھی کہ "میرے خیال میں تو خودی" بھی فلسفیانہ اجتہادی نظریہ ہے جو صوفیانہ فلاسفی ہی سے لیا گیا ہے میں نے تو حافظ رح کے ارشادات ایسے بھی دیکھے جو زندہ عملی و روحانیت اور قرآنی تعلیمات کے داعی ہیں بلکہ ایک حد تک اقبالؒ حافظؒ کے بھی پیرو ہیں شروع کے دور میں اقبالؒ اس راہ پر گامزن تھے لعد میں "بانگ درا" میں حافظؒ کی عقیدت میں نظم بھی لکھی ہے" پھر حضرت علامہ صاحب نے اپنے دوسرے مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ "حافظؒ

صرف رند بیخوار نہ تھے حکیم بھی تھے اور اُن کی شراب بھی ہر جگہ ایک ہی شراب نہیں"

(مکتوب نمبر ۲۹ مورخہ ۲۴ر جون ۱۹۴۳ء دارالمصنفین اعظم گڑھ)

بکھری پڑی ہیں یوں تو شرابیں ہزار ہا
پیاسی ہے جس کی روح وہ صہبا ہی اور ہے
(جگر مرادآبادی)

آنریبل سر عبدالقادر صاحب نے اپنے ایک بلند پایہ مقالہ "ایرانیوں کا نظریہ جمالیات" میں ایرانی ادب و آرٹ پر خوب بحث کی ہے جس میں آپ لکھتے ہیں کہ "فرانس کی طرح ایران میں انگور کثرت سے پیدا ہوتے ہیں ایرانی نہ صرف اس گراں قدر پھل کو پسند کرتا ہے بلکہ اُس کی شراب کو بھی جس کا وہ خاص طور پر دلدادہ ہے اور جسے وہ بجا طور پر بنتِ عنب کہتا ہے وہ فن اور فطرت کی خوبیوں کو دیکھتا ہے اور راگ شوق سے سنتا ہے اس طور پر کان اور آنکھ دونوں حظ اُٹھاتے ہیں یہ خاصے اب بھی اپنا رنگ دکھاتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ذوق مے نوشی کبھی کبھار عملی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے لیکن اکثر و بیشتر زبانی جمع خرچ تک ہی محدود رہتا ہے ایرانیوں کے مذکورہ بالا عیش و طرب کا ذوق گویا اُن کا جزو فطرت بن چکا ہے یہ انہوں نے بزرگوں سے ورثے میں پایا ہے فارسی زبان کے بعض قادر الکلام شعرا صدیوں سے اُن کے ذوق کو مزید تقویت پہنچاتے رہے ہیں انہوں نے زندگی کی مسرتوں کو روحانی لباس ہی میں پیش نہیں کیا بلکہ ایرانیوں کی متصوفانہ شاعری کے زیر اثر اُن میں تقدس و پاکیزگی کا رنگ بھی بھرا شیراز کے مشہور شاعر حافظؒ نے جام اور ساقی کو نئے معنے پہنائے حافظ کے شاگردوں اور مداحوں نے انگور کے رس کو شراب معرفت اور ساقی کو روحانی رہبر سے تعبیر کیا یہ نئے معنے خاص خاص لوگوں نے قبول کئے عوام نے اُس کے کلام کا یہ مطلب

ؔ علامہ اقبالؒ نے انہیں وجود کے مدنظر "عجمیت" کے خلاف اپنی آواز بلند کی تھی اور آپ ایرانی آرٹ کے صحیح پہلو کو اظہار میں لانا چاہتے تھے ۱۲ منہ

سمجھا کہ لہو ولعب میں زندگی بسر کرنا جائز ہے عمر خیام ایسے دیگر شعراء نے اس رجحان کو اور بھی ترقی دی"
(آجکل دہلی بابت اگست ۱۹۴۳ء صفحہ ۱۴)

حضرت حکیم خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی مرحوم جانشین حضرت خواجہ میر درد نقشبندی دہلوی "لال قلعہ کی ایک جھلک" میں لکھتے ہیں کہ "اورنگزیب نے حکم دے دیا تھا کسی مدرسیا مکتب میں خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ کا دیوان بطور درس کے نہ پڑھا جائے کیونکہ لڑکوں کی سمجھ اس کتاب کی باریکیوں کو نہیں پہنچ سکتی ہے اور معمولی استعداد کے استاد اُسے پڑھ بھی نہیں سکتے مگر خود بدولت "دیوانِ حافظ" کے اس قدر معتقد تھے کہ رات کو سوتے وقت گلبدن کے جزدان میں دیوان حافظ اپنے سرہانے رکھ لیا کرتے اور فرمایا کرتے تھے عجیب بابرکت کتاب ہے مجھے ہر شب اس سے بہت فائدے روحانی حاصل ہوتے ہیں"۔

خواجہ صاحب نے ۱۳۷۹ھ میں وصال فرمایا۔ جناب بشیر محمد خانصاحب ایم۔اے ایل۔ایل۔بی (علیگ) نے اپنے مضمون "اسیر گڑھ پر ایک نظر" میں لکھا ہے کہ "قلعہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر حضرت شاہ نعمان رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک ہے کہا جاتا ہے کہ آپ حضرت حافظ شیرازیؒ کے خلفِ اکبر ہیں یہ بزرگ بہت ہی باکمال اور صاحبِ کشف وکرامات گذرے ہیں جن کی تاریخ وصال ۸۱۰ھ ہے یہاں ہر سال عرس ہوتا ہے"
(عالمگیر لاہور فروری ۱۹۴۰ء صفحہ ۴۶)

میرے بزرگ سندھ کے ادیب اعظم خاں بہادر شمس العلما مرزا قلیچ بیگ صاحب سندھی حیدرآبادی اپنی تصنیف تذکرۂ شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ "خیام سندھ" میں لکھتے ہیں کہ "حافظ حقیقت کی مشعل اس طرح اتفاقاً آنکھوں کے سامنے لاتا ہے کہ جس کی ضیا سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں"۔

بہر کیف میرا مقصد صرف یہی تھا کہ حضرت علامہ اقبالؒ کی نگرِ دنظر کے ساتھ ہی خواجہ حافظؒ کے مستانہ کیفیات کی ایک تصویر پیش کر دوں تاکہ اربابِ نظر اقبالؒ و حافظؒ کے نظریات اور افادات و ارشادات اور احساسات سے یکساں مستفید و مستفیض ہوں یقیناً اسے بھی ناچیز اقبالؒ و حافظؒ کی عقیدت کا ادنےٰ نتیجہ سمجھا ہے ع

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از من بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

ہمارے ہندستانی مسلمان

ولیم ہنٹر آئی سی ایس رجنگال نے ۱۸۷۲ء میں انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام (OUR INDIAN MUSALMAN) ہے۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین پر ایک مفصل تبصرہ لکھا ہے۔ یہ تحریک ہندستان میں اسلامی حکومت کے احیاء و تجدید کی ایک آخری کوشش تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد شہیدؒ اور اُن کے رفقاء نے کس طرح مسلمانوں کو حیرت انگیز طور پر منظم کیا اور کس طرح اُن کو ایمان افروز قربانیوں کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اس جماعت نے مسلسل ۲۵ سال تک سکھوں اور انگریزوں کی حکومت کو آتش زیر پا رکھا۔ کتاب میں اسلامی تحریکات اور مسلمانوں کی ذہنیت پر خوب کھل کر تبصرہ کیا گیا ہے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ کیا تھے اور ہم کیا ہیں کتاب اُردو زبان میں پہلی مرتبہ اس ہفتہ چھپ کر آئی ہے اور ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے اپنی فرمائش جلد بھیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

حضرت شاہ ولی اللہ کا عملی کارنامہ

(از پروفیسر محمد سرور)

زندگی خواہ وہ ایک فرد کی ہو یا ایک جماعت کی، دو چیزوں سے بنتی ہے۔ ایک ذہن یا فکر، اور دوسرے خارج میں اُس ذہن یا فکر کی عملی تشکیل زندگی کا سرچشمہ دراصل انسان کے باطن سے پھوٹتا ہے اور پھر خارج میں جیسے جیسے حالات سے اُسے سابقہ پڑتا ہے ویسی ہی شکل و صورت میں وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن باطن و خارج یا فکر و عمل زندگی کے دو الگ الگ خانے نہیں، بلکہ یہ دو شعبے ہیں ایک اصل کے، اور انسانی زندگی ان دونو شعبوں کے مجموعوں کا نام ہے۔ جس طرح فرد کا ایک ذہن ہوتا ہے اور ایک اُس ذہن کا خارجی زندگی میں پرتو اُسی طرح قوموں اور ملتوں کا بھی ایک مجموعی ذہن ہوتا ہے اور ایک اُس مجموعی ذہن کی خارج میں عملی تشکیل۔

آج سے تقریباً تیرہ سو سال قبل مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی ایک مختصر سی جماعت معرض وجود میں آتی ہے۔ اس جماعت کا ایک فکر تھا اور اول روز سے اس جماعت کا اپنا نظام بھی تھا۔ مسلمانوں کی گنتی کے چند افراد کی یہ جماعت تمام مخالفتوں کے باوجود برابر آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ان کی مکہ میں سمائی نہیں ہوئی۔ تو یہ لوگ مدینہ میں ہجرت کر جاتے ہیں اور وہاں جا کر اپنی مستقل حکومت بنا لیتے ہیں۔ مدینہ کی اس حکومت پر دس سال بھی نہیں گزرتے کہ یہ سارے عربوں کو اپنے زیر نگین کر لیتی ہے اور اس کے بعد بیس سال کے اندر اندر ایران، عراق، شام اور مصر وغیرہ بھی فتح ہو جاتے ہیں۔ بے شک شروع کا یہ زمانہ ملت اسلامی کا دور زریں تھا لیکن اس

---

[1] یہ مضمون مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی تصنیف شاہ ولی اللہ اور اُن کا فلسفہ" کا مقدمہ ہے۔ تصنیف مذکور پریس میں جا چکی ہے۔

دور زریں کے بعد بھی مسلمانوں کی فتوحات کے قدم رک سکتے نہیں۔ بلکہ اُن کی سلطنت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ ایشیا کے بہت بڑے رقبے کو مسخر کرتے ہیں۔ افریقہ میں بحر احمر سے لے کر بحر ظلمات تک کے ملک اُن کے تابع ہو جاتے ہیں یورپ میں ایک طرف اسپین پر اُن کی حکومت ہوتی ہے اور دوسری طرف آبنائے باسفورس سے دی اُنا تک کے علاقے وہ فتح کر لیتے ہیں۔ کشور کشائیوں کے ان کارناموں کے ساتھ ساتھ وہ جہاں داری اور جہاں بانی میں بھی اپنی عظمت کے انمٹ نقوش تاریخ کے صفحات پر ثبت کرتے ہیں۔ وہ سیاسی ادارے بناتے ہیں۔ تدبیر مملکت کے نئے نقشے وضع کرتے ہیں۔ صنعت و حرفت اور معاشرت اور اجتماع کو ترقی دیتے ہیں۔ ادب شعر فنونِ لطیفہ اور تہذیب و تمدن کے طور طریقوں کو اپنے ذوقِ حُسن معیارِ حق و صداقت اور شعور قوت و جبروت کے مخصوص سانچوں پر ڈھالتے ہیں اور اس طرح یہ کم و بیش ایک ہزار برس تک تاریخ عالم میں انسانی قافلہ کی رہنمائی کی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کا یہ عمل اُس کے مجموعی ذہن کا خارجی پیکر ہے۔

ہمیں اس امر کے تسلیم کرنے میں انکار نہیں ہونا چاہئے کہ ملت اسلامی کا یہ خارجی پیکر سراپا "خیر" نہیں تھا اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ اچھائی کے ساتھ بُرائی کا وجود لازم و ملزوم ہے اور اتفاق سے تاریخ اگر ایک قوم کی اچھائیوں کو گناتی ہے، تو وہ اُس کی برائیوں کا ذکر کئے بغیر بھی نہیں رہتی۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی اس تاریخ میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو نہ ہوتیں تو یقیناً بہت اچھا ہوتا۔ لیکن اس تاریخ میں ایسے جواہر پاروں کی کمی نہیں جن کی تابانی جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا بڑھتی جائے گی اور نہ صرف مسلمان بلکہ دوسری قومیں بھی اُن کی تابانی سے رہتی دنیا تک اپنے ذہنوں کو جلا دیتے رہیں گے۔ ملت اسلامی کی یہ تاریخ اپنے ان زندہ جاوید کارناموں کے ساتھ ہمارے قومی اور ملی وجود کا ایک حصہ ہے اس کا ہم انکار نہیں کر سکتے اور نہ ہمیں انکار کرنا چاہئے۔ ہم اپنی

ملت کے اس دورِ ماضی کے وارث ہیں سانا کہ یہ دور بیت چکا اور اس کے واپس آنے کا اس مادی دنیا میں اب کوئی امکان نہیں۔ لیکن ایک بیتا ہوا واقعہ اپنے اثرات ضرور چھوڑ جاتا ہے اور تاریخ کے اس طرح کے اثرات قوم کے مجموعی ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ اگر کوئی قوم اپنے ماضی سے بیزار ہو کر یہ چاہے کہ وہ قومی ذہن سے اپنی گزشتہ تاریخ کے اثرات کو بالکل کھرچ ڈالے تو ایسا کرنے سے اُس قوم کا نخلِ حیات برومند ہونے کے بجائے الٹا ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔ بے شک اپنے ماضی سے اندھی عقیدت بھی بُری ہے اور اس کا انجام کچھ کم ہلاک کرنے والا نہیں ہوتا۔ اصل میں ضرورت انکار کی نہیں ہوتی اور نہ اندھی عقیدت ہی قوم کے حق میں مفید پڑتی ہے۔ البتہ ماضی کی داشت کو جانچنا پرکھنا پڑتا ہے اور قومی فکر و عمل میں اُس سے کام لینے کے لئے اُس کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ کا یہ حصہ ملت کے ذہنی وجود کا ایک خارجی منظر ہے۔ ملت کے اس خارجی منظر کی ابتدا جیسا کہ آپ نے دیکھا مکہ معظمہ کے چند گنتی کے برگزیدہ افراد سے ہوئی تھی۔ اُن کے خلوصِ نیت اور حسنِ عمل کا صلہ تھا کہ چند صدیوں بعد ان برگزیدہ افراد کے نام لیوا سات زمینوں اور سات سمندروں کے مالک بن گئے اور انہوں نے دمشق بغداد اور ادھر مشرق میں بخارا غزنی لاہور اور دہلی اور اُدھر مغرب میں قاہرہ، مراکش، قرطبہ، غرناطہ اور قسطنطنیہ کو علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کے مرکز بنا لئے۔ ملت کے ذہن و فکر کی تاریخ بھی اُس کے خارجی منظر کی سرگزشت سے کچھ کم دلچسپ اور شاندار نہیں رہی۔ اس کی ابتدا ایک ایسی تعلیم سے ہوتی ہے جس کے اساسی اصول ہر انسان کی فطرت میں ودلیعت کئے گئے اور حضرت آدم سے لے کر ہر پیغمبر اور مصلح نے اسی تعلیم کی طرف اپنے اپنے زمانے میں لوگوں کو دعوت دی تھی۔ یہ تعلیم انسانیت کی طرح ابدی اور عالمگیر ہے۔ یہ کسی قوم یا ملک تک محدود نہیں۔ اس تعلیم کا دینے والا

خود کائنات کا پیدا کرنے والا اور تمام انسانوں کا رب تھا۔ چنانچہ ملت اسلامیہ کے ذہن و فکر کا سب سے پہلا اساس قرآن کریم کی یہ الٰہی تعلیم بنتی ہے۔ یہ الٰہی تعلیم رحمۃ اللعالمین حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملت اسلامی کو دی گئی۔ لیکن آپؐ نے اس تعلیم کے ابلاغ تک اکتفا نہ کیا۔ بلکہ جو لوگ آپؐ پر ایمان لاکر آپؐ کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے آپؐ نے اُن کا تزکیہ فرمایا۔ اُن کے اخلاق و عادات کو سنوارا اور انہیں ایک جماعتی نظام میں پرو دیا۔ صحابہ کی اس جماعت کے لئے قرآن کی تعلیمات مشعل راہ اور آپ کا اسوۂ حسنہ یعنی سنت نمونہ بنی۔ ان بزرگوں کی زندگیاں آپ کی رُشد و ہدایت کے رنگ میں اس طرح رنگی گئیں کہ بعد میں ملت کے لئے اُن کا اُسوہ بھی قابل تقلید بن گیا۔

ملت اسلامی کی فکری و ذہنی زندگی کا یہ نقطۂ آغاز ہے۔ اس کے بعد جب اسلامی سلطنت کی حدیں وسیع ہوئیں اور نئے نئے ملک اور نئی نئی قومیں دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگیں تو مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نئے نئے مسائل سے سابقہ پڑا۔ یہاں سے اجتہاد کا باب شروع ہوتا ہے۔ اجتہاد کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کے بارے میں قرآن اور سنت میں کوئی تصریح موجود نہ ہو تو اُس وقت قرآن اور سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کے متعلق شریعت کا حکم ڈھونڈا جائے۔ اب جو ملت کی زندگی وسیع ہوئی اور سندھ سے لے کر قرطبہ تک مسلمانوں کی سلطنت پھیل گئی تو اس کے لئے نئے نئے قوانین بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اس طرح فقہ کی تدوین ہوئی اور آگے چل کر فقہ کے مختلف مذاہب بنے اور ان فقہی مذاہب نے اپنے اپنے علاقوں کے لئے تفصیلی احکام نافذ کئے۔

قرآن حدیث اور فقہ کے بعد مسلمانوں میں اور اور علوم بھی رائج ہوتے گئے اور خود قرآن حدیث اور فقہ کی تفسیر، تعبیر اور تشریح میں بھی نت نئے شعبے بنتے چلے گئے۔ قرآن کی مختلف

تفسیریں لکھی گئیں۔ حدیث کی روایات کے مجموعے مرتب ہوئے اور فقہ میں اور توسیع کی گئی قرآن حدیث اور فقہ کے ضمن میں مسلمانوں نے جو کچھ لکھا ہے اور ان علوم میں جس قدر تحقیق کی ہے اور اُن کی حدود کو انہوں نے جتنا وسیع کر دیا ہے آج اُن کا احاطہ کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ ان علوم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں عقلی علوم کو بھی بڑا فروغ حاصل ہوا عقلی علوم کی ابتدا یونانی زبان سے عربی میں جو ترجمے ہوئے تھے اُن سے ہوئی۔ عہد عباسیہ میں فلسفہ ومنطق اور طبیعیات وریاضیات کے علوم یونانی سے عربی میں منتقل کئے گئے۔ نیز ایران اور ہندوستان کے علوم کو بھی مسلمانوں نے اپنا لیا۔ شروع شروع میں تو زیادہ تر نقل و ترجمہ کا زور رہا۔ لیکن جب طبیعتوں کا فلسفہ ومنطق کی طرف میلان ہوتا گیا۔ اور لوگ عقلیات میں بحث وتحقیق سے کام لینے لگے تو یونانی فلسفہ بتدریج اسلامی فلسفہ بنتا چلا گیا۔ اس زمانے میں علم تصوف کی بھی تدوین ہوئی۔ صوفیا حکمت اور دین کو تصوف کے ضمن میں جمع کرتے تھے۔ یہ بیشتر اہل حال "بزرگ ہوتے۔ لیکن ان کے نزدیک "حال" کے لئے ضروری تھا کہ سالک شریعت اور حکمت میں بھی بہرہ کامل رکھتا ہو۔ وجدانی قوتوں کی اصلاح اور اُن کا تزکیہ کرکے قلب ونظر اور فکر و عمل میں اسلام کی صحیح روح کو رچانا تصوف کے پیش نظر تھا۔ بر ہان اور استدلال سے اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے علم کلام کی طرح ڈالی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کا اصل اصول تو صرف قرآن اور سنت تھا لیکن جس طرح قرآن کو سمجھنے کے لئے تفسیریں لکھی گئیں اور سنت کی توضیح اور تشریح کے لئے ایک مستقل علم وجود میں آیا اسی طرح قرآن اور سنت کے احکام و مقاصد کو ذہن نشین کرانے اور اُن کی حقانیت اور افادیت کو دلوں اور عقلوں سے منواتے اور اُن پر عمل کرانے کے لئے تصوف، کلام اور فقہ کے علوم کا رواج ہوا۔ مانا کہ تصوف کے سلسلے میں بڑی بے راہ رویاں

ہوئیں اور اکثر متکلمین بے کار کی بحث واستدلال میں حد سے بڑھ گئے اور اس طرح علمائے فقہ نے بھی خواہ مخواہ موشگافیوں اور باہمی نزاعات سے اسلام کے احکام کے اس علم کو وبال جان بنا دیا، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ تصوف، فقہ و کلام سرتاسر بے کار تھے اور ملتِ اسلامی کی فکری تاریخ سے انہیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا ضروری ہے، ٹھیک نہیں۔ آخر قرآن کی تفسیر میں بھی مفسروں سے غلطیاں نہیں ہوئیں اور علم تفسیر میں کار آمد باتوں کے ساتھ ساتھ رطب و یابس روایات کا ایک طومار جمع نہیں ہو گیا اور اس طرح صحیح احادیث کے علاوہ موضوع حدیثوں کا ہمارے ہاں انبار موجود نہیں۔ تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں صحیح اور غیر صحیح روایات کی یہ گڈمڈ دیکھ کر اگر ہم تفسیر اور حدیث کا کلیتہً انکار کر دیں، جس طرح بعض اہل تصوف و کلام و فقہ کی بے راہ رویوں کی بنا پر ہم ان علوم کو غیر اسلامی قرار دے کر ملت کی تاریخ سے خارج کرنے کا فتویٰ دیتے ہیں، تو یہ کسی لحاظ سے بھی مناسب نہیں ہے۔ اس طرح کا انکار کبھی خوش آئند نہیں ہو سکتا اور کوئی قوم اپنی ماضی کا انکار کر کے سرسبز نہیں ہو سکتی۔ صدیوں کے علمی و فکری تجربات سے جن میں اگر ہم نے کبھی ٹھوکریں کھائی ہیں تو یقیناً اس جدوجہد میں اکثر راہِ صواب تک بھی ضرور پہنچے ہیں، اس طرح منہ موڑ لینا قومی ذہن کو مفلس اور ملی نظر و فکر کو سطحی بنا دیتا ہے۔

مسلمانوں کا دورِ اقبال تھا اور اُن کی فکر و عمل کی صلاحیتوں میں زندگی اور توانائی تھی، تو انہوں نے خود سے نئے نئے علوم و فنون کی تخلیق کی اور دوسروں کے علوم کو بھی حاصل کیا اور انہیں چھانٹا پھٹکا۔ اُن کی غلطیوں کی اصلاح کی اور ان علوم کو اپنا بنا کر ساری دنیا میں ان کی اشاعت کی۔ عہدِ اقبال کے بعد جب اُن میں زوال شروع ہوا تو ابتدا میں اُن کی بہت بڑی اکثریت کو تو زوال کا احساس ہی نہ تھا۔ وہ مدتوں زوال کے دھارے پر بے اختیار بہا کئے لیکن ایک

گروہ کو جو گو تعداد میں بہت کم تھا، ملت کی پستی کا احساس ہوا اور اُس نے پستی کی اس رو کو تھامنے کی کوشش کی۔ اس گروہ میں بڑے بڑے کامل اور بزرگ پیدا ہوئے اور انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے بڑی کوششیں کیں۔ اصلاح کی یہ جدوجہد اب تک جاری ہے مصلحین کا یہ گروہ برابر اسی دھن میں لگا ہوا ہے کہ مسلمان کسی طرح زوال کے نرغے سے نکل کر پھر سے ترقی اور اقبال کے راستہ پر چلنے کے قابل ہو جائیں۔

ملت کی اصلاح و تجدید کا آج ہر مسلمان کو احساس ہے اور ہر طرف سے اُس کے لئے آوازیں بھی اُٹھ رہی ہیں۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اصلاح و تجدید کے لئے کون سا طریق عمل اختیار کیا جائے۔ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ عمل کی عمارت ہمیشہ فکر کی بنیاد پر ہی اُٹھتی ہے اور اصلاحی و تجدیدی کاموں کو شروع کرنے سے پہلے ذہن و فکر کی الجھنوں کو سلجھانا پڑتا ہے اور جس نہج پر کام کرنا ہو، اُس کا تعین ضروری ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں کے اصلاح و تجدید کے علمبرداروں کا ایک گروہ تو ان دنوں یہ کہتا سنا جاتا ہے کہ اگر مسلمان موجودہ پستی سے ابھرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی ماضی سے یکسر کنارہ کش ہو جانا چاہیئے وہ اپنے دماغوں سے عہد ماضی کی یاد بالکل نکال دیں۔ وہ بھول جائیں کہ اُن کی کوئی ملی تاریخ ہے اس گروہ کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں خالی الذہن ہو کر اور اپنے صفحہ دماغ کو سلیٹ کی طرح دھو کر نئے دلنے نئے حالات، اور نئے افکار و علوم میں جذب ہو جانا چاہیئے، ان کے علاوہ اصلاح و تجدید کے علمبرداروں کا ایک دوسرا گروہ ہے۔ وہ فوز و فلاح کی راہ یہ تجویز کرتا ہے کہ ہم ایک "الٹی زقند" لگا کر وہاں پہنچ جائیں جہاں ہم تیرہ سو سال پہلے تھے۔ وہی سادہ زندگی ہو۔ ایسی زندگی جس میں نہ علم کلام تھا اور نہ بقول اُن کے تصوف تھا، نہ فقہ تھی اور نہ اُن کے خیال میں حدیث کا وجود تھا ہمارے یہ بزرگ ملی تاریخ میں سے تیرہ سو سال کے اس طول طویل عہد اور اُس کے کارناموں

کو جو اُن کے نزدیک سرتاپا ناکامیاں ہیں حذف کرنا چاہتے ہیں، علم حدیث کو زائد از ضرورت سمجھتے ہیں اور تفسیروں کے منکر ہیں۔

اصلاح و تجدید کے اس آخر الذکر گروہ کی یہ دعوت بڑی دلکش ہے اور اس کی دلکشی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دعوت میں روحانیت زیادہ ہے اور واقفیت کم اور انسان بالطبع روحانیت پسند واقع ہوا ہے۔ ہمارے یہ بزرگ اس دعوت کو دیتے وقت دو چیزوں کو بھول جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ زمانہ کبھی "الٹی زقند" نہیں لگایا کرتا۔ وہ برابر آگے کی طرف قدم اٹھاتا ہے اور جو اسے پیچھے چلنے کو کہے تو زمانہ اُسے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسری چیز جس کو وہ اس سلسلے میں فراموش کر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہر فکر کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور ہر اجتماع کا ایک تسلسل۔ ایک فکر کو اُس کی تاریخ سے بے تعلق کر دو۔ تو وہ فکر مجذوب کی بڑ بن جاتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی اور اجتماع کی زندگی ایک تسلسل چاہتی ہے ایک دور پر جب دوسرے دور کا رد الگتا ہے تو دوسرا رد الگانے والوں کو ہمیشہ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ پہلے دور کی کونسی بنیادی خصوصیتیں اور اساسی رجحان ہیں جن کو اپنائے بغیر دوسرے دور کی عمارت کبھی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ محض زورِ فکر سے سر بفلک محل صرف خلا ہی میں بن سکتے ہیں، اس دنیا میں مکان بنانے کے لئے تو زمین ہی سے، اور وہ بھی زمین کے نیچے سے آثار اٹھانے پڑتے ہیں۔

مسلمانوں کی ذہنی و فکری زندگی میں اصلاح و تجدید کی ضرورت کا شاید ہی آج کوئی ذی شعور مسلمان انکار کر سکے۔ ہماری تفسیروں، احادیث کے مجموعوں، فقہ کے اجتہادات ہمارے علم کلام اور تصوف میں بہت کچھ ہے جن پر آج نظر ثانی کرنی چاہیئے، ضرورت ہے کہ ان علوم میں تحقیق کی جائے اور ان پر کڑی تنقید ہو تاکہ اُن کا صالح عنصر بے کار حصے سے الگ ہو جائے اور ہم صالح حصے کو آج اپنا سکیں اور بے کار حصے کو رد کر دیں۔ بے شک تحقیق و تنقید کی اس

سنگلاخ راہ سے بچنے کے لئے آسان صورت یہ ہے کہ تفسیر حدیث، کلام، فقہ اور تصوف کا سرے سے انکار ہی کر دیا جائے اور بدقسمتی سے ہمارے بعض "مجددین" کا عام رجحان بھی اسی طرف ہے، کیونکہ ان علوم میں صحیح نظر پیدا کرنا، اور اُن میں محقق ہونا بڑی جان کا ہی کا کام ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا رکھنا چاہیئے کہ اس طرح کی "تجدید" قوم کو بڑا اُتھلا بنائے گی اور اس سے نہ تو قومی تخیل میں وسعت پیدا ہو سکے گی اور نہ عمق۔ مناسب اور معقول یہ ہے کہ قرآن اور سنت کو سمجھنے، سمجھانے اور اُن کے مقاصد و مطالب کو ملت اسلامیہ کے ذہن نشین کرنے اور اُن کو ملی فکر و عمل میں ڈھالنے کے سلسلے میں ہماری تاریخ میں اب تک جو علمی کوششیں ہو چکی ہیں، اُن کا پورا احاطہ کیا جائے۔ ان کے کھرے اور کھوٹے حصے کو پرکھا جائے۔ فقہ اسلامی اب تک جن ادوار سے گزر چکی ہے اور خاص حالات اور مخصوص اسباب نے اس فقہ کو جیسے جیسے قالبوں میں ڈھالا تھا اور مسلمان قانون سازوں نے شرعی احکام کی تشکیل میں جن مصالح کو پیش نظر رکھا تھا، اُن کا جائزہ لیا جائے۔ احادیث کی جمع و تدوین میں مختلف محدثین کا کیا مسلک تھا اور احادیث کے مجموعوں میں کون سی کتاب اقرب الی الصواب ہے اور ہم کس نظر سے احادیث کو جانچ پرکھ کر آج اس زمانے میں ملت کے لئے اُن کو اُسوہ عمل بنا سکتے ہیں، اس کا تعین کیا جائے۔ پھر قرآن کے حقائق و مطالب کی کنہہ تک پہنچنے کے لئے ہمارے مفسرین اب تک کیا کیا کوششیں کر چکے ہیں اُن کا پورا احصار کر کے قرآنی تعلیمات کو سمجھا جائے۔ اس کے بعد تصوف اور علم کلام آتے ہیں۔ علم کی ان دو شقوں میں مسلمان صوفیا اور متکلمین نے حکمت و معرفت کا ایک لازوال ذخیرہ چھوڑا ہے جس سے انسانی ذہن بڑا فیضان حاصل کر سکتا ہے۔ تصوف و اسلام کے اس اثاثے کو بھی تحقیق و تنقید کی نظر سے دیکھنے اور اُس کو پرکھنے کی ضرورت ہے۔

تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور کلام کے ضمن میں اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اُس

کی مثال ایک بحر بیکراں کی سمجھئے اور آج جب کہ ان علوم کا شوق بہت کم ہو گیا ہے۔ علوم کی ان پہنائیوں کو سمیٹنا اور پھر اُن کی تحقیق و تنقید کر کے اُس کے صالح حصے کو غیر صالح سے الگ کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ لیکن اسے ہندوستانی مسلمانوں کی خوش قسمتی کہئے اور اس سرزمین میں اسلام کے روشن مستقبل کے لئے اسے ایک نیک فال سمجھئے کہ آج سے دو سو سال قبل اسلامی ہندوستان کے پایہ تخت اور اُس کے علم و حکمت کے مرکز شہر دہلی میں حضرت امام ولی اللہ پیدا ہوتے ہیں۔ آپ نے تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور کلام کے بے پایاں علوم و معارف کا نہ صرف احاطہ کیا، بلکہ ملت اسلامیہ کی تمام علمی فکری اور سیاسی تحریکوں کے تاریخی ادوار کا جائزہ بھی لیا اور اُن کی پوری تحقیق کی اور اُن کو اچھی طرح چھانا پھٹکا اور آخر میں آنے والی نسلوں کے لئے تفسیر حدیث فقہ، تصوف اور کلام کے علوم و فنون کا جو لب لباب اور حاصل متاع تھا، اُسے اپنی تصنیفات میں مرتب فرما دیا

حضرت امام ولی اللہ محض پہلوں کے علوم کے ناقد، جامع اور محافظ نہ تھے وہ خود بہت بڑے مفسر تھے۔ ایک بلند نظر محدث تھے۔ فقہ میں مجتہد تھے، اور تصوف میں ایک کامل عارف اور علم کلام میں ایک محقق فلسفی اور حکیم۔

مولینا عبید اللہ صاحب سندھی نے امام ولی اللہ کی علوم شرعی میں تحقیق و تنقید، نیز اُن کی عام حکمت معرفت اور ملت اسلامیہ کی اصلاح و تجدید کے سلسلہ میں اُن کے جو افکار و نظریات تھے آئندہ صفحات میں ان کا تعارف کرایا ہے امام ولی اللہ نے ملت اسلامیہ کے پہلے کے تمام علمی و فکری سرمایے کو جانچنے پرکھنے کے بعد اُس کو منقح شکل دی۔ اور اُسے ملت کی اصلاح و تجدید کا اساس بنایا۔ مولینا عبید اللہ صاحب سندھی نے اپنی ساری زندگی حضرت امام ولی اللہ کے علوم اُن کی حکمت، اور نیز اُن کی بنیادوں پر اصلاح و تجدید کی جو تحریک شروع کی گئی تھی، اُن کے مطالعہ اور تحقیق میں گزاری ہے۔ چنانچہ آج اس زمانے میں امام ولی اللہ کی حکمت کا تعارف کرانے کا حق صحیح معنوں میں اگر کسی عالم اور محقق کو ہو سکتا ہے تو وہ صرف مولینا عبید اللہ صاحب سندھی ہیں۔

ملوکیت

(جناب غلام محمد صاحب بی اے (عثمانیہ)

وجدان و عقل دو چیزیں ہیں جو ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہیں — وجدان کسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور عقل بسا اوقات اس کے تعین و تشخص میں بھٹکتی رہتی ہے۔ اس لئے ایک پر ایقان ضروری اور دوسری پر بھروسہ غلطی بلکہ بعض اوقات گناہ! وجدان نے دور حجری کے انسان کو بھی اسی طرح معبود حقیقی کا پتہ دیا تھا جیسے آج ہمیں بتلا رہا ہے لیکن یہ عقل کی کمزوری تھی جس نے اس کو کبھی تو مہ و خورشید کے آگے جھکایا کبھی ڈسنے والے سانپ یا کھیتی اُگانے والے پانی کو معبود قرار دیا اور سب سے بڑھکر کبھی خود تراشیدہ بت کے سامنے سجدہ ریز کیا۔ یعنی یہ کہ وجدان نے جس ہستی کا پتہ دیا اس کی موجودگی میں تو کسی شبہ کی گنجائش نہیں لیکن بیچاری عقل اُس کے تعین میں برسہا برس ٹھوکریں کھاتی رہی۔ یہی حال دوسری وجدانی چیزوں کا بھی ہوا — چنانچہ ہوکر نے کوئی غلطی نہ کی جب اُس نے کہا کہ "فطرت میں اُس کے علاوہ کوئی بات بذات خود ناممکن نہیں ہے کہ آدمی بغیر کسی حکومتِ عامہ کے رہے ہوں گے"[1] انسان ایک معاشری حیوان ہے اس لئے نہ صرف باہمی ہمدردی اور میل ملاپ بلکہ مرکزیت بھی اس کے لئے ایک فطری اور وجدانی چیز ہے یہی مرکزیت اور باہمی ربط کے ساتھ آزادی کا قیام ہے جو اُسے اشرف المخلوقات بناتا ہے ورنہ منفرد آزادی تو ہر جانور میں بھی پائی جاتی ہے — جب وجدان نے مرکزیت کا اشارہ کیا تو

---

[1] تاریخ سیاسیات از فریڈرک پولک صفحہ ۱۱۵ (ترجمہ جامعہ عثمانیہ)

عہد قدیم کی انسانی عقل نے اس کا ایک نظام پیش کیا جو ظاہر ہے کہ ناقص تھا، غیر فطری تھا۔ پس ملوکیت کیا ہے؟ عقل انسانی کی طفولیت کا تراشیدہ نظام سیاست! اگر نظام سیاست وجدانی ہوتا تو آج بھی قابل تسلیم ہوتا لیکن چونکہ عقل انسانی کا تراشیدہ ہے اور اب عقل بہت ترقی کر چکی ہے اس لئے موجودہ دور میں اس کی اتباع غلطی بلکہ گناہ ہے!

ملوکیت کے روپ | مرور زمانہ کے ساتھ ملوکیت نے کئی چولے بدلے، عام طور پر سیاستدانوں نے اسے دو روپ میں پایا۔ ایک شکل وہ کہ جس میں مقننہ، عاملہ اور عدلیہ کے اعلیٰ ترین اختیارات بادشاہ کی ذات میں مرکوز رہتے ہیں اور بادشاہ عام قوانین سے بالاتر متصور ہوتا ہے، اسی کو اصطلاحاً بادشاہت مطلقہ (ABSOLUTE MONARCH) کہا گیا۔ اس کی مثالوں سے ابتدائی تاریخ عالم بھری پڑی ہے۔ رہا ملوکیت کا دوسرا بھیس جیسے دستوری یا محدود ملوکیت (CONSTITUTIONAL OR LIMITED MONARCHY:) کہا جاتا ہے، اس میں بادشاہ آزاد نہیں بلکہ دستور کی بنا پر چند محدود اختیارات کا حامل ہوتا ہے اس کی بہترین مثال انگلستان ہے۔ لیکن اس کے ظاہری بھیس سے دھوکا نہ کھا کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دستوری بادشاہت ایک لفظی مغالطہ ہے۔ دراصل اس کے تحت اگر ابتداءً نہ سہی، تو کچھ عرصہ بعد بادشاہ محض ایک نمائشی عنصر رہ جاتا ہے۔ اس کے اختیارات اتنے محدود ہو جاتے ہیں کہ بعض دفعہ وہ اپنے خانگی امور میں بھی آزادیٔ عمل سے عاجز رہتا ہے۔ حقیقتاً وہ ایک پتلا ہوتا ہے جو مقتدر جماعت کے اشاروں پر رقص کرتا ہے ——— حالیہ تاریخ ان حقائق کی بہترین توضیح کرتی ہے۔

ملوکیت کبھی انتخابی رنگ میں بھی دکھائی دیتی ہے جسے انتخابی ملوکیت (ELECTIVE MONARCHY.) کہا جاتا ہے۔ اس میں بادشاہ مطلق العنان ضرور ہوتا ہے لیکن توریث پائی

نہیں جاتی، روما کی ابتدائی تاریخ اسی طرز کا پتہ دیتی ہے۔

شخصیت پرستی کا اثر عجیب گل کھلاتا ہے، یہ جادو جب کسی کے سر چڑھتا ہے تو پھر ساحر کی ہر ادا اس کے لئے باعثِ تقلید بن جاتی ہے۔ کون ساحر ہے جو اپنے اس سحر سے فائدہ نہ اٹھائے ——— گو ابتداءً انتخابی ملوکیت رہی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد راعی کی مطلق العنانی اور رعایا کی غیر فطری فرمانبرداری نے انتخاب کا حق بھی بادشاہ ہی کو سونپا ——— اپنے نورِ چشم سے بڑھکر انسان کو کون عزیز ہو سکتا ہے ——— بادشاہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اسی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اب کیا تھا "مطلق العنانی" کے ساتھ "توریث" بھی شروع ہوئی۔ اسی کو اصطلاح میں موروثی بادشاہت (HEREDITARY MONARCHY) کہا جانے لگا ——— توریث چاہے کسی جگہ اور کتنے ہی مقدس روپ میں کیوں نہ ہو ہمیشہ قابل ملامت رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملوکیت کی تمام قسموں میں بدترین شکل یہی ہے جس کی توضیح آئندہ دلائل سے ہوگی۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ تاریخ عالم میں اسی کی فسوں کاری زیادہ نظر آتی ہے۔ انتخابی یا دستوری ملوکیت کی صرف چند مثالیں ملتی ہیں لیکن اس کی طویل داستانوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ہمیں زیادہ تر اسی طرزِ حکمرانی کے حسن و قبح پر نظر ڈالنی ہے۔

ملوکیت کا ظاہر و باطن | بعض قدیم مفکرین کا خیال تھا کہ موروثی بادشاہت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ "ولی عہد" کی تعلیم و تربیت ایک اعلیٰ ترین ماحول میں ہوتی ہے، جو اس کی آئندہ کامیابی کی ضامن ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک مغالطہ ہے۔ کم از کم آج کی دنیا میں وہ شخص کبھی بھی کامیابی کے ساتھ منصبِ قیادت پر فائز نہیں رہ سکتا جس کی تربیت ایک اچھوت فضا میں ہوئی ہو جسے دنیا اور دنیا والوں سے کوئی رابطہ نہ رہا ہو۔ خصوصاً سیاسیات میں نظریئے کچھ اور ہوتے ہیں اور عمل کچھ اور ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ پھر سیاسی و معاشی مسائل اس قدر ملے جلے ہوتے ہیں کہ قطعیت کے ساتھ یہ بتایا نہیں

جا سکتا کہ فلاں مسئلہ خالص سیاسی یا محض معاشی ہے۔ معاشیات سے متعلق پروفیسر مارشل اس شخص کو "گدھا" سمجھتا ہے جو محض نظری دنیا میں رہ کر خود کو علم معاشیات کا عالم سمجھے[1] ــــ مگر یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں، پہلے یہ تو دیکھئے کہ دراصل تعلیم کچھ ہوتی بھی ہے؟ شاہ پرستی یا شہزادہ پرستی دو جدا چیزیں تو ہیں نہیں پھر علم کے تلخ حقائق بتلا کر استاد اپنے شاگرد کو رنجیدہ کیونکر کرے۔ اُسے تو شہزادے کے مزاج کا پاس رہتا ہے۔ لہذا تعلیم بھی اُسی کے حسب منشاء ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے اکثر بادشاہ عملاً حسب بالا قدیم نظریئے کے خلاف ہی پائے گئے۔

سحرِ ملوکیت کے گھائل توریث کو نعمت سمجھتے ہیں، دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اس سے تسلسل قائم رہتا ہے اور سلطنت میں ہیجان و بدامنی پیدا ہونے کا خدشہ باقی نہیں رہتا ــــ حقیقتاً یہ بھی ایک زبردست دھوکا ہے۔ توریث کی وجہ سے عوام کی سیاسی دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ادہر بادشاہ زعمِ باطل میں اپنے فرائض منصبی سے غافل، لہو و لعب میں مشغول ہو جاتا ہے، اس طرح ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ یہی مقام ہے جہاں کہا جا سکتا ہے کہ "العوام کا الانعام" ہو جاتے ہیں۔ ان کی کیفیت ایک بھیڑ کے غول کی سی ہو جاتی ہے کہ ہانکنے والا چاہے کدھر ہی لے جائے اور کتنا ہی ناتجربہ کار کیوں نہ ہو اُسی کو وہ اپنا رہبر سمجھتے اور اُس کے اشاروں پر چلتے ہیں ــــ یہ سب توریث ہی کے برگ و بار ہیں!

علاوہ ان دو خوبیوں کے ہابز نے بھی حسب ذیل چار خوبیاں بیان کی ہیں:-

"(۱) ایک بادشاہ کا ذاتی مفاد رعایا کے مفاد سے زیادہ وابستہ ہوتا ہے، بہ نسبت اس کے جتنا کسی مقتدر جماعت کے افراد کا ذاتی مفاد ہو سکتا ہے۔"

"(۲) اسمبلی کی بہ نسبت بادشاہ ہر جگہ سے زیادہ آزادی کے ساتھ رائے حاصل کر سکتا

---

[1] ملاحظہ ہو مارشل کی کتاب۔ (PRINCIPLES OF ECONOMICS)

اور راز میں رکھ سکتا ہے۔

"(۳) جہاں بادشاہ کے فیصلوں یا ارادوں میں محض انسانی فطرت کی تلون مزاجی کو دخل ہے تو دوسری طرف اسمبلی کی تلون مزاجی اس کے افراد کے اختلاف کی بنا پر رونما ہوتی ہے۔

"(۴) بادشاہ حسد یا مفادِ ذاتی کے خیال سے اپنے ضمیر کے خلاف نہیں کر سکتا۔ برعکس اس کے اسمبلی میں اس کا امکان ہے، اور یہ چیز اس نوبت تک پہنچ سکتی ہے کہ خانہ جنگی پیدا کر دے۔"

کتنی فاش غلطی! سب سے پہلی بات اور غالباً سب سے زیادہ نادر! ایک دفعہ بادشاہت کا سحر چل جاتا ہے تو عوام کی ذہنیت وہی ہو جاتی ہے جس کا شکار خود ہابز ہوا۔ اپنی ساکھ سے بیجا فائدہ جتنا بادشاہ اٹھا سکتا ہے، شاید ہی کوئی اور معتبر فرد یا جماعت اٹھا سکے۔ برعکس اس کے اگر مقتدر جماعت افراد کے مفاد کو پسِ پشت ڈال دے تو عوام اس کو فوراً ختم کر دیں گے۔ کیونکہ مقتدر جماعت کا وجود محتاجِ انتخاب ہے اور انتخاب عوام کا حق۔ نیز مقتدر جماعت عوام کے آگے جواب دہ ہوتی ہے یعنی اس صورت میں گو قانونی اقتدارِ اعلیٰ (LEGAL - SOVEREIGNTY) تو مقتدر جماعت کو حاصل ہوتا ہے لیکن اس سے قوی تر اقتدار یعنی "سیاسی اقتدارِ اعلیٰ" (POLI-TICAL - SOVEVEIGNTY) عوام ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ برعکس اس کے بادشاہت کی صورت میں قانونی و سیاسی دونوں اقتدارِ اعلیٰ بادشاہ ہی کی ذات میں مرکوز ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ان خطرات سے کوسوں دور ہوتا ہے جو مقتدر جماعت کے لئے ہمیشہ عنان کا کام دیتے ہیں۔ اسی فرق کی بنا پر بادشاہ کو "مطلق العنان" کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ہابز کا یہ کہنا کہ "شاہ کا ذاتی مفاد رعایا کے مفاد سے زیادہ وابستہ ہوتا ہے بہ نسبت مقتدر جماعت کے" ایک کج فہمی پر مبنی ہے۔ اس

---

[1] ملاحظہ ہو (PRINCIPLES OF POLITICAL SCIENCE; BY R.N. GILCHSIST) (آزاد ترجمہ کیا گیا ہے)۔

معاملہ میں تو اس نے حقیقت کو بالکل اُلٹ ہی دیا۔

رہا دوسرا مسئلہ کہ بادشاہ ہر جگہ سے رائے حاصل کرسکتا اور راز میں رکھ سکتا ہے لیکن اسمبلی اتنی سدگی سے یہ کام انجام نہیں دے سکتی ایک ایسا دعویٰ ہے جو مبنی بر حقیقت نہیں۔ اسمبلی کی صورت میں آخر کون امر مانع ہوگا؟ بلکہ عملی تجربات کی بنا پر تو یہی درست ہے کہ بادشاہ جو رائے حاصل کرتا ہے یا جو معلومات فراہم کرنا چاہتا ہے وہ اتنے صحیح نہیں ہوسکتے۔ جتنی ایک اسمبلی کر سکتی ہے وجہ یہ ہے کہ بادشاہت کے تحت عوام کا رجحان ہی یہ ہو جاتا ہے کہ ہر بات بادشاہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ انہیں عموماً خوشامد مقصود ہوتی ہے نہ کہ اصلاحِ ملک! برخلاف اس کے اسمبلی جو انہی کی ایک نمائندہ جماعت ہوتی ہے وہ صحیح ترین اطلاعات حاصل کرسکتی اور صائب رائے قائم کرسکتی ہے کیونکہ اسمبلی میں ایک فرد نہیں بلکہ کئی افراد ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک کو نکتہ چینی اور گرفت کا ڈر لگا رہتا ہے ـــــ یہ تو ہوئی نظری بحث عملاً بادشاہ بہت کم رائے حاصل کرتے ہیں کیونکہ وہ خود کو سب سے زیادہ علیم و بصیر سمجھتے ہیں اسمبلی تو بلا پس و پیش دیکھے اور رائے عامہ کا خیال رکھے کام ہی نہیں کرسکتی۔

تھامس ہابز نے جو تیسری خوبی بیان کی اُسے آج کوئی عقلِ سلیم تسلیم نہیں کرسکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ مشورہ سے کام میں زیادہ سلجھاؤ پیدا ہوتا ہے بہ نسبت واحد رائے کے پھر فردِ واحد کا فیصلہ غلط ہو اور اس کو اقتدارِ اعلیٰ بھی حاصل ہو تو وہ ناقابلِ بدل ہوتا ہے اور اس کے برے اثرات سے رعایا بچ نہیں سکتی۔ برعکس اس کے اسمبلی کی صورت میں اگر افراد میں اختلاف بھی پیدا ہو جائے اور اس کی وجہ سے تعطل رونما ہو تو عوام بہ آسانی اُن افراد کو ہٹا کر ان کی جگہ بہتر افراد منتخب کرسکتے ہیں اور اس طرح حکومت کی کل بگڑنے کا احتمال نہیں رہتا۔ برخلاف اس کے بادشاہ کو جو قوانین سے بالاتر ہوتا ہے بدلا ہی نہیں جاسکتا۔

آخری بیان کردہ خوبی دراصل حسبِ بالا شک کی توضیح ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ بادشاہ

چونکہ قانونی حدود سے آزاد ہے اس لئے اس کے نزدیک سب برابر ہیں اور اس میں ضمیر کی پاسداری اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ جذبۂ شنیعہ دخل ہی نہیں پا سکتا۔ آخر بادشاہ بھی انسان ہے اور انسان بھی "مطلق العنان"! ایسی صورت میں اس کے افعال کے حسن و قبیح پر حرف گیری کون کر سکتا ہے یہی اطمینان ہے جو اُسے بعض دفعہ مفاد ذاتی کو مفاد عامہ پر مرجح باور کراتا ہے اور ضمیر کی پاسداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ برخلاف اس کے اسمبلی اگر ضمیر کو چھوڑ کر نفس پرستی کے تحت کوئی کام کرنا بھی چاہے تو عوام کا خدشہ ایک قدم آگے بڑھنے نہیں دیتا، کیونکہ وہ عوام کے آگے جواب دہ ہے ـــــ خانہ جنگی کا خطرہ جس کو ہابز نے خاص طور پر پیش کیا غلط ثابت ہو چکا ہے۔ یعنی اگر ایک اسمبلی اپنے صحیح فرائض سے باز رہے تو اُس کو بہ آسانی بدلا جا سکتا ہے۔ دراصل مقتدر جماعت کی یہی تبدیلی ہے اور عوام کا یہی سیاسی شعور ہے جس کو ہابز نقصِ امن سے تعبیر کرتا ہے۔ حالانکہ یہ سیاسی بیداری اور حیاتِ سیاسی کی علامت ہے۔ ملوکیت کے تحت یہ بیداری عوام میں پائی نہیں جاتی اور اک سیاسی جمود طاری رہتا ہے جسے ہابز "امن" قرار دیتا ہے ـــــ دراصل زاویہ نگاہ کے بدلنے سے سیاسی جمود ہابز کو "امن" دکھائی دینے لگا ورنہ یہ "امن" نہیں حاکم کی ساحری ہے۔

"خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمران کی ساحری (اقبالؔ)

نظام ملوکیت کے تحت راعی | کہا جاتا ہے کہ مطلق العنان بادشاہ بہرحال قوانینِ اخلاق اور قوانین فطرت کا پابند ہوتا ہے کیونکہ ان قوانین کی جکڑ بندیوں سے کوئی شخص نہیں نکل سکتا۔ لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی محض ایک مفروضہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایک دو نہیں اکثر راعی اخلاقی حد بندیوں سے بھی نکل گئے ـــــ وہ کیا چیز تھی جو قوانین اخلاق یا قوانین فطرت کی بھی پابندیاں اٹھوا رہی تھی؟ یہی "مطلق العنانی" جو پچھلوں کے نزدیک ایک اچھی چیز سمجھی جاتی تھی ـــــ جب بادشاہ تمام افراد سے اعلٰے وارفع ٹھیرا تو اس کے دماغ میں غرور کا پیدا ہونا ایک نفسیاتی لزوم ہے۔ ایسی صورت

میں ضمیر و نفس دو جدا چیزیں باقی نہیں رہتیں بلکہ بسا اوقات ضمیر مردہ اور نفس قوی تر ہو جاتا ہے اخلاق اور فطرت بھی چیزیں ہو جاتی ہیں — اس مطلق العنانی نے فرعون سے "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی" کہلوایا تھا، اسی تکبر کا اظہار لوئی چہاردہم کے نعرہ "مملکت میں ہی ہوں" (THE STATE is MYSELF) سے ہوتا ہے، اسی غیر فطری آزادی نے زمانۂ وکٹوریا کے "مادرآف لندن" کے افسانہائے محبت و عشرت چھوڑے ہیں اسی کی برکت سے ناصر الدین شاہ قاچار کا دربار ہر وقت "پرستان پارک" بنا رہتا تھا، اسی نے اکبر کو "الہٰ" اور اس کے خود تراشیدہ مذہب کو "دینِ الٰہی" کے روپ میں پیش کیا — غرض یہی "ملوکیت" کبھی فرعونیت، کبھی قارونیت اور نہ جانے کن کن صورتوں میں نمودار ہوتی رہی ہے — پھر ملوکیت میں "مطلق العنانی" ایک ایسا جاذب عنصر ہے کہ اس نے ہمیشہ ورثا میں قتل و خون کی ندیاں بہائی ہیں اور انسانوں سے انتہائی غیر انسانی افعال سرزد کروائے ہیں — کتنی ہی مثالیں ہیں کہ جہیں حقدار محروم اور غیر حقدار سناست بن گئے، غرض تاریخ خود شاہد ہے یہاں اشاروں سے گذر کر تفصیلات میں پڑنا ممکن نہیں —

اچھا بادشاہ ایک "اتفاق" ہے | اعتراض ہو سکتا ہے کہ اسی ملوکیت کے تحت نوشیرواں جیسے عادل، اشوک جیسے ہمدرد، یا اورنگ زیب جیسے باخبر اور فرض شناس بادشاہ بھی گذرے ہیں۔ لیکن تاریخ ملوکیت کی وسعت اور ان چند فرض شناس فرمانرواؤں کی تعداد کا مقابلہ کریں تو مجمدار کے قول سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی نظام حکمرانی کے تحت اچھے بادشاہ کا وجود ایک "اتفاق" ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نظام کے تحت دربار اکثر رنگ رلیوں اور عیش و عشرت کا اکھاڑا بنا رہتا ہے، چنانچہ اس نے اپنے دعوے کے ثبوت میں شہنشاہی روم (IMPERIAL ROME) اور ہندوستان کے دور مغلیہ کو پیش کیا ہے[1] — یہی حال ان تمام ممالک کا رہا جہاں اس قسم کی حکومت رہی ہے اور اچھے

---

[1] ملاحظہ ہو "POLITICAL Science and Government." by B.B. Majumdar صفحہ ۱۳۲

بادشاہ اگر پلے بھی گئے تو "اتفاقی" طور پر۔ اب واضح ہوا کہ محض "امر اتفاقی" پر بھروسہ کرنا خصوصاً جہاں کروڑہا نفوس کی فلاح کا سوال ہو کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

نظامِ ملوکیت کے تحت رعایا انسان خود کو قانونی بندشوں میں کیوں پھانستا ہے؟ سسرو نے سچ کہا کہ "ہم قانون کے غلام ہیں تاکہ آزاد رہیں"۔ سیاسی مفہوم کی تشریح جان لاک کے اس جملہ سے بھی ہوتی ہے کہ "انسانوں نے حکومت کو اپنی زندگی پر مطلقاً حاوی ہونے کے لئے نہیں قائم کیا بلکہ اپنی زندگی، آزادی اور جائداد کی باہمی حفاظت کے لئے"۔ اسی لئے وہ اس بات کا بھی مدعی ہے اور اپنے دعوے میں درست کہ قانون ساز کے اختیارات خود مختارانہ نہیں — چونکہ یہ محض مقاصد کے لئے ایک سپرد کی ہوئی قوت ہے، اس لئے غلط استعمال سے سلب ہو سکتی ہے[۱] — لیکن کیا ملوکیت کے تحت ایسا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے؟ نہیں — بادشاہ کی ذات عوام پر اس قدر حاوی ہو جاتی ہے کہ ان کا شعورِ سیاسی ختم ہو جاتا ہے۔

"جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری" (اقبالؒ)

شخصیت پرستی کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ صحیح و غلط "خوب" اور "ناخوب" کی کسوٹی بھی رضا ہی کو قرار دیا جاتا ہے چنانچہ ہابز نے اسی کی ترجمانی کی ہے، اس کا خیال تھا کہ مقتدرِ اعلیٰ جو دولتِ عامہ کا گویا جسم ہوتا ہے اس فیصلہ کا مجاز ہوگا کہ کونسی بات عقل کے مطابق اور کونسی مخالف ہے[۲]۔ جب عوام کی ذہنیت کا یہ حال ہو تو مقتدرِ اعلیٰ کا اپنے اقتدار سے جائز و ناجائز فائدہ اٹھانا کونسے تعجب کی بات ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو شخص بادشاہ کا منظورِ نظر ہو وہی "متمدن" اور تمام خصائلِ حسنہ کا حامل سمجھا جاتا ہے اور دوسرا شخص خواہ حقیقی معنی میں

[۱] [۲] ملاحظہ ہو "تاریخِ سیاسیات" از فریڈرک پولک۔

کتنا ہی متمدن کیوں نہ ہو معاشرہ میں وہ مقام حاصل نہیں کرسکتا جس کا وہ حقدار ہے۔ یہ چیز خود حکومت کی خرابی پر دلالت کرتی ہے۔ ارسطو نے کتنی سچی بات کہی ہے: "ایک بگڑی ہوئی حکومت میں اچھا آدمی بڑا متمدن خیال کیا جاتا ہے لیکن معقول اور بہتر حکومت میں اچھا آدمی اور اچھا متمدن مترادف الفاظ ہیں"[۱] غرض قوم میں اخلاقی پستی پیدا ہو جاتی ہے، کردار مستحکم نہیں رہتا، اور جب ان صفاتِ عالیہ کا فقدان ہو تو قوم کا تنزل پذیر ہو جانا ضروری ہے۔ قوموں کے حیات و ممات کے نباض موسیو لیبان نے اس کی ان الفاظ میں تصدیق کی ہے: "قومی زندگی کی بنیاد صرف اخلاق ہی کے ستون پر قائم ہے عقل و دماغ کا اس میں بہت کم حصہ ہے۔ رومن قوم اپنے تنزل و انحطاط کے زمانہ میں عقلی حیثیت سے اپنے آباؤ اجداد کی بہ نسبت زیادہ طاقتور تھی تاہم چونکہ اپنی آبائی وراثت یعنی اقدام، عزم، شجاعت، جانبازی۔ غرض ان تمام اخلاق کو جن کے ذریعہ سے ان کے آباؤ اجداد نے ترقی کی تھی، کھو چکی تھی اس لئے بالآخر تنزل کے غار میں گر پڑی"[۲] یہی حال ملوکیت کے تحت رعایا کا ہوتا ہے اور اسی طرح قوم کا صحیح اخلاق جاتا رہتا ہے افراد میں غلط تقلید، خوشامد، حرصِ جاہ جیسی غلط صفات پرورش پانے لگتی ہیں اور جہدِ مسلسل سے کنارہ کشی پیدا ہونے لگتی ہے جس کو "ابلہ" "امن" سمجھتا ہے۔

گمان ہو سکتا ہے کہ ان نقائص کے باوجود ملوکیت صدہا برس کیونکر قائم رہتی ہے اور اس میں ایسا کیا جادو ہوتا ہے کہ "شعور" کو قریب آنے ہی نہیں دیتا؟ اس شبہ کے ازالہ کے لئے انسانی زندگی کے موثرات اور ان کے استحکام پر غور کرنا ضروری ہے ——— موسیو لیبان نے انسان کی عملی زندگی کے موثرات کی تین قسمیں بتلائی ہیں:-

---

[۱] ملاحظہ ہو "تاریخ سیاسیات" از فریڈرک پولک۔

[۲] انقلاب الامم از موسیو لیبان (ترجمہ عبدالسلام ندوی)

(۱) آبا و اجداد یعنی گزشتہ سلسلۂ خاندان کا اثر جو تمام اسباب سے قوی ہوتا ہے۔

(۲) ماں باپ کا اثر۔

(۳) ملک کے جغرافیائی حدود، آب و ہوا اور گرد و پیش کی چیزوں کا اثر۔[1]

فاضل مصنف نے آخر الذکر موثرات کو بہت ہی کم اثر بتایا ہے۔ سب سے قوی الاثر پہلے موثرات ہیں اور پھر ماں باپ کا اثر ہے ——— غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہی موثرات ملوکیت کے نقائص کو محاسن کی شکل میں ایک پود سے دوسری پود میں منتقل کرتے رہتے ہیں اور اس طرح اُس کی بقا کا باعث بنتے ہیں ——— بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے ہوتے ان کے اثرات اور قوی تر ہوتے جاتے ہیں، چنانچہ غائر مطالعہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ شاعر، فلسفی حتیٰ کہ مذہبی علماء تک اس کے اثر سے بچ نہیں سکے ہیں۔ چنانچہ اکثر شاعروں کا شغل ہی یہ ہو جاتا ہے کہ قصیدہ گوئی و مدح سرائی میں انتہائی ادبی شان دکھلائیں اور کمال مبالغہ سے کام لیں چاہیئے اس میں مذہبی اعتقادات ہی کے خلاف کیوں نہ لکھنا پڑے۔ مثلاً ظہیر فاریابی کا وہ شعر کافی ہے کہ

نہ کرسیٔ فلک نہد اندیشہ زیر پا
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں زند

ان موثرات کے گہرے نفوذ کا اس سے اندازہ لگائیے کہ سعدیؒ جیسا محتاط اور مذہبی شخص اپنے بادشاہ کی مدح سرائی سے بچ نہ سکا در آں حالیکہ بادشاہت تعلیماتِ اسلام کے عین منافی تھی اور بادشاہ بھی کوئی نوشیرواں نہیں بلکہ اتابک ابوبکر بن سعد زنگی تھا! سعدیؒ نے ناز کیا ہے۔

"سزد گر بدورش بنازم چناں
کہ سیدؐ بدوران نوشیرواں"[2]

---

[1] انقلاب الامم از موسیو لیبان (ترجمہ عبد السلام ندوی) [2] دیباچہ بوستان از سعدیؒ شیرازی

شاعری سے ہٹ کر فلسفہ پر غور کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ اس نظامِ سیاسی کی برکت سے فلسفہ بجائے "حقیقت کبریٰ" (FINAL TRUTH.) ہونے کے بادشاہ کو خوش کرنے کا ایک آلہ بن جاتا ہے، کہیں بادشاہ کو خدا کا اوتار بنایا جاتا ہے، کہیں "ظل اللہ" کا فلسفہ تراشا جاتا ہے اور کہیں ان سب سے بڑھ کر اُس کو خدا ہی بنا دیا جاتا ہے ـــــــ ایک طرف بادشاہ کے وقار کو بڑھانے کی یہ کوشش ہوتی ہیں تو دوسری طرف عوام کو ذہنی غلامی میں مبتلا کرنے کے لئے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ "بادشاہ کا دیدار عبادت ہے" جہاں دیدار عبادت بن جائے تو انگشت نمائی اور نکتہ چینی کی کیا گنجائش!

ملوکیت کے تحت معاشی نظام | یہ ثابت ہو چکا کہ بادشاہ کی ذات ایک سیاسی مقتدر سے بڑھ کر مادی و روحانی پیشوا کی ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ سلطنت کے انتظام میں توازن باقی نہیں رہتا اور کیسے رہے جبکہ رائے عامہ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ حالانکہ اچھے انتظام کے لئے ہیگل کے قول کے مطابق یہ نہایت ضروری ہے کہ اصلاح رائے عامہ کے ذریعہ ہو اور خود عوام اس کا اقدام کریں ـــــــ بہرکیف اس غیر متوازن انتظام کی وجہ سے غیر متوازن معیشت بھی پیدا ہو جاتی ہے ـــــ ایک مختصر طبقہ انتہائی متمول ہو جاتا ہے اور ملک کی کثیر آبادی مفلس رہتی ہے ملکی دولت (جو غریبوں کی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے) کا بڑا حصہ بادشاہ اور اس کے حواریوں اور دیگر عہدہ داروں پر صرف ہوتا ہے اور بقیہ دولت پر کل قوم پلتی ہے اس طرح معیشت میں کچھ توازن ہی باقی نہیں رہتا، اور یہ امر محتاج بیان نہیں کہ کسی ملک یا قوم کی ہمہ جہتی ترقی کا دار و مدار اس ملک یا قوم کی متوازن معیشت ہی پر ہوتا ہے۔ یہی غیر متوازن معیشت جب اپنے انتہا کو پہنچتی ہے تو انقلاب رونما ہوتا ہے ـــــ بہرحال ملوکیت اور سرمایہ داری کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اور سرمایہ داری کے نقائص آج اظہر من الشمس ہیں۔ انگریزی ادیب گولڈ اسمتھ نے اپنی مشہور نظم "THE DESERTED VILLAGE" میں نظام سرمایہ داری کے متعلق بہت صحیح بات بیان کی

ہے۔اس نے بتایا کہ "جہاں دولت سمٹ سمٹا کر صرف چند افراد کا اجارہ بن جاتی ہے تو انسانیت میں زوال شروع ہوجاتا ہے" تو بہت بلیغ اور مبنی برحقیقت بات ہے جو اپنے اندر بڑے مفاہیم رکھتی ہے۔ آج جمہور علمائے معاشیات اس بات پر متفق ہیں کہ نظام سرمایہ داری انسانیت کے لئے لعنت ہے اور مساوی تقسیم دولت ازبس ضروری ہے۔ اسی کی طرف ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؒ نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔

پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا" ؎

اصول فطرت | جب صدہا برس ملوکیت کے تحت انسانیت تنزل پا چکتی ہے تو کوئی دانائے راز صاحب فہم اور صاحب عمل پیدا ہوتا ہے اور اس کی گرمی عمل سے قوم کی مردہ رگوں میں پھر آزادی کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں، پھر ایک بار قوم اپنے مقام کو پہچانتی ہے اور انقلاب پیدا ہوتا ہے — اسی انقلاب کی مختلف شکلیں پہلوی انقلاب۔ فرانسیسی انقلاب، نازی انقلاب اور روسی انقلاب وغیرہ ہیں — سچ فرمایا شاعر مشرق نے۔

خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں — توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری"

لیکن اکثر اس کے لئے برسہا برس درکار ہوتے ہیں۔ ہر انقلاب کے پیچھے کئی محرکات ہوتے ہیں اور کوئی انقلاب یہ یک وقت نہیں ہوتا بلکہ اس کا مواد صدیوں سے پکنے لگتا ہے اور وقتِ صحیح پر پھوٹ پڑتا ہے یہ اصول فطرت ہے اور دنیا کی کل یونہی چلتی رہی ہے۔

Ill fares the land, to hast'ning ills a prey
Where wealth accumulates and men decay —
Goldsmith ؎ سلہ "ساقی نامہ" بال جبریل۔

کیونکہ انسانی عقل اب بہت ترقی کر چکی ہے اور یہ تو اس کی طفولیت کا تراشیدہ نظام ہے۔ اسی وجہ سے دیگر نظامہائے سیاست میں نقائص سہی لیکن اتنے زیادہ نہیں جتنے کہ ملوکیت میں پائے جاتے ہیں۔

اس مضمون سے یہ نہ تصور کیا جائے کہ "ملوکیت" ہی قابل نفرین نظام ہے اور جمہوریت نازیت اشتراکیت یا فسطائیت سے ہر ایک یا کوئی ایک بھی بے نقص اور انسانی فلاح کا ضامن ہے ـــ راقم الحروف کے نزدیک یہ بات ایقان کی آخری حد تک پہنچ چکی ہے کہ جس طرح وجدان کے اشارہ معبودیت کے تعین و تشخص میں عقل اُس وقت تک ٹھوکریں کھاتی رہی جبتک کہ اس نے وحی الٰہی کا سہارا نہ لیا، بالکل اسی طرح جب تک اس تقاضائے وجدان کو کہ انسان مرکزیت کے تحت بلا حکومت نہیں رہ سکتا، عقل سلجھانے کی کوشش کرے گی بھٹکتی رہے گی، ناکامیوں کا منہ دیکھنا ہوگا، قتل و غارتگری رفع نہ ہوسکے گی اور انسانیت کو وہ سکون اور اطمینان قلبی حاصل نہ ہوسکے گا جس کے لئے وہ مرکزیت و حکومت چاہتی ہے ـــــــ صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ صدیوں کی پسپائی کے بعد اب بھی عقل اپنا سپر ڈال دے اور علم وحی سے اکتساب فیض کرے کیونکہ ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

فرمودۂ اقبال

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خدامست و خود آگاہ
اور یہ مذہب ملّا و جمادات و نباتات

بال جبریل

ہماری تازہ ترین مطبوعات

ہمارے ہندوستانی مسلمان:۔ جس میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین پر مفصل تبصرہ ہے۔ یہ تحریک ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیا و تجدید کی ایک آخری اور زبردست کوشش تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سید احمد شہید اور ان کے رفقا نے مسلمانوں کو کس طرح منظم کیا اور کس طرح اُن کے اندر بلالی روح پیدا کر دی تھی قیمت دو روپے بارہ آنے۔ (۲/۱۲)

اسلامی پارٹی کا آئین:۔ مسلمانوں کو ہندوستان میں اب کن خطوط پر منظم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیاء کے لئے کوشش کی جا سکتی ہے۔ ان سوالات کا جواب معلوم کرنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے

شرح اسرار خودی:۔ علامہ اقبال کا بنیادی فلسفہ مثنوی اسرار و رموز میں بیان کیا گیا ہے اس کتاب فارسی میں ہے یہ شرح پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی نے اردو زبان میں تحریر فرمائی ہے بے حد مقبول ہے دوسرا ایڈیشن اس گرانی کے زمانہ میں طبع ہوا ہے قیمت وہی ہے جو پہلے تھی صرف ایک روپیہ آٹھ آنے۔ (عہ/)

اقبال کا تصور زمان و مکان:۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے۔ پی ایچ ڈی نے علامہ اقبال کے نظریہ زمان و مکان کی تشریح اُردو زبان میں کر کے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے علامہ کے چھ لیکچروں میں سے دو لیکچروں میں اسی مسئلہ پر بحث ہے اور یہی دو لیکچر مشکل ترین لیکچر ہیں اس لئے اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ قیمت دس آنے۔ (۱۰/)

موت و حیات اقبال کے کلام میں:۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی نے علامہ اقبال کے اُس نظریہ پر سیر حاصل بحث کی ہے جو وہ زندگی اور موت سے متعلق رکھتے تھے یہ چھوٹا سا مضمون بے حد پر از معلومات اور روح پرور ہے۔ قیمت چار آنے۔ (۴/)

اقبال کے چند جواہر ریزے:۔ یہ علامہ اقبال کی ملفوظات کا ایک نادر مجموعہ ہے جو جناب خواجہ پروفیسر عبدالمجید صاحب گورنمنٹ کالج لاہور نے جمع کیا تھا۔ قیمت صرف دس آنے۔ (۱۰/)

اشتراکیت اور اسلام:۔ مولوی محمد مظہر الدین صدیقی بی۔ اے کا یہ مضمون ہر لکھے پڑھے کے مطالعہ میں آنا چاہیے۔ قیمت صرف چھ آنے (۶/)

انتخاب غالب:۔ غالب کے کلام کا یہ ایک ایسا نادر مجموعہ ہے جو اب تک شائع نہیں ہوا اس مجموعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ غالب نے خود اپنے کلام کا یہ انتخاب جمع کیا تھا۔ قیمت چھ آنے (۶/)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

بخدمت قارئین "پیغام حق"

مکرمی برادران - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"پیغام حق" علامہ اقبال کی یاد میں ۱۹۴۰ء سے متواتر شائع ہو رہا ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس سالہ میں صرف وہ مضامین شائع ہوتے ہیں جو اسلامی فلسفہ اور تعلیماتِ قرآنیہ کی شرح کرتے ہیں اس پرآشوب زمانہ میں جبکہ اسلام وقرآن کے قوانین سے لوگ بُعد اختیار کر رہے ہیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اسلامی نظریات اور تعلیمات کو عام کیا جائے ۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی　　حدی را تیز تر مے خواں چو محمل را گراں بینی

میں آپ سے اس سلسلہ میں صرف اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ اگر آپ "پیغام حق" کے خریدار ہیں تو کم از کم چھ ایسے حضرات کے نام وپتہ سے مجھے آگاہ کیجیے جو آپ کے خیال میں اس پرچہ کی خریداری منظور کر لیں گے تاکہ اُن سے خط وکتابت کی جائے ۔ اگر آپ سے ممکن ہو تو آپ خود بھی کچھ تھوڑا سا وقت نکال کر اس پرچہ کی توسیع اشاعت کے لئے کام کیجیے اور اگر آپ خریدار نہیں ہیں تو آپ خود بھی خریداری قبول کریں اور احباب کو بھی اس طرف متوجہ کریں اور کم از کم چھ حضرات کے نام وپتہ سے مجھے آگاہ کریں ۔ آپ اسی فارم پر ایسے حضرات کے نام لکھ کر مجھے ارسال فرما سکتے ہیں ۔ جس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں گا ۔ والسلام ۔　　نیاز مند محمد شاہ ایڈیٹر

بنام ایڈیٹر "پیغام حق"

جناب من سلام مسنون آپ کی اپیل کے پیش نظر ذیل میں چھ حضرات کے پتے درج ہیں ۔ آپ ان سے خط وکتابت کیجیے ۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ حضرات آپ کے پرچہ کی خریداری منظور فرمالیں گے ۔ والسلام ۔

....

مکمل نام وپتہ: ....

Registered No.

منظورکردہ صوبہ سندھ و ریاست بہاول پور و ریاست بھوپال برائے گورنمنٹ سکول

مئی ۱۹۴۴ء — جلد ۸ — عدد ۱

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم۔ اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت سالانہ چار روپے — قیمت فی پرچہ ۶ آنے

ہماری تازہ مطبوعات

ہمارے ہندوستانی مسلمان

ولیم ہنٹر، آئی ۔ سی ۔ ایس

نے

ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے عہد میں مسلمانوں کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اور مسلمانوں کی اسلامی ذہنیت اور اس کے تبدیل کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہیں، یہ تاریخی کتاب مسلمانوں کی دماغی کیفیت اور ان کی تحریک ہائے آزادی کا ایک مرقع ہے، ضمنا وہابی تحریک، سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ اور جماعت مجاہدین سرحد کی مساعی کا مختصر مگر قابل وثوق اور نہایت سبق آموز ذکر آگیا ہے، قیمت مجلد ۲ روپے ۱۲ آنے

انتخاب غالب

مرزا غالب دہلوی نے اپنے کلام کا ایک انتخاب خود تیار کرکے فنانشل کمشنر پنجاب کو بھیجا تھا اور ایک چٹھی اس کے ہمراہ ارسال کی تھی، یہ انتخاب اب تک کہیں طبع نہیں ہوا، اور اس قابل تھا کہ شائقین ادب اردو کے لئے اسے طبع کیا جاتا ہے،

قیمت ٦ آنے

اقبال پر ایک نظر

علامہ اقبال کی شاعری اور ان کی شخصیت پر مختلف اہل علم نے تنقید کی ہے، ہم نے اس میں سے چند بلند پایہ مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، اس میں مولانا ظفرعلی خاں، جناب سالک اور مولانا عبدالسلام ندوی ایسے ادباء کے مضامین ہیں،

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

اسلامی پارٹی کا آئین

اسلامی ہند میں مسلمانوں کو کن خطوط پر منظم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ان کے اندر ضبط (Discipline) قائم ہو سکتا ہے اور کس مقصد کو لیکر تمام مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہیں، ان سوالات کا جواب اگر آپ دیکھنا چاہیں تو جناب عزیز ہندی کی کتاب «اسلامی پارٹی آئین» کا مطالعہ فرمائیں، قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے — رؤسا سے پانچ روپے

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد ۸ | بابت ماہ مئی - جون سنہ ۴۲ء | عدد ۵

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس بیرون اکبری گیٹ لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ "پیغام حق" ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رح کو متفقہ طور پر ہندی مسلمانوں کا نباض اور اسلام کا مفکر تسلیم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ کے مطالعہ میں گزرا۔ انہوں نے ایک طرف تو مسلمانوں کے شاندار ماضی کی تصویر تاریخ عالم اسلامی میں دیکھی، اور دوسری طرف مسلمانوں کا تباہ شدہ حال بچشم خود ملاحظہ فرمایا۔ اُن کے حساس دل کو یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا کہ مسلمان اپنی سابقہ روایات کو بھول گیا بلکہ یہ کہ وہ مسلمان ہی نہیں رہا۔ چنانچہ اُنہوں نے زبانِ خداوندی سے جواب شکوہ میں کہلوایا ہے ؎

شور ہے کہ ہو گئے مسلماں نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود؟

یوں تو مرزا بھی ہو، سید بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کے ایک ایک مرض کا کھوج لگاتے ہیں اور اُنہیں یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اے مسلمان ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

یہی چیز سمجھاتے سمجھاتے آپ فرماتے ہیں کہ میری نگاہِ حق بیں نے جو کچھ دیکھ لیا ہے وہ نہ تو
ہر شخص دیکھ سکتا ہے نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

تاہم جو کچھ اشارہ وکنایہ سے بیان کیا جا سکتا ہے اُسے بھی اے مسلمانان ہند
تم نے نہ سُنا اور نہ مانا تو بس پھر تمہاری خیر نہیں ؎

نہ مانو گے تو مِٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

الغرض علامہ کو اس بات کی بہت ہی فکر تھی کہ ہم نام نہاد مسلمان پکّے، صحیح اور راسخ العقیدہ مسلمان بن جائیں۔ اُن کی شاعری اسی جذبہ کی پیدا وار ہے۔ اور ان کے فلسفہ کی صرف یہی تلقین ہے۔

علامہ نے مسلمانوں کی نہضت و بیداری کے لئے نثر اور نظم دونوں سے کام لیا ہے۔ اب تک نظم کا کچھ حصّہ تو مسلمانوں کے سامنے آسکا ہے مگر افسوس ہے کہ نثر سے بہت ہی کم لوگوں نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نثر میں آپ نے جس شرح و بسط سے کلام کیا ہے نظم میں وہ کام مُشکل تھا۔ نثر سے فائدہ نہ اُٹھانے کا سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ آپ نے نثر میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب کا سب انگریزی زبان میں ہے۔ اور انگریزی زبان بھی وہ لکھی ہے جو چیستان سے کم نہیں، کیونکہ جو چیز وہ بیان کرنا چاہتے ہیں وُہ غالباً اسی زبان میں ادا ہو سکتی تھی۔ آپ کے اِن خیالات کا مجموعہ اُن چھ لیکچروں میں پایا جاتا ہے جو آپ نے مدراس یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ

کے سامنے دئے تھے۔ اور اب کتابی شکل میں "اسلام میں الٰہیاتی فکر کی تشکیل جدید" کے عنوان سے انگریزی میں طبع ہو چکے ہیں مگر سب سے بڑی مشکل یہ آپڑی ہے کہ اُن لیکچروں کا اُردو ترجمہ اب تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ علامہ کے بنیادی انقلابی اور حرکی خیالات کا فلسفہ اور ان کی توجیہ معلوم کرنا چاہو تو ان لیکچروں کے مطالعہ بغیر ناممکن ہے اور وہ انگریزی میں ہونے کی وجہ سے اکثریت کی سمجھ سے بہت بالا ہیں۔ عوام کی طلب اور وقت کی ضرورت کے پیش نظر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ "پیغام حق" کے ذریعے عوام تک اس فلسفہ کو اُردو زبان میں پہنچایا جائے جس کی بنیاد پر علامہ مسلمانوں کی ملت کی تشکیل چاہتے ہیں چنانچہ چھٹے لیکچر کے مطالب اس پرچہ میں بیان کر دیئے گئے ہیں، ان مطالب کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کرنا بڑی ہی ذمہ داری کا کام ہے اور ذمہ داری کے علاوہ بے حد مغز ماری محنت اور طوالت چاہتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی صاحب کو اس کی جرأت نہ ہوئی تھی۔

ہمارے ایک نوجوان، ہونہار مگر گمنام ادیب اختر مسعود بی اے نے جنہوں نے اقبال اور اقبالیات کا گہرا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکچرز زیر بحث کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اختر صاحب کی یہ کوشش مطالعۂ اقبال کا ایک نیا مفید اور ہنگامہ خیز باب کھول دیگی۔ اگر اہل بصیرت کو اس کوشش میں کوئی سقم نظر آئے تو ان کے قیمتی مشورے شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔

پنجاب میں لیگ اور یونینسٹ کا جھگڑا بڑی افسوسناک شکل اختیار کر رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی مسلمانوں کی بدبختی کے دن ابھی اور باقی ہیں۔ جب تک مسلمان اپنی ذاتی اغراض اور جھوٹی وجاہت کے پیچھے پڑے ہیں اور ملت و مذہب کے لئے

ایثار و قربانی کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، تب تک اس قوم کے اچھے دن نہیں آسکتے۔

لیگ مسلمانوں کی ایک سیاسی و مذہبی جماعت ہے۔ اس کے پیشِ نظر جو کام ہے وہ مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور عمرانی ترقی کا حاصل کرنا ہے۔ اس کا موجودہ رہنما ہندی مسلمانوں کا سب سے بڑا قانون دان، سب سے زیادہ مخلص، سب سے زیادہ جری اور حوصلہ مند انسان ہے۔ وہ اپنی قوم کو اس ذلت و پستی سے نکالنے کے لئے اپنی دولت اور اپنے آرام کو تباہ کر رہا ہے۔ اس کو دنیا کی کسی چیز کا لالچ نہیں وہ شہرت کا بھوکا ہے نہ جاہ و جلال کا طالب۔ وہ چاہتا ہے تو صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی قوم سربلند ہو جائے۔

مسلمانوں کی سیاسی سربلندی مذہبی سربلندی کا باعث بنے گی۔ کیونکہ ہمارا مذہب اور ہماری سیاست دو جداگانہ چیزیں نہیں بلکہ ہماری سیاست ہمارا مذہب ہے۔ اور ہمارا مذہب ہماری سیاست۔ مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں نے اب عملاً ان دونوں چیزوں کو الگ کر رکھا ہے۔ ایک جماعت مذہب کی اجارہ دار بن گئی ہے۔ اور دوسری سیاست کی۔ دونوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے مگر جہاں تک ہم نے دیکھا ہے۔ دونوں پر اپنی اپنی نشانِ راہ گم ہے۔ ہم دونوں جماعتوں کا نقطۂ اعتدال مسلم لیگ کو خیال کرتے ہیں۔ اور ابنائے وطن سے درخواست کرتے ہیں کہ ہر ممکن طریقے سے اس جماعت کی امداد کریں اور اس کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے دستِ تعاون بڑھائیں۔

مخالفین سے اکثر سنا گیا ہے کہ وہ مسلم لیگ کے رہنما جناب محمد علی جناح پر طرح طرح

سے طعن و تشنیع کرتے ہیں مگر اے کاش ! وہ دوسروں پر اعتراض کرنے سے پہلے خود اپنی خبر لے لیتے۔ اگر حقیقی اسلام کو معیار تصور کر کے اپنی اپنی زندگیوں کو اس کسوٹی پر پرکھا جائے تو آج کون ہے۔ جو دعوے سے یہ کہہ سکے ۔

هَآؤُمُ اقْرَءُوا كِتٰبِيَهْ ۝ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ

یعنی آؤ میرا اعمالنامہ دیکھ لو۔ میں جانتا تھا کہ مجھے ایک دن حساب کتاب پیش کرنا ہے (اس لئے میں نے اپنا معاملہ بالکل صاف رکھا تھا)

بلکہ یہاں تو یہ حال ہے کہ اگر ہمارے سامنے اعمال نامہ پیش کیا جائے تو ہمارے بڑے سے بڑے متقی اور زاہد کا یہ حال ہو کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے۔

يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۝ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝

یعنی اے کاش ! مجھے اعمال نامہ دیا ہی نہ جاتا ۔ اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کتاب کیا ہے ۔ [الغرض دوسروں پر زبان طعن و تشنیع کو بند کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے جبکہ انسان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود اپنے آپ کو دیکھ لے ۔

ہمیں بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مجلس احرار کے رہنما اس وقت ایک نہایت ہی مضحکہ خیز اور بے معنی اقدام کر رہے ہیں ۔ وہ مسلم لیگ کے رہنماؤں پر عجیب و غریب اعتراض قائم کر رہے ہیں اور براہ راست مسلم لیگ کی مخالفت کرنے کی بجائے اس کے رہنماؤں اور کارکنوں کی مخالفت کر کے لیگ کا شیرازہ بکھیرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ نہایت منافقانہ اور غدارانہ

ہے۔ دیانت وامانت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اُن کو لیگ کے پروگرام سے فی الواقع کوئی اختلاف ہے تو وہ اِس بات کا جواب دے کہ آیا

(۱) وہ مسلمانوں کی جُدا گانہ شیرازہ بندی اور ان کے استقلال کے حامی ہیں یا مخالف ؟

(۲) وہ پاکستان کے محض نام سے اختلاف رکھتے ہیں یا پاکستان کی ہئیت اور مقصد کے بھی مخالف ہیں۔

اگر سوال (۱) کا جواب اثبات میں ہو تو ایمانداری کا تقاضا یہ ہے۔ کہ وہ مجلس احرار کو یکسر ختم کر کے لیگ میں شامل ہو جائیں اور اپنی خداداد قابلیتوں کو بروئے کار لاکر مُسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کی خدمت کریں۔ اور اگر اُن کا جواب نفی میں ہو تو ان کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اب کون عقل کا اندھا ہوگا جو اُن کی لیڈرشپ کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوگا۔

سوال (۲) کا جواب اگر یہ ہو کہ ان کو صرف نام سے کد ہے اور کام اور مقصد سے اتفاق ہے تو اُن کو چاہیئے کہ وہ لیگ کے کسی جلسۂ عام میں تشریف لاکر اپنا تجویز کردہ نام پیش کریں اور اُس کی معقولیت لوگوں کو ذہن نشین کر کے نام بدلوا ڈالیں۔ اور اگر اُن کو مقصد ضرورت اور ہیئت سے ہی اختلاف ہے، تو کیا اُن کے پاس کوئی نصب العین اور کوئی پروگرام ہے ؟ اگر ہو تو لائیں مگر لائیں گے کیا؟ جب سے مجلس احرار معرض وجود میں آئی ہے۔ وہ اب تک مسلمانوں کو کوئی پروگرام نہیں دے سکی۔ اور اب جبکہ لیگ نے قوم کی اس ناگزیر ضرورت کو پورا کر دیا ہے، تو یہ لوگ ڈیڑھ اینٹ کی جُدا گانہ مسجد بنانے میں مصروف

ہو گئے ہیں۔ سچ کہا اکبر الہ آبادی نے ؎

جنونِ لیڈری کا دَور ہے پھر ۔۔۔ فلک کو کدّ ہے بگڑ و اَور بگاڑ و

نہایت مُسرّت کا مقام ہے کہ پنجاب کے آسمانِ صحافت پر ایک نئے اَور درخشندہ ستارہ کا طلوع ہونے والا ہے۔ قارئینِ کرام ناواقف نہ ہوں گے کہ کوئی چار پانچ سال سے لاہور کے نوجوان نہایت ہی سلیم الطبع، خوش ذوق، محنتی اَور دیانت دار ادیبوں نے "نوائے وقت" کے نام سے ایک ہفتہ روزہ اخبار جاری کر رکھا تھا۔ اِس ہفتہ وار پرچہ نے مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کرنے اور اُن تک تعمیری لٹریچر پہنچانے میں جو کام کیا ہے، وہ بڑے سے بڑے رسائل و اخبارات سے مدّتوں میں نہیں ہو سکا۔ اب اِن نوجوان نے اِس ہفتہ وار اخبار کو روزانہ بنانے کے انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ روزانہ اخبار تھوڑے ہی دنوں تک میدان میں آجائیگا۔

ہمارے خیال میں اس وقت صرف "نوائے وقت" ہی ایک ایسا روزنامہ ہوگا جو صحافت کی جملہ شرائط کو پورا کریگا۔ وہ بے لاگ تنقید سے کسی طرح نہیں رکیگا اور قوم کی تعمیری خدمات کو باحسن وجوہ سرانجام دے سکیگا۔ اس اخبار کا سالانہ چندہ غالباً ۱۲ روپے ہوگا ہم احباب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ایک ایک سال کا پورا چندہ اولین فرصت میں بنام منیجر اخبار "نوائے وقت" بیڈن روڈ لاہور بھیجکر اپنے قومی احساس کا ثبوت دیں۔ "ادارہ پیغامِ حق" نے جہاں دوسروں کو اس قومی ضرورت کا احساس دلایا ہے، وہاں اپنا چندہ بھی ایک سال کے لئے ارسال کر دیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہیئت اسلامی میں اصول حرکت

اسلام ایک تہذیبی تحریک ہونے کے لحاظ سے کائنات کے پرانے سکونی نظریہ کو رد کر دیتا ہے اور اس کی بجائے دنیا کے متعلق ایک حرکی نقطۂ نگاہ تک پہنچتا ہے ایک جذباتی نظام اتحاد کی حیثیت میں یہ فرد کی قدر و قیمت اس کی انفرادیت کے لحاظ سے پہچانتا ہے اور خون کے رشتہ کو انسانی وحدت کی بنیاد ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ رشتۂ خون زمین پیوندی ہے۔ انسانی وحدت کے لئے خالص نفسیاتی بنیاد کی سعی و تلاش اس ادراک کے بغیر مشکور نہیں ہو سکتی کہ حیات انسانی اپنی اصل کے لحاظ سے روحانی ہے ایسا ادراک تازہ فرائض کی تخلیق اس رنگ میں کرتا ہے کہ انہیں زندہ رکھنے کے لئے کسی قسم کی رسمیاتی جکڑ بندیوں کی ضرورت نہیں رہتی اور انسان کے لئے زمین کی پستیوں سے اوپر ابھرنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ عیسائیت جو حقیقت میں ایک خانقاہی سلسلے کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔ کانسٹائن نے اسے انسانی وحدت کے ایک نظام کی حیثیت میں چلانے کی کوشش کی۔ اس حیثیت میں اس کی شکست و ناکامی نے قیصر جولین کو پھر روم کے پرانے دیوتاؤں کی طرف متوجہ کر دیا جن کو اس نے نئے فلسفیانہ معانی پہنانے کی کوشش کی۔ جب اسلام صفحۂ تاریخ پر ظاہر ہوا تو اس وقت مہذب دنیا کی جو کیفیت تھی موجودہ تہذیب کے ایک جدید مؤرخ نے اس کی یوں تصویر کھینچی ہے۔

"اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ عظیم الشان تہذیب جس کی تعمیر میں پورے چار ہزار

سال صرف ہوئے تھے منہدم ہونے کے قریب ہے۔ انسانی نسل وحشت و بربریت کے اُس دور میں لوٹ جانے کو تھی جس میں ہر قبیلہ و فرقہ ایک دوسرے کا دشمن تھا اور جہاں نظم و قانون ایک غیر معروف چیز تھی۔ پرانی قبائلی رسوم کی گرفت ختم ہو چکی تھی۔ لہٰذا پرانے شہنشاہی اسالیب بھی اُس وقت کام نہ دے سکتے تھے۔ عیسائیت کی نئی وضع شدہ رسوم وحدت اور نظم کے بجائے افتراق و تباہی پیدا کر رہی تھیں۔ یہ وقت المناک واقعات و حوادث سے معمور تھا۔ تہذیب ایک ایسے عظیم الجثہ درخت کی مانند تھی جس کے پتے تمام دنیا کو احاطہ کئے ہوئے تھے اور جس کی شاخیں آرٹ۔ سائنس اور ادب کے طلائی ثمرات سے بھرپور تھیں۔ یہ درخت کھڑا مرجھا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کا جیون بخش پانی اس کے تنے کو اب سیراب نہیں کر رہا تھا بلکہ اُس کی جڑیں تک کھوکھلی ہو چکی تھیں اور اس کا وجود جنگ کے طوفان سے پارہ پارہ۔ اب یہ محض پرانے قوانین و رواج کے سہاروں پر کھڑا تھا جو ہر لمحہ ٹوٹ سکتے تھے۔ کیا کوئی ایسی جذباتی تہذیب موجود تھی جسے بروئے کار لانے سے انسانی نسل کو رشتۂ وحدت میں پرو دیا جاتا اور تہذیب کو بچایا جا سکتا؟ ایسی تہذیب کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک نئی قسم کی چیز ہوتی۔ کیونکہ پرانے قیود و رسوم مردہ ہو چکے تھے۔ اور اُسی قسم کے نئے رواج اور رسوم کا وضع کرنا صدیوں کا کام تھا۔"

یہ مورخ ہمیں آگے چل کر بتاتا ہے کہ دُنیا کو ایک ایسی تہذیب کی ضرورت تھی جو تخت و تاج کی تہذیب اور وحدتِ انسانی کے اُن تمام نظاموں کی جگہ لے جن کا انحصار رشتۂ خون پر تھا۔ یہی مورخ مزید لکھتا ہے کہ اس امر کے حیرت ناک ہونے میں کوئی شک نہیں کہ ایسی تہذیب عرب کی سرزمین سے اُٹھی اور عین اس وقت اُٹھی جب کہ اس کی سخت ضرورت تھی لیکن اس مظہر میں حیرت کی ایسی کوئی بات نہیں۔ روح کائنات اپنی ضرورتوں

کو وہبی طور پر محسوس کر لیتی ہے۔ اور ہنگامہ خیز لمحوں میں خود ہی اپنی سمت کا تعین بھی کر لیتی ہے۔ اسی بات کو ہم مذہب کی زبان میں پیغمبرانہ الہام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ بالکل فطری ہے کہ اسلام نے ایسے سیدھے سادھے لوگوں کے شعور میں جنم لیا ہو جو پرانے تمدنوں کے اثرات سے محفوظ تھے اور جن کی جغرافیائی وضعیت ایسی تھی جہاں تین براعظم آملتے ہیں۔ یہ نئی تہذیب وحدت عالم کی بنیاد اصول توحید میں مضمر پاتی ہے اسلام جماعتی حیثیت میں نسل انسانی کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں اس اصول کو ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی ذریعہ ہے۔ یہ خدا کے ساتھ وفاداری کا مطالبہ کرتا ہے تخت و تاج کے ساتھ نہیں اور چونکہ خدا ہی تمام زندگی کی آخری روحانی اساس ہے اس لئے خدا سے وفاداری درحقیقت انسان کی اپنی مثالی فطرت سے وفاداری کے مترادف ہے۔ تمام زندگی کی آخری و قطعی روحانی اساس اسلام کی نگاہ میں ابدی ہے اور اپنا اظہار تنوع اور تغیر میں کرتی ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی کے لئے جس کی بنیادی حقیقت ایسے تصور پر مبنی ہو اپنی داخلی زندگی میں استقلال و تغیر کے اصولوں کو سمو لینا ضروری ہے اس کے پاس ایسے ابدی اصولوں کا سرمایہ ہونا لازمی ہے۔ جو اس کی حیات اجتماعی کی رہبری کرے۔ کیونکہ ابدی اصول ہی اس جہان تغیر و انقلاب میں ہمیں پاؤں جمانے کا موقع دے سکتے ہیں لیکن جب ان ابدی اصولوں کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ ان میں تغیر کا کوئی امکان ہی موجود نہ ہو —— وہ تغیر جسے قرآن خدا کی عظیم ترین نشانیوں میں سے کہہ کر پکارتا ہے —— تو یہ سوسائٹی کی فطری حرکی صفات کو بروئے کار آنے سے روک دیتے ہیں۔ سیاسی اور معاشرتی علوم میں یورپ کی ناکامی پہلے اصول کی وضاحت کرتی ہے اور آخری اصول کی تشریح اسلام

کی پانچ صد سالہ بے عملی سے ہوتی ہے پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہئیت اسلامیہ میں اصولِ حرکت ہے کیا؟ جواب ہے اجتہاد۔

اس لفظ کے لغوی معنی سعی یا کوشش ہے۔ اسلامی فقہ میں اس کا اصطلاحی مفہوم کسی فقہی مسئلہ میں آزادانہ فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کرنا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس خیال کی ابتدا، قرآن کی مشہور آیت

"اور کوشش کرنے والوں پر ہم اپنی راہ واضح کر دیتے ہیں" سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ کی ایک حدیث میں تو یہ اور بھی واضح شکل میں موجود ہے۔ جب معاذؓ کو یمن کا حاکم مقرر کیا گیا تو رسول اللہ نے ان سے دریافت فرمایا کہ وہ معاملات کا فیصلہ کس طرح کیا کریں گے؟ میں معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کیا کروں گا۔ معاذؓ نے جواب دیا لیکن اگر کتاب اللہ ان معاملات میں خاموش ہو تو پھر میں اسوۂ رسولؐ کو اپنا رہبر بناؤں گا۔ اور اگر اسوہ میں بھی تمہاری رہبری کا کوئی سامان نہ ہو، تو پھر میں اپنا آزادانہ فیصلہ کرنے کی کوشش کروں گا، تاریخ اسلام کا طالب علم اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ اسلام کی سیاسی ترقی کے ساتھ ساتھ فقہ کی ترتیب و تدوین ایک اشد ضرورت بن گئی تھی اور ہمارے ابتدائی عربی اور غیر عربی فقہا نے انتھک کوششیں کیں حتیٰ کہ فقہی مسائل کے تمام جمع شدہ مواد کی آخری صورت پذیری ہمارے تسلیم شدہ مذاہب کی شکل میں ہوئی۔ یہ فقہی مذاہب اجتہاد کے تین درجوں پر یقین رکھتے ہیں (۱) وضع قوانین میں مکمل اجتہاد جو عملی طور پر ان مذاہب کے بانیوں تک محدود ہے (۲) اضافی اجتہاد جو کسی خاص مذہب کی حدود کے اندر ہی برتا جا سکتا ہے (۳) خاص اجتہاد جس کا تعلق کسی ایسے خصوصی مسئلے پر قانون کے انطباق

سے ہے جبسے بانیان مذاہب نے بغیر کسی فیصلے کے چھوڑ دیا ہو۔ یہاں مجھے اجتہاد کے پہلے درجے یعنی مکمل اجتہاد کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اہل سنت اس درجہ اجتہاد کے نظری امکانات کے تو قائل ہیں لیکن جب سے مذاہب فقہ کی ابتدا ہوئی ہے عملی طور پر اسے نہیں مانتے یہ اس لئے کہ مکمل اجتہاد کے گرد جن قیود و شرائط کی حصار بندی کر دی گئی ہے اُن کا کسی ایک فرد واحد میں مجتمع ہونا قریب قریب محالات سے ہے قرآن کی بنیادوں پر جو زندگی کے متعلق یقینی طور پر ایک حرکی نقطۂ نگاہ رکھتا ہے۔ قائم شدہ نظام قانون کا اس قسم کا اندازہ میلان نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس ذہنی طرز عمل کی وجوہات دریافت کریں جنہوں نے اسلامی فقہ کو ایک جسد بے روح بنا کر رکھ دیا ہے یورپ کے بعض اہل قلم کی رائے میں فقہ اسلامی کی یہ سکوتی سیرت ترکوں کے اثر کی وجہ سے ہے۔ یہ نظریہ بالکل سطحی ہے۔ اس لئے کہ تاریخ اسلام میں ترکی اثر و نفوذ کے کارفرما ہونے سے بہت پہلے فقہی مذاہب مستقل بنیادوں پر قائم ہو چکے تھے۔ میری رائے میں حقیقی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ہم سب اُس تاریخ عقلیت (RATIONLISM) سے واقف ہیں جو اسلام کے اندر عہد عباسیہ کے آغاز میں پیدا ہوئی اور اُن تلخ اختلافات سے بھی ناآشنا نہیں ہیں جن کو اس تحریک نے جنم دیا۔ مثال کے طور پر دونوں فریقوں کے ایک اہم اختلافی مسئلہ کو لیجئے یعنی قرآن کی ابدیت کا قدامت پسندانہ عقیدہ عقلیت پسند اس کے منکر تھے کیونکہ اُن کے خیال میں یہ محض 'ابدیت لفظ' کے عیسائی عقیدے کی ایک دوسری شکل تھی۔ دوسری طرف قدامت پسند مفکرین جنہیں بعد کے عباسی خلفا

عقلیت کے پوشیدہ سیاسی مفہوم سے ڈر کر پوری پوری امداد دے رہے تھے۔ یہ لئے رکھتے تھے کہ قرآن کی ابدیت کے منکر ہو کر عقلیت پسند مسلم سوسائٹی کی بنیاد ہی کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر نظام کو لیجئے اس نے عملی طور پر احادیث کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور علی الاعلان ابوھریرہ رضؓ کو غیر ثقہ راوی قرار دے دیا اس طرح کچھ تو تحریک عقلیت کے بنیادی محرکات کے متعلق غلط فہمی کی وجہ سے اور کچھ خاص خاص عقلیت پسندوں کے بے قید و بے زمام خیالات کی وجہ سے قدامت پسند مفکرین اس تحریک کو ایک انتشاری اور انہدامی قوت سمجھتے تھے اور اسلام کے معاشری نظام کے قیام و استحکام کے لئے ایک خطرہ۔ ان کا حقیقی مقصد اسلام کے معاشری نظام کو قائم اور محفوظ رکھنا تھا اور اس مطلب کو حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی راستہ ان پہ کھلا تھا کہ شریعت کی باندھنے والی قوت کو استعمال میں لائیں اور اپنے نظام فقہی کو امکانی حد تک سخت گیرانہ اور شدید بنا لیں۔

(۲) مرتاض تصوف کا آغاز اور اس کی ترقی جس نے تدریجی طور پر غیر اسلامی سیرت کے اثرات کے ماتحت ایک خالص قیاسی پہلو تعمیر کر لیا تھا بڑی حد تک اس طرز عمل کی ذمہ دار ہے۔ خالصاً دینی لحاظ سے تصوف نے ان لفظی نزاعات کے خلاف جو ہمارے علما کا موضوع بن چکی تھیں ایک قسم کی بغاوت پیدا کر دی۔ حضرت سفیان ثوریؒ کا معاملہ مسئلہ زیر بحث میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے وہ اپنے عہد کے طباع ترین قانون دانوں کی صف میں ممتاز جگہ رکھتے تھے اور قریب تھا کہ ایک نئے فقہی مذہب کے بانی بن جائیں مگر چونکہ ان کی ذات میں روحانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لئے ہمعصر فقہا کی بال کی کھال نکالنے والی قانونی نزاکتوں نے انہیں مرتاض تصوف کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ تصوف اپنے قیاسی پہلو کے لحاظ سے

جو بعد کی پیداوار ہے آزاد خیالی کی ایک صورت ہے اور عقلیت (RATIONLISM) سے متفق۔ اُس نے ظاہر و باطن کی تمیز پر اتنا زور دیا کہ دلوں میں اُن تمام اشیاء کے ساتھ جن کا تعلق ظاہر سے تھا اور جو باطن سے متعلق نہیں بے اعتنائی کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔

تصوّف مابعد کے اس کمتر غیر دنیاوی طرزِ فکر نے اسلام کے ایک نہایت اہم پہلو یعنی معاشری نظام کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔ اور اس کے قیاسی پہلو میں بے زمام خیالات کے لئے جو دعوت موجود تھی پہلے تو اُس نے اعلیٰ قابلیت وصلاحیت رکھنے والے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بعد میں انہیں اپنے اندر جذب کر لیا۔ اس طرح اسلامی خلافت عام طور پر متوسط درجہ کی ذہنی قابلیت رکھنے والے انسانوں کے ہاتھوں میں رہ گئی اور جب عوام نے اعلیٰ شخصیتوں کو اپنی رہنمائی و رہبری کے لئے میدان میں نہ پایا تو اپنی حفاظت فقہی مذاہب کی اندھا دُھند پیروی ہی میں دیکھی۔

(۳) ان تمام وجوہات کی سرتاج اسلامی دُنیا کے علمی و ذہنی مرکز بغداد کی تباہی تھی جو تیرھویں صدی کے وسط میں واقع ہوئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ضرب نہایت بے پناہ تھی۔ حملۂ تاتار کے تمام ہمعصر مورّخ تباہیٔ بغداد کی خوفناک داستان بیان کرتے وقت اسلام کے مُستقبل کے متعلق نیم عریاں قنوطیت کا اظہار کرتے ہیں۔ مزید انہدام کے خطرے کے پیشِ نظر جو سیاسی قوت کی تباہی و زوال کے ایسے موقع پر ایک فطری امر ہے قدامت پسند مفکّرینِ اسلام نے اپنی تمام کوششیں اس نکتہ پر مرتکز کر دیں کہ لوگوں کے لئے ایک یکساں و ہمرنگ معاشری نقشہ زندگی کو محفوظ کر لیا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ بندائی فقہاء کی شرح قانونِ شریعت میں ہر قسم کی اختراعات و بدعات کی راہ سختی کے ساتھ بند کر دی جائے۔ ان کا مرکزی خیال معاشری نظم کی حفاظت تھا اور اس میں کوئی شک نہیں

کہ ایک حد تک اُن کا خیال بالکل صحیح تھا کیونکہ نظم و تنظیم انتشاری و زوالی قوتوں کے اثر کو بڑی حد تک زائل کر دیتی ہے۔ لیکن اُنھوں نے یہ نہیں دیکھا اور نہ ہمارے موجودہ علماء کی نظر وہاں تک پہنچ رہی ہے کہ کسی ملّت کی تقدیر اتنی زیادہ کمالِ تنظیم پر منحصر نہیں ہے جتنی کہ فرد کی قدر و قیمت پر۔ ایک بے حد منظم سوسائٹی میں فرد کی انفرادیت کلی طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے تمام معاشری فکر کا سرمایہ دار تو بن جاتا ہے مگر اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔ اس طرح تاریخ ماضی کے ساتھ جھوٹی عقیدت اور اُس کی مصنوعی نشاۃ ثانیہ کسی قوم کی مرضِ زوال کا علاج نہیں بن سکتیں۔ "تاریخ کا فتویٰ جیسا کہ ایک جدید اہلِ قلم نہایت موزوں انداز میں کہتا ہے" یہ ہے کہ پُرانے مستعمل خیالات کسی ایسی قوم میں دوبارہ اقتدار حاصل نہیں کر سکتے جس نے ایک دفعہ اُنہیں استعمال کر کے بوسیدہ کر دیا ہو۔" لہٰذا کسی ملت کو زوال کے چنگل سے چھڑانے کے لئے صرف ایک ہی مؤثر قوت موجود ہے اور وہ خود دار انسانوں کی پرورش و افزائش ہے اسی قسم کے افراد زندگی کی گہرائیوں کو عیاں کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جو ہم پر زندگی کے نئے معیار آشکار کرتے ہیں۔ جن کی روشنی میں ہمیں سوچنے لگ جاتا ہے کہ ہمارا ماحول کلی طور پر غیر متبدل نہیں ہے بلکہ اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

تیرھویں صدی اور بعد کے فقہائے نے ماضی کے ساتھ جھوٹی عقیدت کے ذریعے جس "فاضل تنظیم" (OVER ORGANIZATION) کے میلان کا اظہار کیا وہ اسلام کی داخلی رُوح کے خلاف تھا۔ ابنِ تیمیہ رح کا زبردست جوابی انقلاب براہِ راست اسی میلان کا نتیجہ تھا۔ ابن تیمیہ رح کی پیدائش تباہی بغداد کے پانچ سال بعد ۱۲۶۳ء میں ہوئی تھی اور انہیں اسلام کے انتھک اہلِ قلم اور مبلغین کی صف میں بہت اونچا درجہ حاصل تھا۔

ابن تیمیہؒ نے حنبلی روایات میں تربیت حاصل کی۔ اپنے لئے آزادی اجتہاد کا دعویٰ کرتے ہوئے اُس نے فقہی مذاہب کی قطعیت کے خلاف بغاوت کر دی اور کام کو از سرِ نو شروع کرنے کے لئے ابتدائی اصولوں کی طرف رجوع کیا۔ ابن حزم فقہ کے ظاہری مذہب کے بانی کی طرح اس نے بھی حنفیوں کے استقرائی قیاس اور اجماع کے اصول استدلال کو جس رنگ میں آسے فقہائے متقدمین سمجھتے تھے۔ رد کر دیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں اجماع ہی ہر قسم کے توہمات کی بنیاد تھا۔ اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اُس عہد کے اخلاقی اور ذہنی افلاس کے پیش نظر اس کا یہ فعل صحیح تھا۔ سولھویں صدی میں علامہ سیوطیؒ نے اپنے لئے اجتہاد کا دعویٰ کیا اور اس کے ساتھ ہر صدی کے لئے ایک نئے مجدد کے خیال کا اضافہ بھی کر دیا۔ مگر ابن تیمیہؒ کی تعلیمات کی رُوح پورے طور پر اس عظیم الشان تحریک میں جلوہ نما ہوئی جس کا ظہور اٹھارھویں صدی میں نجد کے صحراؤں سے ہوا۔ وہ نجد جو میکڈانلڈ کے نزدیک زوال پذیر اسلامی دُنیا کا پاکیزہ ترین مقام ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو موجودہ اسلامی دُنیا میں یہ زندگی کی پہلی تڑپ ہے۔ جدید ایشیا اور افریقہ کی قریب قریب تمام بڑی بڑی تحریکوں میں سنوسی تحریک۔ پان اسلامک تحریک اور بابی تحریک جو عربی احتجاجیت (PROTESTANTISM) کا ایرانی عکس ہے۔ اس تحریک سے اثر پذیری کے نشانات پائے جاتے ہیں مُصلح اعظم محمد ابن عبد الوہابؒ نے جن کی ولادت ۱۷۰۰ء میں ہوئی، مدینہ میں تعلیم پائی۔ ایران میں پھرتے رہے اور آخر کار اپنی بے تاب رُوح کی آگ تمام اسلامی دُنیا کے اندر پھیلانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی سیمابی رُوح امام غزالی کے شاگرد محمد ابن طومارت ــــ بربری مُصلح اسلام جس نے زوال پذیر اسلامی اُندلس میں پیدا ہو کر اُسے نئی زندگی بخشی ــــ کے مشابہ تھی۔ بہر حال ہمیں اس تحریک کی سیاسی زندگی سے جسے محمد علی پاشا کے عساکر نے ختم کر دیا۔

کوئی تعلق نہیں ہمارے لئے اس تحریک میں جو اہم اور ضروری بات قابلِ ملاحظہ ہے وہ اس کی رُوح خود مختاریت و آزادی کا اظہار ہے اگرچہ داخلی طور پر یہ تحریک بھی ایک طرح سے قدامت پسندانہ ہے۔ یہ تحریک فقہی مذاہب کی قطعیت کے خلاف بغاوت بھی کرتی ہے۔ ذاتی فیصلہ کے حق کا بڑی شدت سے اظہار بھی کرتی ہے لیکن ماضی کے متعلق اس کا نقطہ نگاہ بالکل غیر انتقادی ہے اور فقہی مسائل میں بڑی حد تک یہ احادیث نبوی پر تکیہ کرتی ہے۔

ترکی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ اجتہاد جدید فلسفیانہ خیالات سے قوت اور وسعت حاصل کر کے ایک مدت سے ترکی قوم کے مذہبی اور سیاسی فکر کی تہ میں کام کر رہا ہے۔ یہ بات حلیم ثابت کے "قانونِ محمدی کا نیا نظریہ" سے جس کی بنیاد جدید عمرانی تصورات پر رکھی گئی ہے، صاف ظاہر ہے اگر اسلام کی نشاۃ ثانیہ ایک حقیقت ہے اور میرا یقین ہے کہ ایسا ہی ہے تو ہمیں بھی ایک دن ترکوں کی طرح اپنے ذہنی ورثہ کی قدر و قیمت پھر سے متعین کرنی پڑے گی اور ہم اگر اسلام کے فکر عمومی میں کوئی طبع زاد اضافہ نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا لازمی ہے کہ ہم خوشگوار اعتدال پسندانہ تنقید کے ذریعے اُس تیز رفتار تحریک آزاد خیالی کے خلاف جو اس وقت دُنیائے اسلام میں جاری ہے ایک مُوثر رُکاوٹ پیدا کر دیں۔

اب میں آپ کو ترکی کے مذہبی سیاسی فکر کے متعلق کچھ بتاتا ہوں جس کے ذریعے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ اس ملک کے جدید فکر و عمل میں اجتہاد کی قوت کس کس رنگ میں اپنا مظاہرہ کر رہی ہے کچھ ہی عرصہ پہلے ترکی میں سب سے اہم دو فکری شاہ راہیں تھیں ایک پر وہاں کی قومی پارٹی چل رہی تھی اور دوسری کی نمائندگی "اصلاح مذہب" کی پارٹی

والے کرتے تھے۔ مجلس وطن کی انتہائی دلچسپیوں کا سب سے مقدم نکتہ حکومت ہے، مذہب نہیں۔ ان مفکرین کے نزدیک مذہب اپنی ذاتی حیثیت میں کوئی مستقل وظیفہ نہیں رکھتا۔ قومی حیات میں صرف ریاست ہی ایک حقیقی عامل ہے۔ جو تمام دوسرے عاملین کے وظائف مقرر اور متعین کرتی ہے۔ اس لئے یہ لوگ مذہب اور ریاست کے فرائض و وظایف کے متعلق قدیم خیالات کو رد کرتے ہوئے اُن کی درمیانی خلیج کو وسیع تر کرنے کا باعث ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیئت اسلامیہ ایک مذہبی سیاسی نظام کے لحاظ سے ایسے نظریہ کو جائز سمجھتی ہے اگرچہ ذاتی طور پر میرے نزدیک یہ سمجھ لینا ایک غلطی ہے کہ نظامِ اسلام میں ریاست کا خیال سب سے اہم اور باقی تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں رُوحانی اور دُنیاوی دو ممیز اور جُداگانہ میدان نہیں ہیں۔ بلکہ کسی فعل کی ماہیت خواہ وہ اپنے مفہوم و معانی میں کتنا ہی دُنیاوی کیوں نہ ظاہر ہو فاعل کے اُس دماغی طرزِ فکر سے متعین ہوتی ہے جس کے ساتھ اس کا صدور عمل میں آیا ہے۔ ہر فعل کی سیرت و ماہیت کا تعین آخر کار اُس کے غیر مرئی ذہنی پس منظر ہی سے ہوتا ہے جب کسی فعل کا وقوع زندگی کی لامتناہی پیچیدگی سے علیحدگی کے جذبہ کے ماتحت عمل میں آئے تو وہ دُنیاوی یا ملحدانہ ہے اور اگر اسی پیچیدگی نے اس میں فعلیت کی رُوح پھونکی ہے۔ تو وہ رُوحانی ہے۔ اسلام میں حقیقت ایک ہی ہے جسے اگر ایک نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو مذہبی ادارہ (CHURCH) ہے اور اگر زاویۂ نظر بدل لیں تو ریاست ہے۔ مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذہبی ادارہ (CHURCH) و ریاست ایک ہی چیز کے دو پہلو یا رُخ ہیں۔ اسلام ایک واحد غیر متحلل حقیقت ہے جو آپ کے نقطۂ نظر

کے بدلنے سے یا مذہبی ادارہ ہے اور یا ریاست۔ یہ نکتہ اپنے نتائج کے لحاظ سے نہایت دوررس ہے اور اس کی پوری پوری وضاحت ہمیں دقیق فلسفیانہ بحث میں ڈال دیگی اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ پرانی غلطی 'وحدت آدم' کو دو ممیز اور جدا گانہ حقیقتوں میں تقسیم کر دینے سے واقع ہوئی، جن میں کسی نہ کسی طرح ایک اتصالی نقطہ تو موجود ہے مگر جو اپنے جوہر کے لحاظ سے ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ حقیقت بہر حال یہ ہے کہ اگر زمان مکان (SPACE TIME) تعلق کی نسبت سے دیکھیں تو مادہ روح ہے۔ وہ 'وحدت' جسے انسان کے نام سے پکارا جاتا ہے جب خارجی دنیا میں فعال ہونے کے لحاظ سے دیکھی جائے تو جسم ہے اور جب وہ ایسی فعالیت کے آخری مقصد و منشا کے تعلق سے عمل پیرا نظر آئے تو دماغ یا روح ہے۔ اصول توحید کا جوہر ایک عملی خیال کے لحاظ سے مساوات (EQUALITI) اتحادِ عمل اور آزادی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ریاست ان مثالی اصولوں کو زمانی مکانی قوتوں میں تبدیل کر دینے کی ایک کوشش ہے اور انہیں ایک معین انسانی تنظیم میں متشکل دیکھنے کی آرزوئے بلند۔ اسلام کے نزدیک ریاست صرف انہی معنوں میں ایک مذہبی حکومت ہے اور ان معنوں میں ہرگز نہیں کہ اس کا قائد زمین پر خدا کا ایسا نائب ہوتا ہے جو ہر وقت اپنے مستبد ارادے کو مزعومہ معصومیت کے پردے میں چھپا سکتا ہے۔ اسلام کے نقادوں نے اس نہایت اہم امر کو صرف نظر کر دیا ہے۔ قرآن کے نزدیک حقیقتِ اولی کی ماہیت رُوحانی ہے اور اُس کی حیات اس کی دنیاوی سرگرمی پر مشتمل ہے۔ روح کی سرگرمی و فعالیت انہی فطری، مادی اور دُنیاوی میدانوں میں اپنے لئے مواقع پاتی ہے لہٰذا تمام وہ اشیا جو دنیاوی گنی جاتی ہیں، اپنی اصل و بنیاد کے لحاظ سے مقدس ہیں۔ فکرِ جدید نے اسلام بلکہ تمام مذاہب کی سب سے

بڑی خدمت ان چیزوں پر تنقید کے ذریعے سے کی ہے جنہیں ہم مادی یا فطری کہتے ہیں —
ایک ایسی تنقید جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محض مادی شئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی جب تک
ہم اس کی جڑیں روحانیت میں پیوست نہ پائیں۔ یہ دنیا نجس و ناپاک نہیں ہے مادے
کی یہ عظیم بے پایانی اور وسعت روح کے لئے تکمیل ذات کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ تمام
مقدس زمین ہے۔ جیسا کہ رسول اللہؐ نے نہایت موزوں الفاظ میں فرمایا ہے" یہ ساری دنیا ایک
مسجد ہے"۔ اسلام کے نزدیک ریاست صرف روحانی کو انسانی تنظیم میں متشکل دیکھنے
کی ایک کوشش ہے لیکن ان معنوں میں وہ تمام ریاستیں مذہبی ریاستیں ہیں جن کی بنیادیں
محض غلبہ و اقتدار پر نہیں۔ اور جو مثالی اصولوں کی عملی صورت پذیری کے لئے کوشش
کرتی ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ ترکی قوم پرستوں نے دین و دنیا کے جدا جدا ہونے کا خیال یورپ
کی تاریخ افکار سیاسی سے جذب و اخذ کیا ہے۔ قدیم عیسائیت کی بنیاد ایک سیاسی یا
مدنی واحدے کی حیثیت میں نہیں رکھی گئی تھی بلکہ اس نجس و ناپاک دنیا میں اس کی صورت
ایک خانقہی سلسلے کی تھی جس کا ملکی امور سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جو عملی طور پر تمام
امور میں رومی حاکمیت و اقتدار کو قبول و تسلیم کئے ہوئے تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت
کے عیسائی ہو جانے پر کلیسا و حکومت دو جداگانہ طاقتوں کی حیثیت میں اقتدار و اختیار
کی خاطر ایک دوسرے کے حریف بن گئے ایسی صورت حال اسلام میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتی
تھی اس لئے کہ اس کی ابتداء ہی ایک مدنی سوسائٹی کی شکل میں ہوئی جو قرآن کے
سیدھے سادے قانونی اصولوں کی سرمایہ دار تھی۔ یہ اصول رومیوں کے بارہ قوانین
کی مانند جیسا کہ بعد کے تجربے نے پورے طور پر ثابت کر دیا تشریحی اور توضیحی اعتبار سے

اپنے اندر نشوو ارتقا کی عظیم صلاحیتیں پوشیدہ رکھتے تھے لہٰذا قوم پرستوں کا نظریہ ریاست اس لحاظ سے غلط ہے کہ وہ اسلام میں ایک ایسی ثنویت کو مانتا ہے جس کا وہاں کوئی وجود نہیں۔

اس کے برعکس سعید حلیم پاشا کی مجلسِ اصلاح مذہب اس بنیادی حقیقت پر زور دیتی تھی کہ اسلام تصوریت اور ایجابیت کی ہم آہنگی کا نام ہے اور آزادی، مساوات اور اتحاد فکر و عمل کی غیر فانی سچائیوں کی وحدت کے لحاظ سے اس کا کوئی مخصوص وطن نہیں ہے جس طرح کوئی انگریزی علم ریاضی، جرمن علم ہیئت اور فرانسیسی علم کیمیا کا وجود نہیں اسی طرح ترکی کا یہ وزیر اعظم کہتا ہے کوئی ترکی، عربی، ایرانی یا ہندوستانی اسلام نہیں ہے جس طرح علمی حقائق کی عالمگیر سیرت اُن گوناگوں مبنی بر سائنس قومی تمدنوں کو جنم دیتی ہے جو اپنی کلی حیثیت میں علم انسانی کے مظہر ہوتے ہیں بالکل اسی طرح اسلامی حقائق کی عالمگیر سیرت مختلف النوع قومی اخلاقی اور اجتماعی مقاصد کی تخلیق کرتی ہے۔ اس تیز بیں نقاد کی نظروں میں جدید تہذیب جس کی بنیادیں قومی خود پسندی پر استوار ہیں محض بربریت کی ایک شکل ہے۔ یہ تہذیب ایک حد سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتیت (INDUSTRIALISM) کا نتیجہ ہے جس کے اندر انسان اپنی غیر مہذب جبلتوں اور رجحانات کو تسکین دیتے ہیں سعید حلیم پاشا بہرحال اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ تاریخی واقعات کی رفتار کے دوران میں اسلام کے اخلاقی اور اجتماعی مقاصد کا مفہوم مقامی سیرت و کردار اور مسلم اقوام کے قبل اسلامی توہمات کے زیر اثر بتدریج بگڑ گیا ہے آج یہ مقاصد اسلامی ہونے کی بجائے زیادہ تر ایرانی، ترکی، یا عربی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اصولِ توحید کی بے داغ پیشانی پر کم و بیش بت پرستی کی مہر ثبت کر دی گئی ہے اور اسلام کے معیاروں کی غیر شخصی اور عالمگیر سیرت عملی

مقامیت کی روش میں کھو کر رہ گئی ہے۔ اب ہمارے لئے صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ ہم اسلام کے جسم سے ان غلافوں کو نوچ نوچ کر علٰحدہ کر دیں جنہوں نے ایک حرکی نظریہ حیات کو ساکن وجامد بنا رکھا ہے اور پھر سے آزادی، مساوات اور متحد العملی کی ازلی سچائیوں کو معلوم و دریافت کر کے اُن کی اصلی سادگی اور عالمگیری کی روشنی میں اپنے اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی نصب العینوں کو از سرِ نو تعمیر کریں" یہ ہیں وزیر اعظم ترکیہ کے خیالات۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک ایسی راہ فکر اختیار کر کے جو روحِ اسلام سے ہم آہنگ ہے سعید حلیم پاشا عملاً اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جو مجلس قومی کا مطمح نظر ہے یعنی موجودہ تجربہ اور فکر جدید کی روشنی میں قانونِ شریعت کو از سرِ نو مرتّب و مدوّن کرنے کے لئے آزادئ اجتہاد۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ مجلس کبیر ملّی نے اجتہاد کی طاقت کو ادارۂ خلافت کے ضمن میں کس طرح برتا ہے سُنّی فقہ کی رُو سے امام یا خلیفہ کا تقرّر قطعاً لازمی ہے اس خصوص میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خلافت ایک فردِ واحد کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے؟ ترکی کا اجتہاد یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رُوح کے مطابق خلافت یا امامت چند ایک افراد کی جماعت یا مجلس منتخبہ کے ہاتھوں میں سونپ دی جا سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے مصر و ہندوستان کے علمائے فقہ نے ابھی تک اس مسئلے پر اظہار رائے نہیں کیا۔ ذاتی طور پر میرا یقین ہے کہ ترکی کا یہ نقطۂ نظر بالکل صحیح اور معقول ہے۔ اس مسئلے پر مشکل کسی بحث وتمحیص کی گنجائش ہے۔ جمہوری طرزِ حکومت نہ صرف اسلامی روح کے مطابق ہے بلکہ عالمِ اسلام میں جن نئی قوتوں کو موجود کر دیا گیا ہے ان کے پیش نظر یہ ایک ضرورت بن گئی ہے۔

ترکی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے آیئے ہم ابن خلدون یعنی اسلام کے اوّلین فلسفی

مؤرخ کی رہنمائی حاصل کریں۔ ابن خلدون اپنے مشہور مقدمہ میں عالمگیر اسلامی خلافت کے تصور کے متعلق تین متمیز نظریات کا ذکر کرتا ہے (۱) عالمگیر خلافت ایک الہامی ادارہ ہے اور اس لئے ناگزیر (۲) یہ محض ایک مصلحتی امر ہے (۳) ایسے ادارے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ آخری نظریہ اہل خوارج کا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جدید ترکی پہلے نظریے سے دوسرے نظریے پر ہٹ آئی ہے۔ یعنی فرقہ معتزلہ کے نظریے پر جن کے نزدیک عالمگیر خلافت محض ایک مصلحتی امر ہے۔ ترکوں کی دلیل یہ ہے کہ سیاسی تفکر میں ہمیں اپنے گزشتہ سیاسی تجربے سے راہنمائی حاصل کرنی چاہئے جو بلا کسی غلطی کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ دُنیا نے عمل میں عالمگیر خلافت کا نظریہ ناکام ہو چکا ہے۔ یہ تصور اُسی وقت تک کارآمد تھا جب تک اسلامی سلطنت قائم اور محفوظ تھی جب سے اس سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوا ہے آزاد سیاسی واحدے پیدا ہو گئے ہیں اس تصور کی عملیت کھو چکی ہے اور یہ جدید اسلام کی تنظیم میں ایک زندہ عنصر کی شکل میں کام نہیں دے سکتا۔ درحقیقت یہ تصور کسی مفید و کارآمد مقصد کی سربرآری کی بجائے اُلٹا آزاد مسلمان ریاستوں کے اتحاد کی راہ میں ایک رُکاوٹ بن گیا ہے۔ ایران مسئلہ خلافت میں اپنے اختلاف عقائد کے پیش نظر ترکی سے الگ الگ رہا ہے مراقش انہیں ہمیشہ شک وشبہ کی نظروں سے دیکھتا رہا ہے اور عرب ذاتی امنگوں اور خانگی اغراض کو دل میں پالتا رہا ہے اور اسلام کے اندر یہ سارے مناقشات صرف ایک ایسے نشان طاقت کی خاطر جس کی طاقت کبھی کی چھن چکی ہے۔ وہ اس بات پر مزید بحث کرتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ کیوں نہ ہم بھی اپنے گزشتہ سیاسی تجربے سے سبق سیکھیں؟ قریش اپنے سیاسی زوال پر جب اس قابل نہ رہے کہ عالم اسلام پر اپنی سیادت قائم رکھ سکیں تو کیا قاضی

ابوبکر باقلانی نے ان تجربی حقائق کے پیشِ نظر خلیفہ میں قریشی ہونے کی شرط کو اڑا نہیں دیا تھا ؟ کئی سو سال پہلے ابن خلدون جو ذاتی طور پر خلیفہ کے لئے قریشی ہونے کی شرط کو ضروری سمجھتا تھا، قریب قریب اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتا ہے ۔ ابن خلدون کہتا ہے :-

اس لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ جس ملک میں جو شخص سب سے زیادہ طاقتور ہے وہاں اُسے امام کی حیثیت میں قبول کر لیا جائے"۔ اس طرح ابن خلدون واقعات کی سخت منطق کو محسوس کرتے ہوئے ایک ایسی تجویز پیش کرتا ہے، جسے ہم اسلام کے اس بین الاقوامی منظر کی پہلی دھندلی تصویر کہہ سکتے ہیں جو آج بڑی حد تک ہماری نظروں کے سامنے ہے یہ ہے جدید ترک کا طرزِ خیال ۔ اُس کا دل و دماغ تجربی صداقتوں سے فیضیاب ہے ۔ اُن فقہاء کے مدرسی طریقہ استدلال سے نہیں جو زندگی کے مختلف حالات میں سانس لیتے اور سوچتے تھے ۔

میرے خیال میں اگر ان دلائل کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو یہ ایک ایسے بین الاقوامی نصب العین کے ظہور کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو اگرچہ عین اسلام ہے مگر اب تک ابتدائی صدیوں کی عربی شہنشاہیت کے بوجھ تلے دبا رہا ہے یہ نیا نصب العین ترکی کے مشہور شاعر ضیا کے کلام میں واضح طور پر جھلک رہا ہے اس شاعر کے گیتوں نے جو آگسٹس کامٹے کے فلسفہ سے فیضیاب ہیں ترکی کے موجودہ خیالات کو ڈھالنے میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے ۔ میں یہاں پروفیسر فشر کے جرمن ترجمے سے اس کی ایک نظم کا خلاصہ

پیش کرتا ہوں :-

"حقیقی طور پر اسلام کی ایک مؤثر سیاسی وحدت پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلے تمام اسلامی ممالک کو آزادی و خود مختاری حاصل کرنی چاہئے اور پھر اپنی اجتماعی حیثیت میں انہیں ایک خلیفہ کے گرد جمع ہونا چاہئے۔ کیا اس وقت یہ بات ممکن ہے؟ اگر آج ایسا نہیں تو ہمیں انتظار کرنا چاہئے۔ اس دوران میں خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے گھر میں نظم و انضباط پیدا کرے اور ایک جدید کارآمد ریاست کی بنیادیں رکھے بین الاقوامی دنیا میں کمزور کے لئے کوئی جگہ نہیں صرف طاقت ہی عزت کی مستحق ہے۔"

ان سطور سے جدید اسلام کے رجحان کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے فی الحال جب تک تمام مسلم اقوام اتنی طاقتور اور مضبوط نہیں ہو جاتیں کہ ایک زندہ جمہوری خاندان کو معرض وجود میں لا سکیں اُس وقت تک چاہئے کہ ہر ایک اپنی ہی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب جائے اور ہنگامی طور پر اپنی تمام تر توجہ کا محور و مرکز اپنے آپ ہی کو قرار دے لے۔ قوم پرست مفکرین کے نزدیک ایک سچی اور زندہ وحدت کا قیام اتنا آسان نہیں ہے کہ محض ایک نام کی قیادت عظمیٰ کے ذریعے عمل میں آ سکے حقیقی طور پر اس کا اظہار ان آزاد و خود مختار واحدوں کی کثرت میں ہوتا ہے جن کی نسلی رقابتیں ایک مشترک روحانی امنگ کے رشتۂ اخوت و وحدت کے توسط سے باہمی توافق اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ خدا آہستہ آہستہ ہمیں اس حقیقت کا احساس کرا رہا ہے کہ اسلام نہ تو قومیت ہے اور نہ ہی شہنشاہیت بلکہ اقوام کی ایک جمعیت ہے جو مصنوعی حدود اور نسلی امتیازات کو محض آسانی حوالہ و تعارف کے لئے جائز سمجھتی ہے نہ اس لئے کہ اپنی شریک جمعیت اقوام پر عمرانی میدان کو تنگ اور محدود کر دے۔

اس شاعر کی نظم موسومہ مذہب و سائنس کا ایک ٹکڑا اس عام مذہبی نظریہ پر روشنی ڈالیگا جو بتدریج موجودہ اسلامی دنیا میں متشکل ہو رہا ہے۔

"نوعِ انسانی کے اوّلین روحانی رہبر کون تھے!

" یقیناً یہ مقدس انسان اور پیغمبر ہی تھے۔ ہر دَور میں مذہب فلسفہ کا رہبر و قائد رہا ہے۔ اَدب و اخلاق اُسی سے حرارت و زندگی حاصل کرتے رہے ہیں لیکن مذہب میں کمزوری آجاتی ہے اس کے ابتدائی جوش و خروش کا شعلہ اوس کھا جاتا ہے۔ مقدس انسان غائب ہوجاتے ہیں اور نام کی رُوحانی قیادت علمائے فقہ کی وراثت بن جاتی ہے۔ اِن فقہا کے لئے روایت قطب نما ہے۔ یہ مذہب کو اسی راہ پر گھسیٹتے ہیں لیکن فلسفہ کہتا ہے میری رہنما عقل ہے تم دائیں طرف جاؤ میں بائیں طرف جاتا ہوں۔

مذہب و فلسفہ دونوں انسان کی رُوح پر ہاتھ ڈالتے ہیں ایک اُسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسرا اپنی طرف،

یہ کشمکش جاری ہے۔ گا ہجن تجربہ ایجابی علم کو جنم دیتا ہے اور یہ جوان سال رہبر فکر فیصلہ سُناتا ہے " روایت تاریخ ہے اور عقل اسلوب تاریخ دونوں ایک ہی غیر معروف غیر مشخص حقیقت کے متلاشی ہیں اور اسی کی وضاحت میں کوشاں،

لیکن یہ غیر معروف غیر مشخص حقیقت ہے کیا؟

کیا یہ رُوحانیت سے مستنیر دل تو نہیں!

اگر بات یہی ہو تو پھر میرا آخری فیصلہ سُن لو ــــ مذہب ایجابی علم ہے جس کا مقصد انسانی دل کو روحانیت سے مستنیر کرنا ہے "

یہ بات اُوپر کے مصرعوں سے واضح ہے کہ شاعر نے ترقی ذہنِ انسانی کے تین یعنی دینیاتی - مابعد الطبیعاتی اور سائنٹیفک مدارج کو کامٹے کی تعلیمات سے اخذ کر کے کس خوبصورتی کے ساتھ اسلام کے مذہبی نظریہ میں سمو دیا ہے۔ اور مذہب کا یہی نظریہ جو مندرجہ سطور میں پیش کیا گیا ہے ترکی کے نظامِ تعلیم میں عربی کی حیثیت کے متعلق شاعر کے طرزِ عمل کو متعین کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے!

"وہ سرزمین جہاں صدائے اذان ترکی میں گونجتی ہے اور جہاں عبادت کرنے والے اپنے مذہب کے معانی کو سمجھتے ہیں، وہ زمین جہاں قرآن ترکی میں پڑھا جاتا ہے جہاں ہر شخص کیا چھوٹا کیا بڑا پوری طرح خُدا کے احکام کو جانتا ہے اے فرزندِ ترکی وہی سرزمین تمہاری مادرِ وطن ہے"

اگر مذہب کا مقصد دل کو رُوحانیت سے مستنیر کرنا ہے تو پھر اُسے انسانی رُوح کی گہرائیوں میں غوّاصی کے سوا چارہ نہیں اور شاعر کے نزدیک بہترین صُورت میں ایسا اُسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ رُوحانی خیالات جن سے دل کی ماہیت بدل جاتی ہے انسان کی اپنی مادری زبان میں پیش کئے جائیں۔ ہندوستان میں بہت سے اشخاص دینی امور میں عربی کی بجائے ترکی کے اس استعمال کی ملامت کریں گے۔ شاعر کا یہ اجتہاد اُن وجوہات کے پیشِ نظر جو بعد میں دی جائیں گی نہایت اہم اعتراضات کے لئے کھلا ہے۔ لیکن ہمیں اتنا ضرور ماننا پڑیگا کہ شاعر کی یہ مجوّزہ اصلاح گذشتہ تاریخ اسلام میں بغیر مثال کے نہیں ہے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جب محمد ابن تومرت — اندلسی مہدی — نے جو قومیت کے لحاظ سے بربر تھا، طاقت حاصل کر کے موحّدین کی حکومت قائم کی تو اُس نے اَن پڑھ بربروں کی خاطر حکم دیدیا کہ قرآن کا ترجمہ بربر زبان میں کردیا جائے اور اس کی تلاوت بھی

اسی زبان میں ہو اور یہ کہ اذان بربری زبان میں دی جائے اور تمام علمائے دین بربری زبان سے واقفیت حاصل کریں۔

ایک اور ٹکڑے میں یہی شاعر نسائیت کے متعلق اپنے نصب العین کی وضاحت کرتا ہے وہ مرد و عورت کو مساوی و ہم رتبہ دیکھنے کے جوش میں اسلام کے قانونِ خاندان میں اس کے موجودہ مفہوم اور عمل کے اعتبار سے اساسی تبدیلیاں چاہتا ہے۔

"یہ ہے عورت میری ماں، میری بہن، میری بیٹی۔ یہی ہے جو میری روح کی گہرائیوں سے مقدس ترین جذبات کو ابھارتی ہے۔ وہ ہے میری معشوقہ! میرا سورج، میرا چاند، میرا ستارہ۔ اسی کی ذات ہے جس کے ذریعے میں زندگی کی شعریت کو سمجھتا ہوں خدا کا قانون کس طرح ان خوبصورت ہستیوں کو قابلِ نفرت و حقارت مخلوق سمجھ سکتا ہے یقیناً قرآن کی توضیح و تشریح میں عالموں نے غلطی کھائی ہے۔

قوم اور ریاست کی بنیاد خاندان ہے۔

جب تک عورت کی صحیح قدر و قیمت نہیں پہچانی جاتی قومی زندگی نامکمل رہتی ہے۔

خاندان کی نشو و پرورش کو عدل و انصاف کے ساتھ مطابقت کھانی چاہئے لہذا تین چیزوں یعنی طلاق علیحدگی اور وراثت میں مساوات ضروری ہے جب تک وراثت میں عورت کو نصف اور ازدواجی لحاظ سے اُسے ایک چوتھائی کا حصہ دار شمار کیا جاتا ہے ملک و خاندان کی ترقی و سربلندی ممکن نہیں۔

دوسرے حقوق کے لئے ہم نے انصاف کی قومی عدالتیں کھول رکھی ہیں۔ اس کے برعکس ہم نے خاندان کو مدرسوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا ہے میں نہیں جانتا کہ کیوں ہم نے عورت کو یوں بے دست و پا کر رکھا ہے۔ کیا وہ ملک کے لئے کام نہیں

کرتی؟ یا پھر کیا وہ اپنی سوزن کو نیزہ بنانے میں تبدیل کر کے انقلاب کے ذریعے ہمارے

ہاتھوں سے اپنے حقوق چھین لے گی؟

حقیقت یہ ہے کہ مسلم اقوام میں سے صرف ترکی نے عقیدہ پرستی کی گہری نیند سے انگڑائی لی ہے اور شعور ذات کو حاصل کیا ہے۔ اسی نے اپنی آزادی کا دعویٰ کیا ہے اسی نے تصوریت سے حقیقت کی طرف انتقال کیا ہے جو شدید ذہنی اور اخلاقی کشمکش کے بغیر ممکن نہیں اس کے لئے حرکت اور وسعت پذیر زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیاں یقینی طور پر نئی وضعیتیں پیدا کریں گی اور یہ وضعیتیں نئے نقاط نظر سجھائیں گی۔ اور اُن اصول و قوانین کی جدید تشریح ضروری ہو جائیگی جو ایک ایسی قوم کے لئے محض علمی دلچسپی کا سامان ہیں جس نے روحانی ترقی کی مسرت کبھی محسوس نہیں کی۔ میرے خیال میں یہ انگریزی مفکر ہابز (HOBBES) ہے جس نے اس عمیق رائے کا اظہار کیا ہے کہ "اگر کسی ذہن میں مسلسل ایک ہی قسم کے خیالات و جذبات اُٹھتے رہیں تو در اصل وہ ذہن خیالات و جذبات سے بالکل عاری ہے"۔ آج بہت سے مسلم ممالک کی یہی حالت ہے۔ وہ طوطے کی طرح پرانی اقدار کو دُہرا رہے ہیں جب کہ ترک نئی اقدار تخلیق کرنے کی راہ پر گامزن ہے عظیم تجربات نے اس پر اپنی ذات کی گہرائیوں کو عیاں کر دیا ہے زندگی نے اس کے وجود میں حرکت شروع کر دی ہے وہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تازہ آرزوؤں کو جنم دے رہی ہے۔ نئی مشکلات پیدا کر رہی ہے اور نئی تشریحات سجھا رہی ہے۔ آج جو سوال اُسے درپیش ہے اور جو مستقبل قریب میں دوسرے اسلامی ممالک کو پیش آنے والا ہے یہ ہے، کہ آیا قانونِ اسلام ارتقا پذیر ہے؟ اس سوال کو حل کرنے کے لئے بہت بڑی ذہنی کوشش کی ضرورت ہے اور یقینی طور پر اس کا جواب اثبات ہی میں ہے بشرطیکہ دنیائے اسلام انداز فاروقی میں اس پر نگاہ ڈالے ---- فاروق اسلام کا پہلا تنقیدی اور آزاد مفکر جس کی خلاقی

جرأت پیغمبر کے عین آخری وقت میں یہ غیر معمولی الفاظ کہنے سے باز نہ رہ سکی کہ "قرآن ہمارے لئے کافی ہے۔"

ہم جدید اسلام میں تحریک آزاد خیالی کا خیر مقدم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بات بھی ماننی پڑیگی کہ آزاد خیالی کا ظہور تاریخ اسلام میں ایک نازک ترین لمحہ کو تشکیل دیتا ہے آزاد خیالی میں ایسا رجحان موجود ہے جس سے یہ ایک انتشاری قوت کی حیثیت میں عمل کرتی ہے اور نسلی خیال جو اس وقت عالمِ اسلام میں زن دگنی قوت سے مصروفِ عمل نظر آتا ہے آخر کار اس انسانی وسیع النظری کو ختم کر دے سکتا ہے جو مسلمان اقوام نے اپنے مذہب سے اخذ و جذب کی ہے۔ دوسرے ہمارے مذہبی اور سیاسی مصلحین کے لئے اپنے جوان شوق کی بے عنانی کے باعث آزاد خیالی کی رَو میں اصلاح کی مناسب و موزون حدود کو پھاند جانے کا احتمال ہے۔

ہم آج جس دَور میں سے گزر رہے ہیں وہ یورپ کے احتجاجی انقلاب (PROTESTANT REVOLUTION) سے مشابہ ہے اور ہمیں لوتھر کی تحریک کے آغاز اور اس کے نتیجہ سے جو سبق ملتے ہیں انہیں صرف نظر نہ کرنا چاہیئے۔ تاریخ کا غامض مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ تحریک اصلاح حقیقت میں ایک سیاسی تحریک تھی جس کا نتیجہ یورپ میں یہ ہوا کہ قومیت کے اخلاقی نظاموں نے تدریجی طور پر عیسائیت کے عالمگیر نظامِ اخلاق کی جگہ لے لی۔ اس میلان کا نتیجہ ہم اپنی آنکھوں سے یورپ کی جنگ عظیم میں دیکھ چکے ہیں جس نے دو متحارب اخلاقی نظاموں کا کوئی کارآمد حل پیش کرنے کی بجائے یورپ کی وضعیت کو اور بھی ناقابلِ برداشت بنا دیا ہے آج دنیائے اسلام کے رہبروں کا یہ فرض ہے کہ وہ یورپ میں جو کچھ ہو چکا ہے اُس کے حقیقی معنوں کو سمجھیں اور پھر پورے پورے ضبط اور دقتِ نظری کے ساتھ نظامِ اجتماعی کے لحاظ سے اسلام کے بنیادی مقاصد کی طرف حرکت کریں۔

میں نے آپ کے سامنے جدید اسلام میں تاریخ اجتہاد اور اس کے عمل کا تھوڑا سا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ اب میں یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ آیا قانونِ اسلام کی تاریخ اور اس کی ہیئت و ساخت میں اس قسم کا کوئی امکان موجود ہے جس سے اس کے اصولوں کی از سرِ نو تشریح کی جا سکے۔ دوسرے الفاظ میں جو سوال میں اُٹھانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ آیا قانونِ اسلام میں ارتقا کی صلاحیت موجود ہے؟ ہارٹن (HORTEN) بون (BONN) یونیورسٹی میں سامی زبانوں کا ماہر لسانیات اسلامی فلسفہ اور دینیات کے ضمن میں یہی سوال اُٹھاتا ہے خالص مذہبی فکر کے دائرے میں مسلم مفکرین کے کام پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ "تاریخ اسلام کی نہایت موزوں تصویر ان الفاظ میں کھینچی جا سکتی ہے کہ وہ دو جداگانہ اور ممیز قوتوں کے تدریجی تفاعل، ہم آہنگی اور باہمی گھلاوٹ کا نام ہے یعنی آریائی تہذیب اور علوم کا عنصر ایک طرف اور سامی مذہب دوسری طرف مسلمان ہمیشہ اپنے مذہبی زاویہ نگاہ کو ان تہذیبی عناصر کے ساتھ تطبیق دینے میں کامیاب رہا ہے جنہیں وہ اپنی ہمسایہ اقوام سے اخذ و جذب کرتا رہا ہے۔ ہارٹن (HORTEN) کے بیان کے مطابق ۸۰۰ء سے ۱۱۰۰ء تک اسلام میں ایک سو سے زائد دینیاتی نظام پیدا ہوئے۔ یہ امر اسلامی فکر کی لچک اور ہمارے ابتدائی مفکرین کی پیہم و لگاتار کوششوں پر کافی سے زیادہ دلیل ہے۔ اس طرح اسلامی ادب کے گہرے مطالعے نے جن حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے اُن کے پیش نظر یورپ کا یہ زندہ مستشرق مندرجہ ذیل نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

"اسلامی تعلیمات کی رُوح اس قدر وسیع ہے کہ عملی طور پر اس کا احاطہ ناممکن ہے۔ صرف ملحدانہ خیالات کو چھوڑ کر اس نے اپنی ہمجوار اقوام کے تمام قابل حصول خیالات

کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے اور انہیں اپنی خاص وضع و شکل دے دی ہے "

قانون کے دائرے میں اسلام کی یہ انجذابی روح (ASSIMIPATIVE)

اور بھی زیادہ آشکار ہے۔ پروفیسر ہرگرونجے (HURONIE) اسلام کا ولندیزی نقاد کہتا ہے " جب ہم اسلامی قانون کی تاریخ ترقی پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف تو ہر دور کے فقہا ذراسی تحریک پر ایک دوسرے کی تکفیر تک جا پہنچتے ہیں اور دوسری طرف یہی لوگ زیادہ سے زیادہ وحدت مقصد کے ساتھ اپنے متقدمین فقہا کے اسی قسم کے تنازعات میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں" اسلام کے ان جدید ناقدین کے نظریات سے صاف ظاہر ہے کہ نئی زندگی کے ابھرنے پر اسلامی تعلیمات کی خالص اور غیر متعصب روح کا اعلان و اظہار ہمارے فقہا کی شدید قدامت پسندی کے باوجود ناگزیر ہے اور میرا یقین ہے کہ وسیع و عظیم ادب فقہ کا زیادہ گہرا مطالعہ جدید مؤرخ کو اپنی اس سطحی رائے کے بدلنے پر مجبور کردے گا کہ قانون اسلام سکونی اور ناقابل ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک اس ملک کے قدامت پرست مسلم عوام فقہ کی تنقید کے لئے پورے طور پر تیار نہیں ہیں اور اگر اس قسم کی تنقید کی جائے تو یقین ہے کہ اکثر لوگ برہم ہو جائیں گے۔ اور فرقائی اختلافات پھوٹ نکلیں گے پھر بھی زیر نظر مسئلہ پر میں چند باتیں کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلی بات جو ہمیں مدنظر رکھنی چاہئے یہ ہے کہ عہد نبویؐ سے لے کر دور عباسیہ کے آغاز تک قرآن حکیم کے سوا اسلامی قانون تحریری شکل میں موجود نہیں تھا۔

(۲) دوسری قابل ملاحظہ بات یہ ہے کہ پہلی صدی کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے آغاز تک اسلام میں قریب قریب انیس فقہی مذاہب (SCHOOLS) و آراء کا ظہور ہوا۔

یہی ایک واقعہ اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ ایک بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تہذیب کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہمارے ابتدائی فقہا نے کس طرح پیہم لگاتار محنت سے کام لیا۔ فتوحات کا پھیلاؤ اور نتیجۃً اسلامی نظر میں پیدا شدہ وسعت نے ان ابتدائی فقہا کو مجبور کر دیا کہ وہ اشیاء کو وسیع النظری کے ساتھ دیکھیں۔ اور جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے ان کے مقامی حالات زندگی اور عادات و خصائل کا مطالعہ کریں۔ مختلف فقہی مذاہب (SCHOOLS) کو اگر ہم اُس عہد کی عمرانی اور سیاسی تاریخ کی روشنی میں بنظرِ غائر دیکھیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ فقہا اپنی تشریحی کوششوں میں بتدریج استخراجی اسلوب (DEDUCTIVE) سے ہٹ گئے، اور استقرائی اسلوب (INDUCTIVE) پر جا پہنچے۔

(۳) تیسرے جب ہم اسلامی قانون کے چار مسلمہ ماخذوں اور ان سے پیدا شدہ اختلافات کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمارے تسلیم شدہ مذاہب فقہ کی مزعومہ صلابت کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اور ارتقائے مزید کا امکان صاف صاف نظروں کے سامنے آجاتا ہے آیئے ہم ان ماخذوں پر اجمالی حیثیت میں ایک نظر ڈالیں۔

قرآن:- اسلامی قانون کا اولین ماخذ قرآن حکیم ہے۔ مگر یہ کتاب تعزیرات نہیں ہے بلکہ جیسا میں پہلے کسی جگہ کہہ آیا ہوں اس کا سب سے اہم مقصد انسان کے اندر خدا و کائنات کے ساتھ اس کے رشتہ و تعلق کے اعلیٰ تر احساس کی بیداری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن میں قانونی طرز کے چند ایک اصول و احکامات موجود ہیں۔ خصوصی طور پر وہ جن کا تعلق خاندان یعنی اجتماعی زندگی کے مرکزی اساس سے ہے مگر کیوں ان قوانین کو ایسے الہام کا ایک جزو بنا دیا گیا، جس کا آخری مقصد حیات انسانی کا اعلیٰ تر درجہ ہے؟ اس سوال کا جواب عیسائیت کی تاریخ میں مضمر ہے جو یہودیوں کی قانون پرستی کے خلاف ایک بغاوت

احتجاج کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زندگی پر روحانی رنگ چڑھانے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن اس کی انفرادیت انسان کے اجتماعی تعلقات کی پیچیدگی میں کوئی روحانی قدر و قیمت نہ دیکھ سکی۔ نامن (NAUMANN) اپنی کتاب (BRIEFUBERELiION) میں لکھتا ہے کہ قدیم عیسائیت کی نظروں میں ریاست قانون تنظیم اور پیداوار کی کوئی قیمت نہیں یہ انسانی سوسائٹی کے حالات پر نظر ڈالنا گوارا ہی نہیں کرتی۔ اور یہی لکھنے والا نتیجہ نکالتے ہوئے کہتا ہے "اس لئے یا تو ہمیں ریاست کے بغیر ہی زندہ رہنے کی جرأت کرنی ہے اور اس طرح سوچتے سمجھتے اپنے آپ کو نوسویت (ANARCHY) کی آغوش میں ڈال دینا ہے اور یا پھر اپنے مذہبی عقیدہ کے ساتھ ساتھ ایک الگ سیاسی مسلک پر بھی ایمان لانے کا فیصلہ کرنا ہے"۔ لہٰذا قرآن اس بات کو ضروری سمجھتا ہے کہ مذہب و ریاست اور اخلاق و سیاست کو ایک ہی وحی میں سمو دے بالکل اسی رنگ میں جس طرح افلاطون نے ان حقائق کو اپنی کتاب ریاست میں یکجا کر دیا ہے

اس ضمن میں سب سے اہم اور قابل ملاحظہ امر قرآن کا حرکی نقطہ نظر ہے میں اس کے مبداء اور تاریخ پر تفصیلی بحث کر آیا ہوں یہ صاف ظاہر ہے کہ حرکی نقطہ نگاہ رکھتے ہوئے کتاب مقدس ارتقا کے خلاف نہیں ہوسکتی۔ ہمیں صرف یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ زندگی خالی خولی تغیر ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بقائی و دوامی عناصر بھی موجود ہیں اپنے تخلیقی عمل سے محظوظ ہوتے ہوئے اور اپنی ساری طاقتوں کو زندگی کے نئے مناظر کی دریافت پر مرتکز کرتے ہوئے انسان اپنی ہی رونمائی کے حضور میں ایک قسم کی بے چینی محسوس کرتا ہے وہ اپنی پیش قدمی کے دوران میں ماضی کی طرف دیکھنے پر مجبور رہے۔ اور اپنی ہی داخلی گہرائی اور وسعت کا سامنا ایک خاص حد تک سہمتے ہوئے کرتا ہے انسانی روح اپنی

پیش قدمی میں ان قوتوں سے رُک جاتی ہے۔ جو سمت مخالف میں عمل پیرا نظر آتی ہیں۔ یہی بات ایک مختلف پیرایہ بیان میں یوں کہی جاسکتی ہے کہ زندگی ماضی کا بوجھ پیٹھ پر اُٹھائے ہوئے حرکت کرتی ہے معاشری انقلاب کا کوئی سانظریہ کیوں نہ ہو، اس میں قدامت پسندی کی طاقتوں کے وظائف اور ان کی قدروقیمت سے اغماض نہیں برتنا چاہئے جدید عقلیت کو چاہئے کہ قرآن کی اصلی تعلیمات کو اسی ترکیبی وکیمیائی بصیرت کے ساتھ دیکھتے ہوئے ہمارے موجودہ اداروں کو سمجھنے کی کوشش کرے کوئی بھی قوم اپنے ماضی کو پورے طور پر رد نہیں کرسکتی کیونکہ یہ ماضی ہی ہے جس سے اس کی ذاتی شناخت ہوتی ہے اور اسلام جیسی سوسائٹی میں قدیم اداروں پر نظرثانی کا مسئلہ اور بھی نازک ہوجاتا ہے اور مصلح کی ذمہ داریاں گراں تر صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ اسلام اپنی سیرت وکردار میں غیرمقامی ہے اور اس کا مقصد انسانیت کے آخری فیصلہ کن اتحاد کیلئے ایک ایسا نمونہ پیش کرنا ہے جس کے متبعین متعدد اور باہم متخالف نسلوں سے لئے گئے ہوں اور پھر اس جوھری مجموعہ (ATOMIC-AGGREGATE) کو ایک ملت میں منقلب کردینا ہے جس کا خاصتاً ایک اپنا شعور ذات ہو۔ اس کام کی تکمیل کچھ آسان نہیں تھی۔ پھر بھی اسلام اپنے عمدگی سے سوچے ہوئے اداروں کے ذریعے اس رنگا رنگ گروہ میں سے ایک قسم کے اجتماعی ارادہ وضمیر کی تخلیق میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوگیا ہے ایسی سوسائٹی کے ارتقا میں کھانے پینے۔ پاکی وناپاکی کے بے ضرر معاشری قوانین کی غیر متبدل نوعیت بھی اپنے اندر ایک حیاتی قدروقیمت رکھتی ہے اور یہ اس لئے کہ ایسے قوانین نہ صرف اس قسم کی سوسائٹی کو ایک خاص وحدت بخشتے ہیں بلکہ خارجی وداخلی یگانگت وہم آہنگی کی وہ صفت پیدا کردیتے ہیں جن سے بوقلمونیت (HETROGENEITY) کی ان قوتوں کا ردعمل ہوسکتا ہے جو ہمیشہ ایک مرکب قسم کی سوسائٹی میں پوشیدہ ہوتی ہیں لہذا ان اداروں کے ناقد کے

لئے ضروری ہے کہ اس ضمن میں کچھ کہنے سے پیشتر اسلام کے اجتماعی تجربہ کی اہمیت اوّلی کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اُسے ان اداروں کی ہیئت وساخت پر ضرور نظر ڈالنی چاہئے مگر کسی خاص ملک کی معاشری، سودمندی وغیر سودمندی کے نکتہ سے نہیں بلکہ اُس وسیع تر مقصد کے پیش نظر جو ساری نسل انسانی کی زندگی میں بتدریج صورت پذیر ہو رہا ہے۔ جب ہم قرآن میں فقہی اصولوں کی اصل و بنیاد پر غور کرتے ہیں تو ہمیں صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فکر اور عمل قانون سازی کے خلاف ہونا تو درکنار ان اصولوں کا عمیق مفہوم تا فکر انسان کا حُدی خواں ہے، فقہائے متقدمین نے اسی اصل سے سُراغ پاکر متعدد فقہی نظام کھڑے کر دیئے اسلامی تعلیم کا طالب علم بڑی اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک معاشری اور سیاسی قوت کے لحاظ سے اسلام کی قریب قریب نصف فتوحات انہی فقہا کی قانونی ذہانت پر منحصر تھیں۔ وان کریمر (VON KREMER) کہتا ہے "رومیوں کے بعد اہل عرب کے سوا اور کوئی قوم نہیں ہے جو کسی ایسے نظامِ قانون کو اپنا کہہ سکے جس کی ترتیب و تیاری میں اتنی محنت و جانفشانی برتی گئی ہو" یہ نظامات اپنی مکمل جامعیت کے باوجود انفرادی تشریحات ہی ہیں۔ اور اس لحاظ سے ان کے لئے کسی قسم کی قطعیت کا دعویٰ درست نہیں ہے میں جانتا ہوں کہ علمائے اسلام مقبول و مروجہ فقہی مذاہب ( ) کے لئے قطعیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن مکمل اجتہاد کے نظری امکانات سے انکار ان کے لئے کبھی بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ میں اُن وجوہات کو بالوضاحت بیان کرنے کی کوشش کر چکا ہوں جو میری رائے میں علماء کے اس طرز عمل کا باعث ہیں۔ چونکہ زمانہ اب بدل چکا ہے اور دُنیائے اسلام اُن قوتوں کے مقابل اور اُن سے اثر پذیر ہے جنہیں انسانی عقل کی حیرت انگیز ترقی نے پیدا اور موجود کر دیا ہے۔ اس لئے مجھے اس طرز عمل کے مزید اپنائے

رکھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ کیا کبھی ہمارے فقہی مذاہب کے موسسین نے اپنے استدلال اور تشریحات کے بارے میں قطعیت کا دعویٰ کیا تھا۔ ہرگز نہیں۔ میری رائے میں موجودہ نسل کے آزاد خیال مسلمانوں کا یہ دعویٰ بالکل جائز اور درست ہے کہ انہیں اپنے تجربات اور جدید زندگی کے بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں فقہ کے بنیادی اصولوں کی تشریح جدید کا حق حاصل ہے۔ اس قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر کہ زندگی مترقی تخلیق کا ایک سلسلہ ہے۔ ہر نسل کو اپنے مسائل خود ہی سلجھانے کی اجازت ہونی چاہئے۔ متقدمین کی تصانیف اُن کے لئے رہبر تو ہونی چاہئیں مگر رکاوٹ نہیں۔

میرا خیال ہے کہ آپ اس مرحلے پر مجھے ترکی شاعر ضیا کی یاد دہانی کرائیں گے اور دریافت کریں گے کہ آیا مرد و عورت کی مساوات کے متعلق اس کا مطالبہ یعنی طلاق علیحدگی اور وراثت میں مساوات کا مطالبہ اسلامی قانون کی رُو سے جائز و درست ہے؟ مجھے معلوم نہیں کہ ترکی میں عورت کی بیداری نے ایسے مطالبات پیدا کر دیے ہیں جنہیں بنیادی اصولوں کی نئی تشریح کے بغیر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب میں جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے ایسے متعدد واقعات سامنے آچکے ہیں جن میں عورتیں اپنے ناپسندیدہ شوہروں سے مخلصی پانے کے لئے مُرتد ہو گئیں۔ ایک تبلیغی مذہب کے مقاصد و عزائم کی اس سے زیادہ غلط تعبیر کیا ہو گی۔ اُندلس کا زبردست فقیہہ شاطبی اپنی کتاب "الموفقات" میں کہتا ہے "قانونِ اسلام پانچ چیزوں کی حفاظت کا دعویٰ کرتا ہے۔ دین، نفس، عقل، مال اور نسل اس معیار کو سامنے رکھ کر میں یہ پوچھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کیا ہدایا کے مطابق ارتداد سے متعلقہ قانون اس ملک میں ایمان کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے ہندوستانی عوام کی شدید قدامت پسندی کے پیشِ نظر یہاں کے مصنفین کے لئے اور کوئی چارہ ہی نہیں کہ اپنے فیصلوں میں انہیں کتابوں سے استناد

کریں جو معیاری تصانیف شمار کی جاتی ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ جب تو میں آگے کی طرف حرکت کر رہی ہیں ہمارا قانون وہیں کا وہیں ساکت و جامد ہے۔

ہاں اب رہا ترکی شاعر کے مطالبہ کا مسئلہ تو مجھے ڈر ہے کہ وہ اسلام کے عائلی قانون کے متعلق کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی قرآنی اصول وراثت کی اقتصادی اہمیت اس پر چنداں واضح ہے۔ نکاح اسلامی قانون کے مطابق ایک معاشرتی معاہدہ ہے بیوی کو اس بات کی پوری آزادی حاصل ہے کہ نکاح کے وقت شوہر کے اختیار طلاق کو مقررہ شرائط کے مطابق اپنے حق میں منتقل کرانے اور اس طرح اس خصوص میں مرد کے مساوی و ہم رتبہ ہو جائے۔ قانون وراثت میں شاعر کی مجوزہ اصلاح ایک غلط فہمی پر مبنی ہے مردوں اور عورتوں کے شرعی حصص اگر غیر مساوی ہیں تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ قانون کی نگاہ میں مرد عورتوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کا قیاس قرآن کی روح کے خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے :-

" اور عورتوں کے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر "

لڑکی کے حصہ کا تعین اس کی کسی خلقی کمزوری کی بنا پر نہیں کیا گیا بلکہ اُن اقتصادی مواقعات اور معاشرتی ہیئت میں جو جگہ اُسے حاصل ہے اُس کے پیش نظر عمل میں آیا ہے مزید برآں شاعر کے اپنے معاشرتی نظریہ کے مطابق قانون وراثت تقسیم دولت کا تنہا اور واحد عامل نہیں سمجھا جانا چاہئے۔ بلکہ اس سلسلے میں جو عاملین کارفرما ہیں اسے اس کی ایک کڑی تصور کرنا چاہئے۔ قانون اسلام کی رُو سے جبکہ لڑکی اُس جائداد کی پوری مالک ہے جو اُسے باپ اور شوہر دونوں کی طرف سے شادی کے موقع پر ملتی ہے اور جبکہ وہ اپنے مہر کی جو اُس کی مرضی کے مطابق خواہ معجّل ہو یا غیر معجّل اور جس کی ادائیگی تک وہ اپنے شوہر کی پوری جائداد پر قبضہ رکھ سکتی ہے۔ تنہا اور واحد مالک بھی ہوتی ہے۔ اُس کے باوجود ساری عمر کے لئے

اس کی کفالت کی تمام تر ذمّہ داری شوہر ہی کے کندھوں پر ڈال دی جاتی ہے۔ اگر آپ قانونِ وراثت کے عمل کو اس نقطہ نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائیگا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی اقتصادی وضعیت میں کوئی ایسا اہم فرق نہیں ہے اور حقیقت میں ان کے شرعی حصّوں کی اس ظاہری عدمِ مساوات کے ذریعے ہی قانونِ اسلام ترکی شاعر کی مطلوبہ مساوات قائم کرتا ہے سچی بات یہ ہے کہ قرآنی قانونِ وراثت ——— وان کریمر (VON KREMER) کے نزدیک قانونِ اسلام کا سب سے زیادہ طبعزاد پہلو ——— کی تہ میں جو اصول کارفرما ہیں، فقہا نے اُن پر اتنی توجہ صرف نہیں کی۔ جن کے وہ مستحق ہیں جدید سوسائٹی کی تلخ جماعتی کشمکش کے پیش نظر ہمیں غور و فکر کی راہ اختیار کر لینی چاہئے۔ اور اگر ہم اپنے قوانین کا مطالعہ جدید اقتصادی زندگی میں قریب الوقوع انقلاب کے تعلق سے کریں تو اغلب ہے کہ ہماری نظر ان اساسی اصولوں کے ایسے مستور پہلوؤں کو دریافت کر لیں جنہیں ہم ان اصولوں کی دانائی کے نئے یقین و اذعان کے ساتھ حل کر سکتے ہیں۔

(ب) احادیث | قانونِ اسلام کا دوسرا سب سے بڑا ماخذ پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی احادیث ہیں یہ قدیم و جدید دونوں زمانوں میں بہت زیادہ بحث کا موضوع و مرکز رہی ہیں، ان کے جدید نقادوں میں سے پروفیسر گولڈزی ہر (GOLDZIEHER) تاریخی انتقاد کے جدید معیاروں کی روشنی میں ان پر ایک کڑی امتحانی نگاہ ڈالنا ہوا اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ مجموعی حیثیت میں ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ایک اور یورپین اہلِ قلم صحتِ حدیث کے معینہ اصولوں کو پرکھنے کے بعد اور غلطی کے نظری امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل نتیجہ نکالتا ہے

"آخر میں یہ کہنا پڑیگا کہ مذکورہ خیالات محض نظری امکانات کی نمائندگی کرتے تھے اور یہ سوال کہ یہ امکانات کہاں تک واقعات بن گئے تھے بڑی حد تک اس بات

پر منحصر ہے کہ حقیقی واقعات نے کس حد تک ان امکانات کو استعمال میں لانے کی ترغیبات دیں۔ اس میں شک نہیں کہ اضافی لحاظ سے مؤخرالذکر بہت کم تھیں اور انہوں نے تمام احادیث کے بہت قلیل حصے کو متاثر کیا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ احادیث کے مجموعے جنہیں مسلمان مستند اور مسلم سمجھتے ہیں بڑی حد تک اسلام کے آغاز اور اس کی ابتدائی ترقی کی اصلی اور سچی دستاویز ہیں۔

بہرحال ہمارے لئے اپنے موجودہ مقصد کے پیش نظر فقہی اور غیر فقہی مفہوم کی احادیث میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ پہلی قسم کی احادیث کے بارے میں ایک نہایت ہی اہم سوال پیدا ہوتا کہ ان میں کس حد تک عرب کے قبل اسلامی دستور و قوانین کا پرتو موجود ہے۔ جنہیں رسول اللہ نے بعض صورتوں میں بجنسہٖ محفوظ کر لیا تھا اور بعض معاملات میں ان کی ترمیم کر دی تھی۔ اس بات کا معلوم کرنا کچھ آسان نہیں ہے کیونکہ ہمارے متقدمین شاذ ہی ان قبل اسلامی دساتیر کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اور نہ اس بات کا پتہ چلنا ممکن ہے کہ ان دساتیر کے رواج کو جنہیں رسول اللہ کی صریح منظوری یا رضا آمیز خاموشی سے جوں کا توں محفوظ رہنے دیا گیا، عالمگیر بنانے کا ارادہ تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس نکتہ پر نہایت بصیرت افروز بحث کی ہے۔ میں یہاں ان کے خیالات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک عمومی لحاظ سے ملہمانہ تعلیم کا اسلوب یہ ہے کہ کسی رسولؐ پر نازل شدہ شریعت میں اُن لوگوں کی عادات، اطوار اور خصوصیات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے جن کی طرف وہ مخصوصاً مامور کیا گیا ہو۔ لیکن وہ پیغمبر جس کا مطمح نظر ہمہ گیر اصول ہوں نہ تو مختلف اقوام کے لئے مختلف احکام دے سکتا ہے اور نہ انہیں اپنی وضع و روش کے اصول وضع کرنے کی کھلی چھٹی دے سکتا ہے اس کا اسلوب یہ ہے کہ ایک خاص قوم کو تربیت دے

اور پھر عالمگیر شریعت کی بنا تشکیل میں اُسے مرکز کے طور پر استعمال کرے ایسا کرتے ہوئے وہ ساری نسل انسانی کی معاشری زندگی کی تہ میں جو اصول کارفرما ہیں اُن پر زور دیتا ہے اور اُن کا اطلاق پیش نظر قوم کی مخصوص عادات کی روشنی میں ٹھوس واقعات پر کرتا ہے اس اطلاق سے پیدا شدہ شرعی احکام ایک لحاظ سے خاص اسی قوم کے متعلق ہوتے ہیں، (سزائے جرائم سے متعلقہ قانون) اور چونکہ ان کی تعمیل و پابندی بجائے خود ایک مقصد نہیں ہے۔ اس لئے آنے والی نسلوں پر سختی کے ساتھ اس کا نفاذ نہیں ہوسکتا۔ شاید اسی خیال کے پیش نظر امام ابوحنیفہ نے جن پر اسلام کی عالمگیر سیرت پوری طرح واضح تھی عملی طور پر ان احادیث سے کوئی کام نہیں لیا۔ ان کی طرف سے استحسان یعنی قانونی ترجیح کے اصول کا تعارف جس کی رُو سے فقہی تفکر میں اصلی حالات و شرائط کا محتاط مطالعہ ازبس ضروری ہے اُن محرکات کو اور بھی واضح کر دیتا ہے جنہوں نے فقہی احادیث کے متعلق ان کے طرز عمل کو متعین کیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے احادیث سے محض اس لئے استفادہ نہیں کیا کہ اُن کے زمانے میں کوئی باقاعدہ مجموعہ احادیث موجود نہیں تھا۔ اوّل تو یہ بات ہی غلط ہے کہ اُن کے زمانے میں ایسا کوئی مجموعہ ہی موجود نہیں تھا کیونکہ ان کی وفات سے پورے تیس برس پہلے عبدالملک اور زہری کے مجموعے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ مجموعے اُن تک نہیں پہنچے اور یہ کہ اُن میں فقہی مفہوم کی احادیث نہیں تھیں تو پھر بھی وہ اپنے متاخرین یعنی امام مالکؒ اور امام احمدؒ بن حنبل کی طرح بڑی آسانی کے ساتھ خود اس طرز کا ایک مجموعہ مُرتب کر سکتے تھے۔ بشرطیکہ وہ اس بات کو ضروری اور اہم تصوّر کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خالص فقہی مفہوم کی احادیث کے متعلق امام ابوحنیفہ کا نقطہ نگاہ مجموعی حیثیت میں درست ہے اور جدید آزاد خیال اگر قانونی ماخذ کی حیثیت میں ان کے بلا امتیاز استعمال کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں

تو ان کا ایسا کرنا حنفیوں کے ایک بزرگ ترین شارح کی پیروی ہوگی۔ تاہم اس امر میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ فقہ میں مجرد فکر کے برعکس ٹھوس مسائل و واقعات کی قدر و قیمت پر زور دے کر اہلِ حدیث نے اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور اب بھی احادیث کا محتاط مطالعہ اگر اس انداز و نظر کے ساتھ کیا جائے جس میں خود رسول اللہ نے وحی کی تشریح کی ہے تو یہ قرآنی اصولوں کی حیاتی قدر کے سمجھنے میں بہت بڑی مدد دے سکتا ہے۔ ان اصولوں کی حیاتی قدر و قیمت پر مکمل گرفت ہی ہمیں بنیادی اصولوں کی تشریح جدید کی سعی و کوشش کے لئے تیار کر سکتی ہے۔

(ت) اجماع: اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ اجماع ہے جو میری رائے میں شاید اسلام کا سب سے اہم قانونی نظریہ ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں تو یہ اہم نظریہ بڑی لمبی چوڑی علمی بحثوں کا مرکز بنا رہا مگر عملی طور پر اس کی حیثیت محض ایک خیال سے زیادہ نہیں بڑھی اور نہ ہی اس نے کبھی کسی اسلامی ملک میں ایک مستقل ادارے کی شکل اختیار کی۔ ممکن ہے اس خیال کا کسی مستقل قانونی ادارے کی شکل و صورت اختیار کر لینا اس مطلق العنان شہنشاہیت کے مفاد کے خلاف ہو جس کا قیام خلیفہ چہارم کے فوراً بعد عمل میں آچکا تھا۔ میرے خیال میں یہ بات اموی اور عباسی خلفا کے مفاد کے عین حق میں تھی کہ وہ قوتِ اجتہاد کو انفرادی مجتہدین کے ہاتھوں ہی میں رہنے دیں اور کسی ایسی مستقل مجلس کے تشکیل و قیام کی حوصلہ افزائی نہ کریں جو بعد میں ان کی اپنی ذات ہی کے لئے ایک طاقتور خطرہ بن جائے! بہرحال یہ امر قابلِ اطمینان ہے کہ نئی عالمگیر قوتیں اور اقوامِ یورپ کا سیاسی تجربہ موجودہ دور کے مسلمانوں پر خیالِ اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے امکانات کو عیاں اور واضح کر رہا ہے اسلامی ممالک میں روحِ جمہوریت کی نشو و نما اور قانون ساز مجالس کا تدریجی قیام راہِ ترقی میں ایک بہت بڑا

قدم ہے۔ عصر حاضر میں اجماع کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ قوت اجتہاد سو فقہی مذاہب کے انفرادی نمائندوں کے ہاتھوں سے لے کر ایک مسلم مجلس قانون ساز کے سپرد کر دیا جائے جو فقہی مباحث پر ایسے اشخاص کی نکتہ خیز معلومات حاصل کرتے ہیں کامیاب ہو سکیگی جو ماہر فن نہ ہونے کے باوجود معاملات میں گہری بصیرت کے حامل و دوراہوں گے صرف اس صورت میں ہم اپنے فقہی نظام کی خوابیدہ روح کی فعلیت پر ابھار کر اسے ارتقائی رنگ دے سکتے ہیں۔ مگر یہاں ہندوستان کے اندر اس بارے میں بہت سی مشکلات پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ کیونکہ یہ بات محل نظر ہے کہ آیا ایک غیر مسلم مجلس قانون ساز قوت اجتہاد کا استعمال کر سکتی ہے؟

لیکن اجماع کے متعلق ایک دو ایسے سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینا از بس ضروری ہے کیا اجماع قرآن کی تنسیخ کر سکتا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ مسلمان سامعین کے سامنے ایسا سوال اٹھانا بالکل غیر ضروری اور فضول ہے مگر میرے لئے ایسا کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ایک یورپین نقاد نے اپنی کتاب موسومہ "مالیات کے اسلامی نظریے (MOHAMMEDAN THEORIES OF FINANCE) مطبوعہ کولمبیا یونیورسٹی میں ایک نہایت گمراہ کن بیان شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا مصنف بغیر کسی سند کے رقمطراز ہے کہ بعض حنفی اور معتزلہ اہل قلم کے نزدیک اجماع قرآن کی تنسیخ کر سکتا ہے اسلام کے سارے فقہی ادب میں اس بیان کے لئے قطعاً کوئی وجہ جواز موجود نہیں۔ پیغمبر کی کسی حدیث میں بھی طاقت نہیں ہے کہ وہ قرآن کی تنسیخ کر سکے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ہمارے متقدمین فقہا کی تحریروں میں لفظ نسخ کی موجودگی سے گمراہ ہو گیا ہے۔ امام شاطبی الموافقات جلد سوئم صفحہ ۶۵ میں فرماتے ہیں کہ "جب فقہائے متقدمین اس لفظ کو اجماع صحابہؓ کے موضوع پر بحث و تحمیص کرتے وقت استعمال میں لاتے تو اس کا مفہوم محض کسی فقہی قرآن کی طاقت اجرا و نفاذ میں کمی یا بیشی ہی ہوتا تھا

اور اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے تھے کہ قرآن کے کسی نقلی اصول کو کسی اور اصولِ قانون کے ذریعے تنسیخ کر دینے کی اس میں طاقت ہے۔ اور اس طاقتِ اجراء و نفاذ کے استعمال کا قانونی نظریہ بھی آمیدی ـــــ شافعی فقیہ جو ساتویں صدی ہجری کے وسط میں فوت ہوا اور جس کی تصانیف ابھی ابھی مصر میں شائع ہو چکی ہیں ـــــ کے نزدیک یہ ہے کہ "اصحابہ کے پاس ضرور ایسا شرعی حکم ہوگا جس کی رُو سے وہ اس طاقتِ اجراء و نفاذ میں کمی بیشی کرنے کے مجاز تھے۔

مگر فرض کیجئے کہ صحابہ نے متفقہ طور پر ایک مسئلہ کو طے کر لیا تب اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا آنے والی نسلیں بھی اس فیصلہ کی مکلف ہونگی؟ قاضی شوکانی رحؒ نے اس مسئلہ پر بتفصیل بحث کی ہے اور مختلف المذاہب ( ) اہلِ قلم کی آراء بھی نقل کر دی ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں واقعاتی اور قانونی امور سے متعلقہ فیصلوں میں تمیز کرنا لازمی ہے۔ پہلی صورت میں مثال کے طور پر جب یہ سوال پیدا ہو کہ آیا معوذتین کی سورتیں قرآن میں شامل ہیں یا نہیں اور صحابہؓ نے بالاجماع فیصلہ دیدیا کہ وہ شامل ہیں تو اُن کا یہ فیصلہ ہمارے لئے ناطق ہے اس لئے کہ صحابہ ہی اس امر واقعہ سے باخبر ہو سکتے تھے دوسری صورت میں سوال محض تشریح کا ہے اور کرخی کی سند پر میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مابعد کی نسلیں اجماعِ صحابہؓ کی پابند نہیں ہیں کرخی کہتا ہے کہ "سُنتِ صحابہ رضؓ اُسی وقت ناطق ہو سکتی ہے جب کوئی مسئلہ قیاس کے ذریعے صاف نہ ہو سکے۔ لیکن جو مسائل قیاس کے ذریعے ثابت ہو سکیں ان میں اس کی پابندی لازمی نہیں ہے۔"

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ کسی جدید مسلم مجلس آئین سازی کی قانونی فعالیت کے بارے میں ہے۔ جس کی ترکیب کم از کم موجودہ حالات میں ایسے ہی اشخاص سے ہو سکتی ہے۔ جنہیں زیادہ تر قانونِ اسلام کی باریکیوں کا کوئی علم نہیں۔ ایسی مجلس

آئین ساز قانون کی تشریح کرنے وقت بڑی اہم غلطیوں کی مرتکب ہوسکتی ہے ہم کس طرح ایسی تشریحی غلطیوں کے امکانات کی مکمل پیش بندی یا کم ازکم انہیں گھٹانے کی کوشش کر سکتے ہیں؟ ۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور کے مطابق "دنیاوی امور سے ماہر" علمائے مذہب کی ایک علمی کمیٹی بنادی گئی ہے جسے "مجلس کے عمل قانون سازی" کی نگرانی اور دیکھ بھال کا اختیار ہوگا۔ میری رائے میں یہ خطرناک اقدام شاید ایران کے مخصوص آئینی نظریے کے مطابق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نظریے کی رو سے بادشاہ ملک وسلطنت کا محض امین ہے حقیقت میں یہ چیزیں امام غائب کی ملکیت ہیں۔ علماء امام کے نمائندوں کی حیثیت میں پوری قومی زندگی کی نگرانی اور دیکھ بھال کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اگرچہ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ملہمانہ سلسلۂ جانشینی کی غیابت میں وہ کس طرح نیابت امام کا حق ثابت کرتے ہیں ــــ مگر ایران کا دستوری نظریہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ التزام خطرے سے خالی نہیں اور اگر سنی ممالک میں اس تجربے کو دوہرایا بھی جائے تو وہ محض عارضی اور وقتی ہونا چاہئے۔ علماء مسلم مجلس آئین ساز کا نہایت اہم اور مرکزی عنصر ہونا چاہئیں۔ تاکہ قانون سے متعلقہ مسائل پر آزادانہ مباحث کی معاونت و رہنمائی کرسکیں۔ غلط تشریحات کو روکنے کا مؤثر علاج صرف یہی ہے کہ اسلامی ممالک میں قانون کے رائج الوقت نظام تعلیم میں اصلاح کی جائے۔ اس کا دائرہ وسیع کیا جائے اور اس کی تحصیل کے ساتھ جدید علم الاقانون کا گہرا اور زیرک مطالعہ بھی شامل کردیا جائے۔

ث قیاس: فقہ کا چوتھا ماخذ قیاس ہے یعنی وضع قوانین میں "قیاسی استدلال" کا استعمال یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مفتوحہ ممالک میں مختلف معاشری اور زرعی حالات کے پیش نظر حنفی اہل الرائے کو احادیث میں مذکورہ مثالوں سے کوئی روشنی اور رہنمائی نہیں ملی۔ اپنی تشریحات میں ان کے لئے صرف ایک ہی راہ کھلی تھی اور وہ قیاسی استدلال کا استعمال

تھا اگرچہ عراق میں نئے حالات ارسطو کی منطق کی طرف اشارہ کر رہے تھے مگر قانونی ترقی کے ابتدائی مراحل میں اس کے اطلاق سے سخت نقصان دہ نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ زندگی کے پیچیدہ برتاؤ کو چند عمومی تصورات سے منطقی طور پر اخذ شدہ ٹھوس اور مضبوط قوانین کی جکڑبندیوں میں نہیں لایا جا سکتا مگر منطق ارسطو کی عینک سے دیکھا جائے تو یہ ایک خالص مشین (MECHANISM) ہے جس کا کوئی داخلی اصول حرکت نہیں۔ اس طرح حنفی اہل الرائے نے زندگی کی تخلیقی آزادی و مطلق المعانی کو صرف نظر کر دیا۔ اور عقل خالص کی بنیادوں پر ایک مکمل نظام قانون کی تشکیل کا خواب دیکھنے لگ گئے۔ لیکن فقہائے حجاز نے جو سامی نسل کے عملی ذوق کے صحیح نمائندے تھے، عراقی فقہا کی متکلمانہ دقیقہ سنجیوں کے خلاف پُر زور صدائے احتجاج بلند کی اور اُن کے غیر حقیقی واقعات کو تصور کر لینے کے میلان پر بھی زبردست اعتراضات کئے جس کی نسبت وہ صحیح طور پر سمجھتے تھے کہ یہ قانونِ اسلام کو ایک قسم کی بےجان مشین (MACHINE) بنا کر رکھ دیگا۔ اسلام کے ابتدائی فقہا میں ان تلخ اختلافات نے حدودِ قیاس کی انتقادی تعریف اس کی شرائط اور تعزیرات کی طرف توجہ کو منعطف کر دیا۔ قیاس جو دراصل مجتہد کی ذاتی رائے کو چھپانے کے لئے ایک نقاب کا کام دیتا تھا قانون اسلام میں آخرکار زندگی و حرکت کا سرچشمہ بن گیا۔ قانون کے ایک ماخذ کی حیثیت میں ابو حنیفہ کے اصولِ قیاس پر مالکؒ و شافعیؒ کی زبردست تنقید دراصل اُس آریائی میلان پر ایک مؤثر سامی گرفت ہے جو واقعہ کی بجائے خیال اور حقیقت کے بدلے تصور سے زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے حقیقت میں یہ اختلاف فقہی تحقیق میں استخراجی (DEDUCTIVE) اور استقرائی (INDUCTIVE) اسالیب برتنے والوں کے درمیان تھا۔ عراق کے فقیہ اصلاً نظریے کے ابدی پہلو پر زور دیتے تھے۔ اس کے برعکس حجازی فقہا اس کے واقعاتی پہلو کو زیادہ اہم سمجھتے تھے

لیکن حجاز کے فقیہ اپنی وضعیت کی پوری اہمیت کا خود ہی احساس نہ کر سکے۔ اور حجاز کی قانونی روایات نے جبلی طور پر اُن میں جو تعصب پیدا کر دیا تھا اُس نے ان کی نگاہ کو اُنہی مثالوں تک محدود کر دیا۔ جو عہدِ رسالت اور دورِ صحابہ میں فی الواقعہ وقوع پذیر ہو چکی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُنہوں نے ٹھوس حقائق کی قدر و قیمت کو پہچانا مگر ساتھ ہی اُنہیں غیر متبدل اور ابدی بھی بنا دیا۔ اور قیاس کی طرف جس کا انحصار ٹھوس حقائق کے مطالعہ پر ہی ہے بالکل رجوع نہیں کیا بہر حال مذہب (SCH OOL) ابو حنیفہ پر اُن کی تنقید نے "ٹھوس واقعہ" کی قدر و قیمت کو بڑھا دیا اور فقہی اصولوں کی تشریح کرتے وقت زندگی کی اصلی حرکت اور تنوع کو مدِ نظر رکھنے کی ضرورت نگاہوں کے سامنے کر دی۔ نتیجہ یہ ہے کہ مذہب ابو حنیفہ جس نے اس نزاع کے نتائج کو پورے طور پر جذب کر لیا تھا اپنے اساسی اصولوں میں بالکل آزاد ہے اور اس میں "تخلیقی مطابقت" (CREATIVE ADAPTATION) کی قوت باقی تمام فقہی مذاہب (SCHOOLS) سے زیادہ ہے۔ لیکن جدید حنفیوں نے خود اپنے مذہب کی روح کے عین برعکس امام ابو حنیفہ اور اُن کے جانشینوں کی تصریحات کو ٹھیک اُسی طرح اٹل اور نا قابلِ ردّ و بدل تسلیم کر لیا ہے۔ جس طرح ابتدائی ناقدینِ امام نے ٹھوس واقعات پر دیئے ہوئے فیصلوں کو ابدی بنا لیا تھا۔ اس مذہب کے اساسی اصول یعنی قیاس کو اگر صحیح طور پر سمجھا جائے۔ اور اس کے اطلاق میں بھی غلطی نہ ہو تو یہ جیسا کہ امام شافعیؒ بجا فرماتے ہیں "محض اجتہاد کا ایک دوسرا نام ہے" اور اصول کی حیثیت میں اس کی اہمیت اس حقیقت سے بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ اکثر فقہا کے نزدیک جیسا کہ قاضی شوکانی ہمیں بتلاتے ہیں "خود رسول اللہؐ کی زندگی میں بھی اس پر عمل پیرا ہونے کی اجازت تھی۔ باب اجتہاد کا بند ہو جانا ایک خالص افسانہ ہے جسے کچھ تو اسلام میں فکر قانونی کی نظم و تنسیق نے پیدا کیا اور کچھ اُس ذہنی کاہلی نے گھڑ لیا جو خاص طور پر روحانی زوال

دَور میں بڑے بڑے مفکرین کو معدود بنالیتی ہے۔ اگر بعض مؤخرین فقہا نے اس افسانے کو تسلیم کرلیا ہے تو موجودہ مسلمان اپنی ذہنی آزادی کی اس اختیاری قربانی کے لئے ہرگز مکلف نہیں۔ سرکاشی ۔ دسویں صدی ہجری ۔ بالکل صحیح کہتا ہے کہ " اگر اس افسانے کے مؤیدین سمجھتے ہیں کہ متقدمین کی نسبت متاخرین کی راہ میں زیادہ مشکلات حائل ہیں تو یہ محض واہیات ہے۔ کیونکہ اس بات کا سمجھ لینا کچھ ایسا مشکل نہیں کہ متقدمین کی نسبت متاخرین کے لئے اجتہاد میں زیادہ آسانیاں ہیں فی الواقعہ قرآن وسُنّت کی تفسیریں اتنی ہوگئی ہیں کہ آج مجتہد کے لئے ضرورت سے بھی زیادہ مواد موجود ہے "

اس مختصر سی بحث سے آپ پر واضح ہوگیا ہوگا کہ نہ تو اساسی اصولوں میں اور نہ ہی فقہی نظاموں کی ساخت میں ہمارے موجودہ طرزِ عمل کے لئے کوئی وجہ جواز موجود ہے عقل و فکر کی تیز روشنی اور نئے تجربات کی قوت سے مسلح ہوکر دنیائے اسلام کو چاہئے کہ جرأت و ہمت کے ساتھ تشکیل جدید کے پیش پا افتادہ کام کو سرانجام دے لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ تشکیلِ نو زندگی کے جدید حالات وکوائف کے ساتھ محض مطابقت پیدا کرنا ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم کام ہے (پچھلی) جنگِ عظیم کے بعد ترکی کی بیداری — جو ایک فرانسیسی اہلِ قلم کے نزدیک اسلامی دنیا کے لئے استحکامی عنصر ہے ۔ اور مسلم ایشیا کی قربت وہمسائگی میں نئے اقتصادی تجربے پر عمل پیرائی ۔ ان دونوں چیزوں سے اسلام کا داخلی مفہوم اور اس کا مستقبل ہم پر واضح و آشکار ہوجانا چاہئے ۔ آج انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے، کائنات کی روحانی تشریح ۔ فرد کی روحانی آزادی ونجات اور عالمگیر بنیادی اصول جو روحانی اساس پر انسانی معاشرہ کے ارتقا کی راہ نمائی کریں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ نے انہی خطوط پر متعدد تصوری، نظام تخلیق کئے ہیں لیکن تجربہ شاہد

ہے کہ عقلِ خالص کے ذریعے حاصل شدہ حقیقت اعتقاد و یقین کی وہ حرارت پیدا کرنے سے قاصر ہے جو صرف وحی الٰہی کا خاصہ ہے یہی وجہ ہے کہ عقلِ خالص نے انسانوں کو بہت کم متاثر کیا ہے۔ حالانکہ مذہب نے ہمیشہ افراد کو بلندیوں پر ابھارا ہے اور پوری سوسائٹیوں کو بدل کر رکھ دیا ہے یورپ کی تصوریت اس کی حیات میں کبھی ایک زندہ عنصر نہیں بن سکی اور نتیجہ ایک گمراہ خودی ہے جو اپنا اظہار ایسی متخالف اور نا روادار جمہوریتوں کے ذریعے کر رہی ہے جن کا آخری مقصد امرا کے مفاد کی خاطر غریبوں کا خون چوسنا ہے۔ یقین کیجئے انسانوں کی اخلاقی ترقی کے راستہ میں یورپ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے برعکس مسلمان وحی الٰہی کی اساس پر قائم شدہ اُن بنیادی اصولوں کے سرمایہ دار ہیں جو زندگی کی گہرائیوں سے اُبھر کر اپنی ظاہری خارجیت کو داخلیت میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ ہمارے لئے زندگی کی روحانی اساس ایک اعتقادی بات ہے جس کی خاطر کم سے کم علم رکھنے والا مسلمان بھی بہ آسانی اپنی زندگی بھینٹ دے سکتا ہے اور اسلام میں ختمِ نبوت کے بنیادی خیال کے پیشِ نظر ہمیں روحانی طور پر دُنیا کی سب سے زیادہ فوقیت رکھنے والی قوموں میں سے ہونا چاہیئے۔ قرنِ اولیٰ کے مسلمان جنہیں ابھی ابھی قبل اسلامی ایشیا کی روحانی غلامی سے نجات ملی تھی اس بنیادی خیال کی صحیح اہمیت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ عصرِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی حیثیت (POSITION) کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرے۔ ان بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنی معاشرتی زندگی کو پھر سے ڈھالے اور اسلام کے تاہنوز نیم عریاں مقصد کے مطابق اس روحانی جمہوریت کو تشکیل دے جو اسلام کا آخری منشا ہے۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

ہماری تازہ ترین مطبوعات

ہمارے ہندوستانی مسلمان } جس میں سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین پر مفصل تبصرہ ہے۔ یہ تحریک ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیا و تجدید کی ایک آخری اور زبردست کوشش تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کو کس طرح منظم کیا۔ اور کس طرح اُن کے اندر بالی رُوح پیدا کر دی تھی۔ قیمت دو روپے بارہ آنے (۲؍۱۲)

اسلامی پارٹی کا آئین } مسلمانوں کو ہندوستان میں اب کن خطوط پر منظم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیاء کے لئے کوشش کی جا سکتی ہے ان سوالات کا جواب معلوم کرنا ہو تو اس کتاب کو مطالعہ کیجئے۔ قیمت ۸؍

شرح اسرارِ خودی } علامہ اقبال کا بنیادی فلسفہ مثنوی اسرار و رموز میں بیان کیا گیا ہے اصل کتاب فارسی میں ہے یہ شرح پروفیسر محمد یوسف خان سلیم چشتی نے اُردو زبان میں تحریر فرمائی ہے بے حد مقبول ہے۔ دوسرا ایڈیشن اس گرانی کے زمانہ میں طبع ہوا ہے۔ قیمت وہی ہے جو پہلے تھی صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (۱؍۸)

اقبال کا تصوّر زمان و مکاں } ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی نے علامہ اقبال کے نظریہ زمان و مکاں کی تشریح اردو زبان میں کر کے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے علامہ کے چھ لیکچروں میں سے دو لیکچروں میں اسی مسئلہ پر بحث ہے اور یہی دو لیکچر مشکل ترین لیکچر ہیں اس لئے اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ قیمت دس آنے

موت و حیات اقبال کے کلام میں } اس چھوٹے سے پمفلٹ میں ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی نے علامہ اقبالؒ کے اس نظریہ پر سیر حاصل بحث کی ہے جو وہ زندگی اور موت سے تعلق رکھتے تھے یہ چھوٹا سا مضمون بے حد پُر از معلومات اور روح پرور ہے قیمت چار آنے۔

اقبال کے چند جواہر ریزے } یہ علامہ اقبال کی ملفوظات کا ایک نادر مجموعہ ہے جو جناب خواجہ پروفیسر عبد المجید صاحب گورنمنٹ کالج لاہور نے جمع کیا تھا قیمت صرف دس آنے

اشتراکیت اور اسلام: مولوی محمد مظہر الدین صدیقی بی اے کا یہ مضمون ہر لکھے پڑھے کے مطالعہ میں آنا چاہئے قیمت (۶؍)

انتخاب غالب: غالب کے کلام کا یہ ایک ایسا نادر مجموعہ ہے جو اب تک شائع نہیں ہوا۔ اس مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ غالب نے خود اپنے کلام کا یہ انتخاب جمع کیا تھا۔ قیمت چھ آنے (۶؍)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

ہمارے ہندوستانی مسلمان

ولیم ہنٹر آئی سی۔ ایس بنگال نے ۱۸۷۱ء میں انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی۔ جس کا نام (OUR INDIAN MUSALMAN) ہے۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین پر ایک مفصل تبصرہ لکھا ہے یہ تحریک ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیاء و تجدید کی ایک آخری کوشش تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے کس طرح مسلمانوں کو حیرت انگیز طور پر منظم کیا۔ اور کس طرح ان کو ایمان افروز قربانیوں کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اس جماعت نے مسلسل ۶۵ سال تک سکھوں اور انگریزوں کی حکومت کو آتش زیر پا رکھا کتاب میں اسلامی تحریکات اور مسلمانوں کی ذہنیت پر خوب کھل کر تبصرہ کیا گیا ہے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ کیا تھے اور ہم کیا ہیں کتاب اردو زبان میں پہلی مرتبہ اس ہفتہ چھپ کر آئی ہے اور ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔ اپنی فرمائش جلد بھیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت دو روپے بارہ آنے

حقیقت نفاق

مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی نے قرآن مجید کے اس حصہ کو جو نفاق، منافق، منافقت اور نفاق کی حقیقت سے بحث کرتا ہے بالاستیعاب مطالعہ کرکے اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ قومی زندگی کو تباہ کرنے والا دشمن نمبر ا نفاق ہے۔ قرآن مجید نے نفاق کی کتنی قسمیں گنائی ہیں۔ اور منافقوں کی پہچان کیا بتائی ہے۔ اور نفاق اور منافقین سے الگ رہنے کے لئے کیا کیا ہدایتیں دی ہیں اگر ان سب باتوں کو یکجا دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ یہ کتاب تعلیمات قرآنیہ کا نچوڑ ہے۔ اور کوئی اردو لکھا پڑھا آدمی اس کے مطالعہ سے محروم نہیں رہنا چاہیئے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

زبورِ عجم

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی معرکۃ الآرا کتاب زبورِ عجم پہلی مرتبہ ۱۹۲۷ء میں طبع ہوئی تھی۔ اب دوسری مرتبہ ۱۹۴۲ء میں طبع ہوتی ہے۔ اور شائقین علم اسے دھڑا دھڑ خرید رہے ہیں۔ کاغذ کی گرانی اور کمیابی کے باعث بہت تھوڑی تعداد میں طبع ہوتی ہے اس لئے اگر آپ منگوانا چاہیں تو جلد فرمائش ارسال کریں۔ قیمت ؎ ۔

ضربِ کلیم

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب بے حد مقبول ہے۔ اس کے کئی ایک ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں اب عرصہ سے یہ کتاب ناپید تھی۔ حال ہی میں طبع ہو کر آئی ہے۔ اگر آپ کو درکار ہو تو طلب فرمایئے۔ قیمت ؎

بالِ جبریلؑ

ڈاکٹر صاحب کا یہ اردو شاہکار بھی بہت دنوں سے ناپید تھا۔ اب یہ کتاب بھی چھپ گئی ہے اگر آپ کے پاس بالِ جبریل کا نسخہ نہیں ہے۔ تو اوّلین فرصت میں آپ کو چاہیئے کہ اسے حاصل کریں۔ قیمت للعہ ۔

جاوید نامہ
و
مثنوی پس چہ باید کرد

ڈاکٹر صاحب کی یہ دونوں کتابیں کتابت ہو چکی ہیں اور عنقریب طبع ہونے والی ہیں آپ اپنی فرمائشیں پہلے ہی درج کرا دیں۔ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے یہ کتابیں بہت کم تعداد میں طبع ہونگی اس لئے جن حضرات کی فرمائشیں ہمارے پاس ہوں گی۔ ان کو سب سے پہلے ارسال کر دی جائیں گی۔

شرح اسرارِ خودی

اسرارِ خودی کی شرح کا دوسرا ایڈیشن اس ہفتہ چھپ کر آیا ہے۔ یہ کتاب تین سال سے ختم ہو چکی تھی۔ چونکہ بے حد مقبول اور ہر دلعزیز ہے۔ اس کی مانگ بہت تھی۔ جن حضرات کی فرمائشیں درج تھیں۔ ان کو بھیجی جا رہی ہے۔ آپ بھی جلد منگوا لیں قیمت ؎

ملنے کا پتہ: دفتر اقبال اکیڈمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

معرکۂ اسلام و جاہلیّت

اسلام اور جاہلیت کی کشمکش دیر سے چلی آرہی ہے۔ مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی نے اس معرکۃ الآراء کتاب میں نہایت تفصیل سے اسلام کے روشن خدّوخال اور جاہلیّت کی صحیح تصویر دکھا کر دُنیا سے پُوچھا ہے کہ اُن کو اسلام دیدہ زیب نظر آتا ہے یا جاہلیت؟ اسلام ان کے مقاصدِ حیات کو پورا کرتا ہے یا جاہلیت؟ اسلام ان کو دُنیا میں سرفرازی بخشتا ہے یا جاہلیت؟ اسلام اخروی راحت کا ضامن ہے یا جاہلیت؟ کتاب بڑی دلچسپ، بڑی سبق آموز اور بے حد مفید ہے۔ آپ کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ قیمت عہ؍

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

حجۃ اللہ البالغہ کے چند نہایت ہی مفید اور مشکل مقامات کا اردو میں خلاصہ دیکھنا چاہیں تو یہ کتاب پڑھیں۔ معرکۂ اسلام و جاہلیت کی طرح یہ کتاب بھی حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی نگرانی اور مشورے سے تحریر میں لائی گئی تھی۔ اور حقیقتِ نفاق کی طرح اسلامی جماعت کی تحریک کے لئے بے حد مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ قیمت عہ؍

کتب زیرِ طبع

(۱) دربارِ رسولؐ کے فیصلے قیمت ۸؍ (۲) تقویۃ الایمان مصنفہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نہایت خوبصورت، صحیح اور عمدہ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کے سائز پر قیمت ۸؍ (۳) اقبال پر ایک نظر قیمت ۸؍ (۴) تعلیماتِ اقبال۔ قیمت ۸؍ (۵) محمد عبدہٗ قیمت عہ؍
اسی مہینے میں یہ کتابیں بھی طبع ہو کر آجائینگی فرمائشیں درج رجسٹر کرا دیجئے۔

دفتر اقبال اکیڈمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ لاہور

بخدمت قارئین "پیغام حق"

مکرمی برادران - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"پیغام حق" علامہ اقبال کی یاد میں ۱۹۴۲ء سے متواتر شائع ہو رہا ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس رسالہ میں صرف وہ مضامین شائع ہوتے ہیں جو اسلامی فلسفہ اور تعلیمات قرآنیہ کی شرح کرتے ہیں اس پرآشوب زمانہ میں جبکہ اسلام وقرآن کے قوانین سے لوگ انحراف کر رہے ہیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اسلامی نظریات اور تعلیمات کو عام کیا جائے ۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی　　حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

میں آپ سے اس سلسلہ میں صرف اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ اگر آپ "پیغام حق" کے خریدار ہیں تو کم از کم چھ ایسے حضرات کے نام و پتے سے مجھے آگاہ کیجئے جو آپ کے خیال میں اس پرچہ کی خریداری منظور کر لیں گے۔ تاکہ ان سے خط و کتابت کی جائے اگر آپ سے ممکن ہو تو آپ خود بھی کچھ تھوڑا سا وقت نکال کر اس پرچہ کی توسیع اشاعت کے لئے کام کیجئے اور اگر آپ خریدار نہیں ہیں تو آپ خود بھی خریداری قبول کریں اور احباب کو بھی اس طرف متوجہ کریں اور کم از کم چھ حضرات کے نام و پتہ سے مجھے آگاہ کریں ۔ آپ اسی فارم پر ایسے حضرات کے نام لکھ کر مجھے ارسال فرما سکتے ہیں جن کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں گا والسلام

نیازمند: محمد شاہ ایڈیٹر

بنام ایڈیٹر "پیغام حق"

جناب من سلام مسنون - آپ کی اپیل کے پیش نظر ذیل میں چھ حضرات کے پتے درج ہیں آپ ان سے خط و کتابت کیجئے مجھے امید ہے کہ یہ حضرات آپ کے پرچہ کی خریداری منظور فرمالیں گے۔ والسلام

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

مکمل نام و پتہ - - - - - - - - - - - - - - - -

Registered No. L. 4564

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحبان محکمہ تعلیم برائے گورنمنٹ سکولز صوبہ سندھ، ریاست بہاولپور و ریاست بھوپال

ستمبر ۱۹۴۴ء

جلد ۹ — عدد

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم۔ اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸/

ہماری تازہ مطبوعات

ہمارے ہندوستانی مسلمان

ولیم ہنٹر ، آئی - سی - ایس

نے

ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے عہد میں مسلمانوں کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اور مسلمانوں کی اسلامی ذہنیت اور اس کے تبدیل کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہیں ، یہ تاریخی کتاب مسلمانوں کی دماغی کیفیت اور ان کی تحریک ہائے آزادی کا ایک مرقع ہے ، ضمنا وہابی تحریک ، سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ اور جماعت مجاہدین سرحد کی مساعی کا مختصر مگر قابل وثوق اور نہایت سبق آموز ذکر آگیا ہے ، قیمت مجلد ۲ روپے ۱۲ آنے

انتخاب غالب

مرزا غالب دہلوی نے اپنے کلام کا ایک انتخاب خود تیار کرکے فنانشل کمشنر پنجاب کو بھیجا تھا اور ایک چٹھی اس کے ہمراہ ارسال کی تھی ، یہ انتخاب اب تک کہیں طبع نہیں ہوا . ور اس قابل تھا کہ شائقین ادب اردو کے لئے اسے طبع کیا جاتا ہے .

قیمت ٦ آنے

اقبال پر ایک نظر

علامہ اقبال کی شاعری اور ان کی شخصیت پر مختلف اہل علم نے تنقید کی ہے ، ہم نے اس میں سے چند بلند پایہ مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے ، اس میں مولانا ظفرعلی خاں ، جناب سالک اور مولانا عبد السلام ندوی ایسے ادباء کے مضامین ہیں ،

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

اسلامی پارٹی کا آئین

اسلامی ہند میں مسلمانوں کو کن خطوط پر منظم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ان کے اندر ضبط (Discipline) قائم ہو سکتا ہے اور کس مقصد کو لیکر تمام مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہیں ، ان سوالات کا جواب اگر آپ دیکھنا چاہیں تو جناب عزیز ہندی کی کتاب « اسلامی پارٹی آئین » کا مطالعہ فرمائیں ، قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے

ماہنامہ

سالانہ قیمت
عوام سے چار روپے — رؤساسے پانچ روپے

پیغام حق

ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

جلد ۹	ستمبر ۱۹۴۴ء	عدد ۳

سید محمد شاہ ایم۔اے پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس بیرون اکبری گیٹ لاہور میں طبع کرا کر
دفتر رسالہ پیغام حق [illegible]

سخنہائے گفتنی

آہ! مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ میرے آپ کے اور جملہ مسلمانانِ ہند کے جانے پہچانے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں کون مسلمان ہے جو آپ کے نام نامی اور ذات گرامی سے واقف نہیں اور واقف ہو بھی کیوں نہ جب کہ آپ کے خمیر میں مبداء فیض نے وہی السار رکھا تھا جو انقلاب پسند اور انقلاب انگیز تھا سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے مگر فطرت سلیمہ وہاں مطمئن نہ ہوئی۔ اور آپ نے اسلام قبول کر لیا! آپ مسلمانوں کے تمام علوم پڑھے اور اسلام کا پوری دقت نظر سے مطالعہ کیا مگر یہ دیکھا کہ موجودہ مسلمان کے دل پر اسلام کا کوئی اثر نہیں اور اس کے دماغ میں اسلام کا صحیح تصور نہیں اس لئے آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی خاطر اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ اور اسلام کی صحیح تعبیر اور مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر میں آپ مصروف ہو گئے۔ آگے آپ جانتے ہیں کہ انہوں نے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے کیا کیا قربانیاں کیں۔ بالفاظ حضرت علامہ مولانا سید سلیمان ندوی صدیوں کے بعد ایک عالم دین پیدا ہوا تھا جس نے اپنے معتقدات کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔" آہ! آج وہ پیکر ایثار ہمارے درمیان نہیں رہا۔ اور داعی اجل کو لبیک کہہ کر اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملا ہے آؤ! ہم ان کے نقش قدم کے دھندلے نشانوں کو تلاش کریں اور ان پر گامزن ہونے کی کوشش کریں کہ ان کی خدمات جلیلہ کا بس یہی ایک صلہ ہے جو ان کی روح کو نشاط بخش سکتا ہے آؤ! ہم حکمت و سیاست ولی اللّٰہی کا بنظر غائر مطالعہ کریں اور ہندوستان میں اس فکر کو مقبول عام کرنے کے لئے کوشش کریں۔

غمزدہ: محمد شاہ

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور

عمرہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختہ
چوں من از دودۂ آتش نفسان برخیزد

مولانا عبید اللہ سندھی بھی ہمیں داغ مفارقت دے کر اس قافلے میں جا ملے جو عملی زندگی کے ابتدائی دور میں ان کے محترم استاد اور محبوب رفقا پر مشتمل تھا شیخ الہند مولانا محمود حسن، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی رحمہم اللہ تعالیٰ اور ایک ایسی جگہ خالی کر گئے جسے علما یا سیاسیین کے طبقے میں سے کوئی پُر نہیں کر سکتا وہ جلاوطنی کی طویل مدت کو ختم کر کے جب سے ہندوستان آئے تھے مختلف لوگوں نے مختلف امور میں اُن سے اختلاف کیا کسی نے تعلیم ولی اللٰہی کے اس خلاصے پر اعتراض کیا۔ جسے مرحوم کی سیاسیات و اقتصادیات میں اپنی پارٹی کے مخصوص پروگرام کے طور پر پیش کیا کرتے تھے بعض لوگوں نے سمجھا کہ مولانا کے سامنے کوئی معین چیز نہیں ان کا دماغ مختلف اوقات میں مختلف تحریکات سے متاثر رہا۔ اور ان تمام تاثرات کے مجموعے نے ایک ایسی سکیم کی شکل اختیار کر لی ہے جس پر کوئی گروہ کبھی عمل پیرا نہیں ہو سکتا بعض اصحاب کو یہ نہایت افسوسناک غلط فہمی ہوئی کہ مولانائے مرحوم خدانخواستہ دیر تک غربت کی تکلیفیں اٹھانے کے بعد کمزور ہو گئے ہیں لہٰذا اُن کی سیاسیات میں بھی ایک گونہ کمزوری آ گئی ہے یعنی وہ آزادی ہند کے ویسے سرگرم مجاہد نہیں رہے جیسے کہ مثلاً ۱۹۱۵ء میں تھے۔ لیکن جن لوگوں کو مولانا کے ساتھ مفصل گفتگوؤں کا موقع ملا وہ گواہی دیں گے کہ مرحوم آخری دم تک ویسے ہی وطنی اور اسلامی سپاہی مجاہد تھے جیسے ہندوستان سے قدم باہر نکالنے کے وقت تھے البتہ یہ درست ہے کہ وہ کسی پروگرام کو بُت بنا کر ہمیشہ کے لئے اس کی ایک ایک شق کی پوجا کے قائل نہ تھے بدلے ہوئے حالات بھی اُنہوں نے اپنے مقاصد کی پیش برد کے لئے

نیا پروگرام بنا لیا تھا جس کے متعلق سطحی معلومات پر قناعت کرنے والے غلط فہمیوں میں مبتلا ہوتے رہے
جس پروگرام کو مرحوم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے منسوب فرماتے تھے اس کی تفصیلات میں
اختلاف ہو سکتا ہے یعنی یہ ممکن ہے کہ بعض اہلِ علم کے نزدیک مولانا کے تمام انتسابات درست نہ ہوں
لیکن خود مولانا جب شاہ صاحب مرحوم و مغفور کی تصانیف کے سامنے رکھ کر ایک ایک شق کی تائید میں اقتباسات
پیش کیا کرتے تھے تو ان کے دعاوی بہت ہی پختہ اور محکم معلوم ہوتے تھے کم از کم شاہ صاحب کی تصانیف پر
عبور اور دقتِ نظر کے ساتھ ان کے مطالعہ کی ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی، جیسے کہ مولانا عبید اللہ مرحوم
و مغفور تھے

پھر ان کی مردانگی، اولو العزمی، شانِ ایثار، راہِ حق میں دنیوی مالوفات کی ہر شئے سے بے پروائی
یہ ایسی خصوصیات ہیں جو بڑے بڑے قائدوں اور رہنماؤں میں بھی بہت شاذ ملتی ہیں تکالیف کے
ہجوم میں بھی ان کے چہرہ مبارک پر تبسم اس طرح رقصاں رہتا تھا کہ دیکھنے والے کو وہم بھی نہیں ہو سکتا
تھا۔ کہ مولانا پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

سچے قائد کی طرح وہ اپنے رفیقوں پر بے حد شفیق تھے۔ اپنی ذات کے لئے کبھی کسی فرد یا جماعت یا
سلطنت کے ممنون نہیں ہوئے۔ ان کی زندگی میں ایسے وقت بھی آئے جب بڑے بڑے خزانے صرف
ان کے اشارے کے تابع تھے لیکن انہوں نے اپنی ذات کے لئے کبھی کچھ نہ لیا۔ البتہ پیشِ نظر کام کے سلسلے
میں اپنے رفیقوں کی راحت کے لئے وہ ہمیشہ مضطرب رہتے تھے۔

قرآنِ حکیم کے حقائق پر بڑی وسیع نظر تھی جب کبھی کسی آیت کے متعلق کوئی الجھن ان کے سامنے پیش
کی جاتی تو بے توقف نہایت سادہ اور سہل انداز میں اس کا ہر پہلو اذعان افروز طریق پر واضح فرما دیتے۔
ان کی زبانِ مبارک سے قرآن حکیم کی مختلف سورتوں یا ٹکڑوں کی تفسیر سن کر عامی کے دل میں بھی
کلامِ الٰہی کی عظمت کا خاص احساس پیدا ہو جاتا تھا۔

ان کے دادا ہندو تھے والد نے سکھ دھرم اختیار کر لیا۔ گویا مولانا سکھ پیدا ہوئے بچپن میں یتیم ہو گئے والدہ نے بڑی محبت سے پالا۔ مولوی عبید اللہ کی تحفۃ الہند اور شاہ اسماعیل شہید رح کی تقویت الایمان پڑھ کر اسلام کی تڑپ پیدا ہوئی۔ اس شوق میں گھر سے نکل پڑے۔ اصلی وطن سیالکوٹ تھا لیکن گھر سے نکل کر سندھ میں مولانا تاج محمود مرحوم کے پاس پہنچے۔ تو وہیں کے ہو گئے اور پنجابی ہونے کے باوجود سندھی مشہور ہوئے۔ انہی کے ظل عاطفت میں تعلیم حاصل کی۔ پھر دیوبند میں حضرت شیخ الہند مرحوم سے تکمیل علوم کی۔ پہلے دیوبند میں ایک جماعت کی تنظیم شروع کی۔ پھر دہلی میں مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ جاری کیا۔ ۱۹۱۵ء میں اپنے استاد و مرشد حضرت شیخ الہند مرحوم کے حکم کے مطابق ہندوستان سے افغانستان پہنچے۔ سات برس وہاں رہے۔ پھر روس چلے گئے۔ جہاں لینین۔ سٹالین اور بالشویزم کے دوسرے اکابر سے گفتگوئیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد مختلف یورپی ممالک سے ہوتے ہوئے ترکی گئے۔ پھر اٹلی پہنچے۔ وہاں سے حجاز تشریف لے گئے۔ اور وطن واپس آنے کی اجازت ملنے تک مکہ معظمہ ہی میں مقیم رہے۔

ترک وطن سے پیشتر شادی کی تھی۔ دو صاحبزادیاں پیدا ہوئیں پھر اہلیہ محترمہ اور ایک صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ دوسری صاحبزادی بفضل خدا حیات ہیں۔ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء تاریخ پیدائش تھی۔ بہتر برس اور چند ماہ کی عمر پائی۔

ہندوستان واپس آنے کے وقت اگرچہ خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن حرارت و جوش عمل کا یہ عالم تھا کہ کوئی نوجوان بھی بمشکل ان کی سرگرمیوں کا مقابلہ کر سکتا تھا چند ماہ پیشتر لاہور تشریف لائے تو وعدہ فرمایا تھا کہ دو تین ہفتے یہاں مقیم رہ کر اپنے پروگرام کی ضروری چیزیں سمجھا دیں گے۔ پندرہ بیس روز کے بعد ایک عزیز دوست سے ملنے کے لئے انجمن خدام الدین کے دفتر میں گیا تو معلوم ہوا کہ مولانا تشریف لائے ہوئے ہیں لیکن بیمار ہیں، دو گھنٹے تک پاس بیٹھا رہا

ایک تحریر سنائی جس کے بعض فقروں پر بے اختیار میرے آنسو نکل آئے اس وقت بھی فرمایا کہ دہلی اور سندھ ہوتے ہوئے لاہور آؤں گا۔ اس دنیا میں یہ آخری ملاقات تھی۔ پندرہ بیس روز ہوئے۔ اُن کی ایک مطبوعہ تقریر موصول ہوئی۔ جس کے لفافہ پر پتہ انہوں نے خود لکھا تھا۔ اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ کمزوری کا اب قلم گیری میں بھی تکلیف محسوس کر رہا ہے۔ پھر دفعۃً اطلاع ملی کہ مولانا سخت بیمار ہوگئے ہیں اور حالت نازک ہے۔ آخر وہ مقدر سانحہ بھی پیش آگیا جو ہم سب کو پیش آنا ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

وہ دَورِ حاضرہ کے بہت بڑے عالم، بہت بڑے سیاستدان اور بہت بڑے قائد تھے۔ عام لیڈروں کے شیووں سے کام لے کر ہر دلعزیزی پیدا کرنے پر کبھی راضی نہ ہوئے۔ اس لئے عام نقطۂ نگاہ کے مطابق قدر و منزلت عامہ کا وہ مقام حاصل نہ کر سکے۔ جس کے وہ ہر اعتبار سے اہل تھے لیکن واقف کار اصحاب کی نظروں میں وہ دورِ حاضر کے مخصوص علما میں سے تھے زندگی کے ایسے بیش بہا جواہر اس دنیا میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان کی فطری سعادت کا اس سے بڑا اور روشن تر ثبوت اور کیا ہوگا۔ کہ ایک سکھ گھرانے میں جنم لیا لیکن اسلام کے ایک بلند منزلت عالم قائد، مفکر، مدبر اور مجاہد کی حیثیت میں واصل بحق ہوئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے مرقد مبارک کو انوارِ رحمت کی بارش سے منور رکھے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

(اخبار انقلاب)

غلام رسول مہر

بخدمت قارئین "پیغامِ حق"

مکرمی بھائی صاحبان - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ -

"پیغام حق" علامہ اقبال کی یاد میں سن ۱۹۴۰ء سے متواتر شائع ہو رہا ہے آپ نے دیکھا ہو گا۔ کہ اس رسالہ میں صرف وہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ جو اسلامی فلسفہ اور تعلیماتِ قرآنیہ کی شرح کرتے ہیں اس پرآشوب زمانہ میں جبکہ اسلام و قرآن کے قوانین سے لوگ بُعد اختیار کر رہے ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اسلامی نظریات اور تعلیمات کو عام کیا جائے۔ بقول علامہ اقبال

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی　　　حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

میں آپ سے اس سلسلہ میں صرف اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ اگر آپ پیغام حق کے خریدار ہیں تو کم از کم چھ ایسے حضرات کے نام و پتہ سے مجھے آگاہ کیجئے۔ جو آپ کے خیال میں اس پرچہ کی خریداری منظور کر لیں گے۔ تاکہ اُن سے خط و کتابت کی جائے اگر آپ سے ممکن ہو تو آپ خود بھی کچھ تھوڑا سا وقت نکال کر اس پرچہ کی توسیع اشاعت کے لئے کام کیجئے۔ اور اگر آپ خریدار نہیں ہیں تو آپ خود بھی خریداری قبول کریں۔ اور احباب کو بھی اس طرف متوجہ کریں اور کم از کم چھ حضرات کے نام و پتہ سے مجھے آگاہ کریں۔ آپ اسی فارم پر ایسے حضرات کے نام لکھ کر مجھے ارسال فرما سکتے ہیں۔ جس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ رسالہ کا سالانہ چندہ صرف چار روپے ہے براہ کرم اپنے ہاں کے ایجنٹ رسائل و اخبارات کے پتہ سے بھی مطلع فرمائیں۔

نیازمند

منیجر رسالہ پیغام حق نمبر ۳۲ اعظم بیرون موچی دروازہ
سرکلر روڈ - لاہور -

عِلم اور مذہبی تجربہ

از ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

ترجمہ

جناب اختر مسعود بی۔ اے

(۲)

اگست کی اشاعت میں اس مضمون کی جو قسط طبع ہوئی تھی اُس میں جناب مترجم کا نام نہ لکھا گیا جس کے لئے مجھے افسوس ہے۔ (محمد شاہ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی زندگی کا ایک نقطۂ آغاز ہے۔ لیکن اس کی تقدیر وانتہا شاید یہی ہے۔ کہ وہ ہیئت ہستی میں ایک مستقل عنصر بن جائے۔

"کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اُسے محض ایک بیکار چیز سمجھ کر پرے پھینک دیا جائیگا آغاز میں کیا وہ ایک جینن ہی نہیں تھا۔ پھر وہ گاڑھا خون بنا دیا گیا جس میں سے خدا نے اس کی شکل وصورت ڈھالی۔ اور پھر اُسے جوڑا بنا دیا گیا۔ یعنی مرد وزن۔ کیا وہ (خدا) اتنا طاقتور نہیں ہے۔ کہ مردوں کو زندہ کر دے"

جب انسان اپنے گردوپیش کی قوتوں کے انجذاب وکشش سے متاثر ہوتا ہے تو اُس میں اتنی طاقت موجود ہے۔ کہ ان کی تنظیم ورہنمائی کر سکے۔ جب یہ قوتیں اس کی مزاحم ہوں تو اس میں اتنی قابلیت اور استعداد موجود ہے۔ کہ وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں ایک وسیع تر دنیا آباد کرلے جس کے اندر وہ اپنے لئے بے پایاں مسرت اور تخلیقی تحریک کے ذرائع دریافت کر لیتا ہے۔ پھول کی پتی سے زیادہ نحیف وناتواں وجود اور کام ایسا کٹھن۔ اس کے باوجود

روح انسانی کے مقابل حقیقت کی کوئی ایک شکل بھی اتنی پر قوت - ایسی حیات بخش اور اس قدر خوبصورت نہیں ہے - اور یوں قرآنی تصور کے پیش نظر انسان اپنے داخلی وجود کے لحاظ سے ایک تخلیقی عمل ہے - ایک بلند پرواز روح ہے - جو اپنی پیش قدمی کے دوران میں منازل ہستی کو یکے بعد دیگرے پیچھے چھوڑتی چلی جاتی ہے -

" یہ ضروری نہیں ہے کہ میں شفق کی قسم کھاؤں اور رات کی اور ان کی جن کو رات اپنی آغوش میں جمع کر لیتی ہے اور چودھویں کے چاند کی کہ تمہیں یقیناً منزل بہ منزل آگے لے جایا جائیگا"

یہ انسان کے لئے مقدر ہے کہ وہ اپنی دنیائے گرد و پیش کی گہری تمناؤں میں شریک ہے اور اپنی اور ساتھ ہی اس کائنات کی تقدیر ڈھالنے میں کبھی تو اس کی قوتوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرلے - اور کبھی اپنی پوری توانائی ان قوتوں کو اپنے مقاصد و عزائم کے مطابق کرنے میں صرف کردے - اور اس تخلیقی تغیر کے دوران عمل میں خدا ایک رفیق کار کی حیثیت میں اس کا ساتھی بن جاتا ہے - بشرطیکہ آغاز و اقدام خود انسان کی اپنی طرف سے ہو"

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ -

" خدا یقیناً اس قوم کی حالت نہیں بدلے گا - جب تک کہ وہ خود اپنی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرے گی"

اگر وہ پہل اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا - اگر وہ اپنے وجود کے اندر چھپے ہوئے بیش قیمت جوہروں کو صیقل نہیں کرتا - اگر وہ منزقی زندگی کی داخلی ریل پیل کا احساس کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے - تو اس کے اندر روح پتھر کی طرح سخت ہو جاتی ہے - اور وہ پست ہو کر بے جان مادہ کی سطح پر آجاتا ہے - لیکن اس کی حیات اور اس کی روح کی پیش قدمی اس حقیقت کے ساتھ تعلقات کے قیام و استقرار پر منحصر ہے - جسے وہ ہر طرف سے اپنے مقابل پاتا ہے - ان

تعلقات کا ربط و قیام علم کے ذریعے عمل میں آتا ہے اور علم حسی ادراک (SENCE PERCEPTION) ہے۔ جس کی تکمیل فہم سے ہوتی ہے۔

"جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا" میں زمین پر ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں" انہوں نے جواب دیا" کیا تو ایک ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو وہاں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا جب کہ ہم تیری تقدیس و تحمید کرتے ہیں اور تیری عظمت و جلال کے گیت گاتے ہیں۔ خدا نے کہا "بے شک میں وہ کچھ جانتا ہوں جس کا تمہیں علم نہیں ہے اور اس نے آدم کو تمام اشیاء کے نام بتا دیئے اور پھر انہیں فرشتوں کے سامنے رکھ کر پوچھا " اگر تم عقل و خرد کے حامل ہو درا ہو تو مجھے ان اشیاء کے نام بتاؤ" انہوں نے کہا "اے کہ فقط تیری ذات قابل حمد و ستائش ہے ہم کچھ نہیں جانتے۔ مگر وہی جو تو نے ہمیں بتایا ہے تو جاننے والا ہے تو دانا ہے" اس نے کہا اے آدم انہیں (ان اشیاء کے) نام بتاؤ۔ اور جب اس نے انہیں نام بتا دیئے تو خدا نے کہا کہ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں جانتا ہوں اور یہ کہ جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپائے رکھتے ہو (وہ بھی) جانتا ہوں۔

ان آیات سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اشیا کے نام رکھنے کی صلاحیت ودیعت کردی گئی ہے۔ یعنی اشیا کے تصورات تشکیل کرنے کی استعداد اور ان کے تصورات تشکیل کرنا انہیں مسخر کرنا ہے۔ اس لئے انسانی علم کی نوعیت تصوری (CONCEPTUAL) ہے۔ اور انسان اسی تصوری علم کے بل بوتے پر حقیقت کے قابل مشاہدہ پہلو تک پہنچتا ہے۔ قرآن کی ایک قابل ملاحظہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقیقت کے اس مذکورہ بالا پہلو پر زور دیتا ہے مجھے یہاں چند ایک اور آیات پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔

یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں رات اور دن کے رد و بدل میں ان جہازوں

ہیں جو سمندر کے بیچ میں سے گذرتے ہیں۔ اور انسان کے فائدے کی ان چیزوں میں جو اُن پہ بار ہوتی ہیں۔ اور بارش میں جسے خدا آسمانوں سے نیچے گراتا ہے۔ اور جو زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد نئی زندگی بخشتی ہے۔ اور ہر طرح کے مویشی اس پہ پھیلا دیتی ہے۔ اور ہواؤں کے تغیر میں۔ اور بادلوں میں جو آسمانوں اور زمین کے درمیان خدمت پر مامور ہیں۔ اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سمجھدار ہیں۔"

"اور یہ وہی (خدا) ہے جس نے ستاروں کو پیدا کیا تاکہ تم ان کی مدد سے بحر و بر کی تاریکی میں اپنی رہبری کر سکو۔ اہلِ علم کے لئے ہم نے اپنی نشانیاں واضح کردی ہیں اور یہ وہی ہے جس نے تمہیں تنِ واحد سے پیدا کیا ہے اور تمہارے لئے ایک جائے قیام (دنیا میں) اور ایک جائے استراحت (قبر میں) مہیا کردی ہے۔ اہلِ بصیرت کے لئے ہم نے اپنی نشانیاں واضح کردی ہیں۔ اور یہ وہی ہے۔ جو آسمانوں سے بارش برساتا ہے اور ہم ہی اس کے ذریعے ہر طرح کے پودوں کی کونپلیں نکالتے ہیں۔ اور پھر بعض میں سے ہم ہی ہرے بھرے پتے پیدا کردیتے ہیں اور بعض میں سے گتھے ہوئے دانے۔ اور کھجور کے درختوں سے یعنی ان کے گابوں سے کھجوروں کے گچھے پیدا کرتے ہیں۔ جو اپنے بوجھ سے نیچے کو جھکے رہتے ہیں۔ اور (ہم) انگور زیتون اور انار کے باغ پیدا کرتے ہیں۔ جو آپس میں مشابہ بھی ہیں۔ اور غیر مشابہ بھی۔ اور ان درختوں کو دیکھو جب کہ یہ پھل لائیں اور اس وقت بھی جب کہ اُن کے پھل پک رہے ہوں۔ اہلِ ایمان کے لئے بے شک ان چیزوں میں (خدا کی) نشانیاں ہیں۔"

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہارا پروردگار سایے کو کس طرح لمبا کردیتا ہے اگر وہ چاہتا تو اسے بے حرکت اور ساکن بنا دیتا۔ لیکن ہم نے سورج کو اس کا رہنما بنایا۔ اور پھر ہم آسانی کے ساتھ اُسے اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔"

"کیا وہ بادلوں کی طرف نہیں دیکھ سکتے کہ وہ کس طرح پیدا کئے گئے ہیں اور آسمان کی طرف کہ وہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ وہ کس طرح پیوست ہیں اور زمین کی طرف کہ وہ کس طرح پھیلائی گئی ہے۔"

"اور آسمانوں کی تخلیق اور زمین کی بھی اور تمہارا اختلاف رنگ و زبان خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اور بے شک تمام انسانوں کے لئے ان میں نشانیاں ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت کے اس مفکرانہ مشاہدہ سے قرآن کا فوری مقصد انسان کے دل میں اس طاقت کا شعور پیدا کرنا ہے جس کے لئے فطرت بطور علامت ونشان ایک پردہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن قابل غور نکتہ قرآن کا عام تجربی انداز فکر ہے جس نے اپنے ماننے والوں میں 'واقعی' یا 'موجود' (ACTUAL) کے لئے ایک جذبہ احترام پیدا کر دیا۔ اور آخر کار انہیں جدید سائنس کا موجد بنا دیا۔ ایک ایسے دور میں جبکہ مرئی (VISIBLE) کو تلاش ذات خداوندی کے سلسلے میں کمی اور غیر اہم شے سمجھ کر ترک کر دیا گیا تھا۔ تجربی (EMPIRICAL) روح کی بیداری ایک معرکہ تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں قرآن کے نزدیک یہ کائنات اپنے اندر ایک اہم مقصد پنہاں رکھتی ہے۔ اس کی بدلتی ہوئی حقیقتیں ہماری ہستی کو تازہ بتازہ وضع وشکل اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ وہ ذہنی کوشش جو اس کی مزاحمت پر غالب آنے کے لئے ضروری ہے ہماری زندگی کو مالا مال اور اس میں وسعت پیدا کرنے کے علاوہ ہماری بصیرت کو روشن تر کر دیتی ہے۔ اور اس طرح ہمیں انسانی تجربہ کے لطیف تر پہلوؤں میں اور زیادہ متصرفانہ شمول کے لئے تیار کرتی ہے اشیاء کے زمانی بہاو (TEMPORAL FLUX) کے ساتھ ہمارا یہ تاملانہ (REFELCTIVE) اتصال ہی ہمیں غیر زمانی کو عقلی طور پر دیکھنے کی تربیت دیتا ہے۔

حقیقت اپنے ہی ظواہر (APPEARANCES) میں زندہ ہے اور انسان جیسی ہستی جسے ایک مزاحم ماحول میں اپنی حیات برقرار رکھنا پڑتی ہے۔ مرئی (VISIBLE) سے تجاہل نہیں برت سکتا۔ قرآن تغیر کے واقعۂ عظیمہ کی طرف ہمیں توجہ دلاتا ہے جسے ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور جس پر قابو پانے کے بعد ہی اس بات کا امکان ہے کہ ہم کوئی پائیدار تہذیب تعمیر کرسکیں۔ ایشیا بلکہ قدیم دنیا کی ساری تہذیبوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور اس لئے کہ انہوں نے محض داخلی طور پر حقیقت تک پہنچنا چاہا، اور داخل سے خارج کی طرف حرکت کی۔ اس طریق کار کے ذریعے انہیں خالی خولی نظریہ مل گیا۔ مگر طاقت سے عاری اور محض نظریہ پر کسی پائیدار تہذیب کی بنیادیں نہیں رکھی جاسکتیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ معرفت ذات باری کے ماخذ کی حیثیت میں مذہبی تجربہ کو تاریخی اعتبار سے انسانی تجربہ کے دوسرے پہلوؤں پر سبقت حاصل ہے یہ مانتے ہوئے کہ انسانیت کی روحانی زندگی میں تجربی (EMPIRICAL) انداز فکر کی منزل ناگزیر ہے قرآن انسانی تجربہ کے تمام پہلوؤں کو اس لحاظ سے یکساں اہمیت دیتا ہے کہ یہ حقیقت ازلی کے متعلق جو داخل و خارج میں اپنی نشانیوں کا مظاہرہ کرتی ہے علم و آگاہی بخشتے ہیں۔ جو حقیقت ہمارے بالمقابل ہے۔ اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا ایک بالواسطہ طریقہ متاملانہ (REFLECTIVE) مشاہدہ اور حسی ادراک کے سامنے اس کے نشانات (SYMBOLS) جس طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ اُن پر قبضہ و اختیار ہے دوسرا طریقہ اس حقیقت کے ساتھ جس طرح کہ باطن میں یہ اپنا اظہار کرتی ہے بلاواسطہ رسم و راہ پیدا کرنا ہے۔ قرآن کی فطریت (NATURALISM) محض اس امر کی شناخت اور پہچان ہے۔ کہ انسان فطرت سے متعلق ہے اور اس تعلق کو قوائے فطریہ پر قابو پانے کے ایک امکانی

ذریعے کی حیثیت میں بالضرور کام میں لانا چاہیئے مگر ہوس اقتدار کی خواہش فاسدہ کے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ روحانی زندگی کی آزاد و مترقی حرکت کے اعلیٰ و شریفانہ مقصد کے پیش نظر۔ لہذا حقیقت کی مکمل رویت حاصل کرنے کے لئے حسی ادراک کے ساتھ اُس ادراک کا اضافہ بھی ضروری ہے جسے قرآن فواد یا قلب کہہ کر پکارتا ہے۔

"سب چیزیں خدا نے بنائی ہیں جن کی تخلیق اُس نے بہترین انداز میں کی ہے۔ اور پھر اس نے مٹی سے انسان کی تخلیق شروع کی۔ پھر زندگی کے بیجوں سے اس کی نسل پیدا کی (اور) گندے پانی سے۔ پھر اس کا ڈھانچہ بنایا۔ اور اپنی روح اس میں پھونکی اور تمہیں کان۔ آنکھیں اور 'دل' عطا کیا۔ تم کتنے کم شکرے ہو۔"

قلب ایک قسم کا وجدان یا داخلی بصیرت ہے جو رومی کے خوبصورت الفاظ میں "سورج کی شعاؤں سے پرورش پاتا ہے اور حقیقت کے اُن پہلوؤں کے ساتھ ہمارا ربط و اتصال قائم کرتا ہے جو حسی ادراک کی دسترس سے باہر ہیں۔ قرآن کے نزدیک یہ ایک ایسی چیز ہے جو دیکھتی ہے۔ اور اگر اس کی اطلاعات کی ٹھیک ٹھیک تشریح کی جائے تو یہ کبھی غلط نہیں ہوتیں لیکن پھر بھی یہ کوئی خاص پر اسرار استعداد نہیں ہے بلکہ حقیقت کے ساتھ ہمارے میل جول اور تعلق کی ایک خاص وضع ہے جس میں حسیت (SENSATION) اپنے عضویاتی (PHYSIOLOGICAL) مفہوم میں کوئی حصہ نہیں لیتی۔ اس کے باوجود دل کے توسط سے تجربہ کا جو منظر ہمارے لئے کھل جاتا ہے۔ وہ اتنا ہی ٹھوس اور حقیقی ہے جتنا کسی اور ذریعے سے حاصل شدہ تجربہ۔ اسے نفسی (PSYCHIC) متصوفانہ (MYSTIC) یا مافوق الفطری کہہ دینا بحیثیت تجربہ اس کی قدر و اہمیت کو گھٹا نہیں سکتا۔ قدیم انسان کے لئے ہر تجربہ کی نوعیت مافوق الفطری تھی۔ زندگی کی فوری ضروریات کے

اقتضا نے اُسے اپنے تجربہ کی تطبیق پر مجبور کر دیا اور انہی تطبیقات سے آہستہ آہستہ لفظ
فطرت ہمارے آج کے مفہوم و معانی میں نمودار ہو گیا۔ حقیقتِ کلی جو ہمارے وقوف و آگہی
میں داخل ہوتی ہے اور تطبیق پانے پر ایک (تجربی واقعہ) (EMPIRICAL FACT
ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارے شعور کو گھیر لینے کے اور بھی ذرائع اپنے پاس موجود رکھتی ہے اور
تطبیق کے مزید مواقع مہیا کر دیتی ہے۔ نوعِ انسانی کا الہامی اور صوفیانہ ادب اس امر کی
کافی سے زیادہ دلیل ہے کہ انسانوں کی تاریخ میں مذہبی تجربہ کو اتنی دیرپا اور نمایاں
حیثیت حاصل رہی ہے کہ اسے محض التباس کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا اس لئے کوئی وجہ
نظر نہیں آتی کہ کیوں انسانی تجربہ کی معمولی سطح کو واقعی حیثیت دیدی جائے اور اس کی
باقی ماندہ سطحوں کو متصوفانہ اور جذباتی کہہ کر رد کر دیا جائے۔ مذہبی تجربہ کے حقائق
(FACTS) انسانی تجربہ کے دوسرے حقائق کی طرح حقیقتیں ہیں۔ اور تطبیق کے ذریعے
علم بخشی کی قابلیت کے لحاظ سے ایک حقیقت (FACT) اتنی ہی موزوں ہے جتنی کہ
دوسری۔ اور نہ ہی انسانی تجربہ کے اس مخصوص حصے کا انتقادی معائنہ کسی قسم کی بے ادبی
ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نفسی مظہر (PSYCHIC PHENOMENA) کے اولین
تنقیدی شاہد (CRITICAL OBSERVER) تھے۔ بخاری اور حدیث کے دوسرے راویوں نے
ابن سیّد ایک یہودی نوجوان۔ جو نفسی قوت سے جلد متاثر ہو جاتا تھا کے متعلق رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدات کو بالتفصیل بیان کیا ہے جس کی مجذوبانہ کیفیات نے ان کی توجہ
اپنی طرف پھیری تھی۔ انہوں نے اس کا امتحان کیا۔ اس پر سوالات کئے اور اس کی مختلف کیفیات
میں اُس کا معائنہ کیا۔ ایک دفعہ اس کی بڑبڑاہٹ یعنی مجذوبانہ گفتگو سننے کے لئے رسول اللہ
نے اپنے آپ کو ایک درخت کے پیچھے چھپا لیا۔ لیکن لڑکے کی ماں نے اسے ان کی آمد سے آگاہ

ماں نے اُسے ان کی آمد سے آگاہ کر دیا۔ اس پر فوراً ہی لڑکے کی وہ کیفیت جاتی رہی۔ بات
یوں دیکھ کر رسول اللہ نے فرمایا" اگر یہ اُسے اپنی حالت پر رہنے دیتی تو سارا معاملہ صاف ہو جاتا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جن میں سے بعض تاریخ اسلام میں اس پہلے نفسیاتی مشاہدہ
کے وقت وہاں موجود تھے۔ اور بعد کے راویوں نے بھی جنہوں نے باحتیاط اس اہم واقعہ کو نقل کیا
ہے۔ رسول اللہ کے طرز عمل کی اہمیت کو بالکل غلط سمجھا۔ اور اس کی تطبیق اپنے ہی معصومانہ انداز
میں کردی۔ پروفیسر میکڈانلڈ کو جسے صوفیانہ اور پیغمبرانہ شعور کے بنیادی نفسیاتی فرق و امتیاز کا
کوئی علم نہیں ہے اس تصویر میں کہ مجلس تحقیق نفسی کے طریقہ پر ایک پیغمبر دوسرے پیغمبر کے مطالعہ
و معائنہ میں مصروف ہے ظرافت ہی ظرافت نظر آتی ہے۔ قرآن کی روح سے زیادہ گہری
آشنائی اور مناسبت پروفیسر مذکور کو رسول اللہ کے اس نفسی مشاہدہ میں ایک ممتاز اور غیر معمولی
طور پر معنی خیز بات دیکھنے پر مجبور کر دیتی۔ جیسا کہ میں دوسرے خطبہ میں ثابت کروں گا یہ روح قرآن
ہی تھی جس نے اس تہذیبی تحریک کی داغ بیل ڈالی جو آخر کار جدید عملی طرز فکر کے آغاز پر منتج ہوئی
بہر حال ابن خلدون جس نے صوفیانہ شعور کی تحقیق اوروں سے زیادہ ناقدانہ رنگ میں کی تھی۔
اور جو ذوات لطیفہ (SUBLIMINAL SELVES) کے جدید مفروضہ کے بہت قریب پہنچ گیا
تھا۔ پہلا مسلمان ہے جس نے رسول اللہ کے طرز عمل کا مفہوم اور اس کی صحیح قدر و قیمت کو پہچانا۔
جیسا کہ پروفیسر میکڈانلڈ کہتا ہے" ابن خلدون بعض نہایت ہی دل چسپ نفسیاتی خیالات رکھتا
تھا۔ اور بہت اغلب ہے کہ وہ ولیم جیمز کی کتاب (مذہبی تجربہ کے اقسام) سے گہری دلچسپی
لیتا" جدید نفسیات نے ابھی حال ہی میں صوفیانہ شعور کے مواد کے باحتیاط اور منضبط مطالعہ
کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ اور ابھی تک ہمارے پاس کوئی حقیقی طور پر موثر علمی اسلوب
نہیں ہے جس کے ذریعے ہم شعور کے غیر عقلی اطوار (MODES) کا تجزیہ کر سکیں جتنا وقت

میرے پاس ہے اُس میں یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ میں صوفیانہ شعور کی تاریخ اور اس کے مختلف منازل پر اُن کی معنی خیزی اور وضاحت کے لحاظ سے کسی قسم کی جامع اور سیر حاصل تحقیق پیش کرسکوں میں اتنا ہی کرسکتا ہوں کہ صرف صوفیانہ تجربہ کی اہم ترین خصوصیات پر چند ایک عمومی مشاہدات آپ کے سامنے رکھ دوں۔

(۱) سب سے پہلی قابل لحاظ بات اس تجربہ کی فوریت (IMMEDIACY) ہے۔ مگر اس خصوص میں یہ تجربہ انسانی تجربہ کی دوسری سطحوں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ جو علم کے لئے مواد مہیا کرتی ہیں۔ فوریت ہر تجربہ کا لازم ہے جس طرح عمومی تجربہ کا دائرہ خارجی دنیا کے علم کے لئے حسی مواد (SENSE DATA) کی تطبیق پر مجبور ہے اسی طرح صوفیانہ تجربہ کا خطہ ہمارے علم معرفت ذات خداوندی کی خاطر محتاج تطبیق ہے۔ صوفیانہ تجربہ کی فوریت سے مراد صرف اتنی ہے کہ ہم خدا کو بعینہٖ اُسی طرح جانتے ہیں جس طرح کہ دوسری اشیاء کو۔ خدا کوئی ریاضیاتی کلیہ یا کوئی نظام تصورات نہیں ہے۔ جو آپس میں تو ایک دوسرے سے متعلق ہیں مگر تجربہ سے اُنہیں کوئی تعلق و نسبت نہیں۔

(۲) دوسری بات صوفیانہ تجربہ کی ناقابل تجزیہ تمامیت (WHOLENESS) ہے۔ جب مجھے اپنے سامنے پڑے ہوئے میز کا تجربہ ہوتا ہے تو لاتعداد تجربی مواد میز کے تجربۂ واحد میں ضم ہو جاتے ہیں مواد کی اُس کثرت میں سے میں صرف انہی کا انتخاب کرتا ہوں جو ایک خاص سلسلہ زمان و مکان میں مرتب ہوتے ہیں اور پھر میز کے حوالہ و نسبت سے اُن میں ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہوں مگر ایک صوفیانہ کیفیت میں خواہ وہ کتنی گہری۔ واضح اور پُر از معنی کیوں نہ ہو فکر گھٹ کر اپنی سب سے نچلی سطح پر آجاتا ہے اور اس طرح مذکورہ قسم کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن صوفیانہ کیفیت اور عام عقلی شعور کے اس فرق و اختلاف کا مطلب

شعور عمومی سے انقطاع نہیں ہے۔ جیسا کہ پروفیسر ولیم جیمز غلطی سے سمجھتا تھا۔ ہر دو حالتوں میں ایک ہی حقیقت ہم پر کار فرما ہے۔ عام عقلی شعور ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی عملی ضرورت کے پیش نظر حقیقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اور جوابی فعل (RESPONCE) کے لئے یکے بعد دیگرے محرکات (STIMULI) کے علیحدہ علیحدہ مجموعوں کا انتخاب کرتا ہے صوفیانہ کیفیت حقیقت کے اس مکمل بہاؤ سے ہمارا اتصال پیدا کر دیتی ہے۔ جہاں مختلف قسم کے محرکات ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک ایسی ناقابل تحلیل وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس میں عامل و معمول کا عام امتیاز موجود ہی نہیں ہوتا۔

(۳) تیسری قابل ملاحظہ بات یہ ہے کہ صوفی کے لئے صوفیانہ کیفیت ایک بے مثال دوسرے وجود کے ساتھ بڑے گہرے ربط وضبط کا ایک ایسا مافوقی اور محیط لمحہ ہے۔ جس میں عارضی طور پر فاعل تجربہ کی ذاتی شخصیت بالکل دب جاتی ہے۔ صوفیانہ کیفیت اگر اس کے محمول (CONTENT) کو پیش نظر رکھا جائے تو بے حد معروضی (یعنی حقیقی) چیز ہے اور کسی طرح بھی خالص باطنیت کے دھندلکوں میں خلوت گزینی سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ لیکن آپ مجھ سے دریافت فرمائیں گے۔ کہ خدا کی ذات کا فوری تجربہ بہ حیثیت ایک مستقل دوسرے وجود کے ممکن کیسے ہے؟ محض یہ امر کہ صوفیانہ کیفیت ایک انفعالی (PASSIVE) حالت ہے اس بات کا قطعی ثبوت نہیں کہ جس وجود کا تجربہ ہوتا ہے وہ واقعی ایک "دوسرا" وجود ہے؟ یہ سوال اس لئے دماغ میں پیدا ہوتا ہے کہ ہم بغیر کسی تنقید کے فرض کر لیتے ہیں کہ ہمارا تمام علم اسی قسم کا ہے جیسا کہ خارجی دنیا کا علم جو ہمیں حسی ادراک کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اگر یہ ایسا ہی ہوتا تو خود ہمیں اپنے وجود کی حقیقت پر کبھی یقین نہ ہو سکتا۔ پھر بھی میں جواب کے طور پر اپنے روزمرہ کے اجتماعی تجربے اور اس سوال میں جو مشابہت ہے۔ اس کی طرف توجہ دلاتا ہوں اپنے معاشری

میل جول کے دوران میں ہم کس طرح دوسرے نفوس یا اذہان کی موجودیت کا علم حاصل کرتے ہیں؟ بہ ظاہر ہے کہ ہمیں اپنے وجود اور فطرت کا علم علی الترتیب داخلی تأمل (REFLECTION) اور حسی ادراک کے ذریعے ہوتا ہے۔ دوسرے نفوس یا اذہان کو تجربہ میں لانے کے لئے ہمارے پاس کوئی علٰحدہ حس (SENSE) نہیں ہے۔ میرے پاس کسی باشعور وجود کی معرفت کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ مجھ سے مشابہ جسمانی حرکات ہیں جن سے کسی وجود کی موجودیت مجھ پر ثابت ہوتی ہے۔ یا پروفیسر رائیس (ROYCE) کے تتبع میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کے وجود کو اس لئے حقیقی مانتے ہیں کہ وہ ہمارے اشاروں کا جواب دیتے ہیں اور یوں ہمیشہ ہمارے نامکمل مفہوم کے لئے ضروری ضمیمہ بہم پہنچاتے رہتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ جوابی فعل (RESPONSE) کسی باشعور وجود کے موجود ہونے کا ثبوت ہے اور اس ضمن میں قرآن کا نظریہ بھی یہی ہے۔

"اور تمہارا رب کہتا ہے: مجھے پکارو اور میں تمہاری پکار کا جواب دیتا ہوں۔"

"اور جب میرے بندے میرے متعلق تجھ سے پوچھتے ہیں تو میں ان کے بہت ہی قریب ہوتا ہوں اور جو مجھے پکارتا ہے اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔"

یہ صاف ظاہر ہے کہ خواہ ہم جسمانی معیار برتیں یا غیر جسمانی معیار عاید کریں اور یا پھر پروفیسر رائیس کے موزون تر معیار کا اطلاق کریں۔ دوسرے اذہان کے متعلق ہمارے علم کی حیثیت محض استخراجی ہی رہتی ہے اس کے باوجود ہمیں یہی محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے اذہان کے متعلق ہمارا تجربہ فوری ہے اور اس معاشری تجربہ کے واقعی ہونے میں ہم نے کبھی کسی شک کو اپنے دل میں راہ نہیں دی۔ لیکن میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی تحقیق کی موجودہ سطح پر دوسرے اذہان کے متعلق اپنے علم کے پوشیدہ مفہوم کو بنا قرار دے کر کسی محیط و جامع وجود کی حقیقت کی تصدیق و تائید

کے لئے ایک عینی دلیل استوار کرلیں۔ مجھے جو کچھ دکھانا مقصود ہے۔ وہ صرف اتنا ہے کہ صوفیانہ کیفیت میں ہمارے تجربہ کی نوریت بغیر کسی مثال یا نظیر کے نہیں ہے۔ ہمارے عمومی تجربے سے یہ کسی نہ کسی حد تک مماثلت رکھتی ہے اور شاید یہ ہے بھی اسی ذیل سے۔

(۴) چونکہ صوفیانہ تجربہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں تجربہ براہ راست اور بلا واسطہ ہوتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اسے کسی دوسرے شخص تک منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ صوفیانہ کیفیات فکر کی بجائے زیادہ تر جذبے سے مشابہ ہیں۔ پیغمبر یا صوفی اپنے مذہبی تجربہ کے محمولات (CONTENTS) کی جو تشریح کرتا ہے اُسے تو قضایا کی صورت میں دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے لیکن اصل محمولات (CONTENTS) دوسروں تک منتقل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح قرآن کی مندرجہ ذیل آیات میں تجربہ کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے اُس کے محمولات کو نہیں۔

یہ انسانی حدود سے باہر ہے کہ خدا اُس کے ساتھ کلام کرے۔ مگر رویت میں یا نقاب کے پیچھے سے یا پھر یہ کہ وہ اپنا پیغمبر بھیجے اور وہ اُس کے حکم سے جو وہ (اللہ) چاہتا ہے اُسے ظاہر کرے کیونکہ وہ عظمت والا ہے دانا ہے۔ ۵۰ : ۴۲

" غروب ہونے والے ستارے کی قسم تمہارا ہم وطن غلطی پر نہیں اور نہ ہی وہ بھٹکا ہوا ہے اور نہ ہی اس کی باتیں اس کی ذاتی ترنگ کا نتیجہ ہیں۔ قرآن اُس پر نازل شدہ وحی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے ایک ایسی شخصیت نے اُسے یہ قرآن سکھایا ہے جو مضبوط طاقت والا ہے اور جسے دانائی سے نوازا گیا ہے وہ اُفق کے بلند ترین مقام پر یکساں توازن سے کھڑا رہا۔ پھر وہ نزدیک تر آ گیا۔ اور آگے بڑھا۔ وہ دو کمانوں کے فاصلے پر تھا بلکہ اس سے بھی قریب۔ اور اس نے خدا کے بندے کو بتایا جو کچھ کہ اُس نے بتایا۔ اُس کے دل نے جو کچھ دیکھا تھا اُس کی تکذیب نہیں کی۔ کیا پھر تم اس کی دیکھی ہوئی چیز کے بارے میں اس سے جھگڑا کرو گے۔ اُس نے ایک بار پہلے

بھی اُسے دیکھا تھا سدرہ کے قریب جو سرحد کا نشان ہے۔ (اور) جس کے پاس باغ ہے آرام کرنے کے لئے۔ جب کہ سدرہ کا درخت ڈھنپا ہوا تھا جس سے کہ وہ ڈھنپا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ نہ کسی طرف پھری اور نہ کہیں بھٹکی۔ کیونکہ پروردگار کی عظیم ترین نشانی اس کے سامنے تھی۔"

صوفیانہ تجربہ کی غیرانتقالی حیثیت اس وجہ سے ہے کہ اصل میں یہ غیر ناطق جذبہ کی ایک کیفیت ہے جسے ادراک یا عقل نے چھوا تک نہیں۔ لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ تمام جذبوں کی طرح صوفیانہ جذبہ میں بھی ایک وقوفی عنصر موجود ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسی وقوفی عنصر کی بدولت یہ 'خیال' یا 'عین' کے قالب میں ڈھل جاتا ہے در اصل جذبہ کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ فکر میں اپنے اظہار کی کوشش کرتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں یعنی 'جذبہ' اور 'خیال' داخلی تجربہ کی ایک ہی اکائی کے غیرزمانی اور زمانی پہلو ہیں لیکن اس مسئلہ پر میں پروفیسر ہاکنگ (HOCRING) کو نقل کرنے سے زیادہ بہتر اور کچھ نہیں کرسکتا۔ جنہوں نے مذہبی شعور کے محمول (CONTENT) کی عقلی توجیہہ کے جواز کے سلسلے میں جذبہ کا غیر معمولی طور پر گہرا مطالعہ کیا ہے "غیر جذبہ یعنی جذبہ کے ماسوا وہ کیا چیز ہے جو اس کی تسکین کا باعث ہوسکتی ہے میرا جواب ہے۔ کسی معروض کا شعور۔ جذبہ ایک شاعر الذات ہستی کا تمام کمال عدم استحکام ہے (یعنی اس کے ربط و نظم کو ڈھیلا کردیتا ہے)؛ اور وہ چیز جو اس کے استحکام کو بحال کرسکتی ہے اس کی اپنی ذات میں مضمر نہیں بلکہ اس سے ماوراء ہے۔ جس طرح 'خیال' یا 'عین' خارج میں اطلاع دیتا ہے۔ اسی طرح جذبہ خارج کی طرف ابھرتا ہے اور کوئی جذبہ بھی اتنا اندھا نہیں ہے۔ کہ اسے اپنے معروض کا شعور حاصل نہ ہو۔ جب کوئی جذبہ دماغ پر مستولی ہوتا ہے تو اس جذبہ کے ایک اہم جزو کے طور پر اس بات کا کچھ نہ کچھ خیال بھی دماغ میں موجود ہوتا ہے کہ کس قسم کی چیز اسے حالت سکون پر لاسکتی ہے۔ ایک ایسا جذبہ جس کی کوئی سمت متعین نہ ہو ویسا ہی ناممکن ہے جس طرح ایک

عمل یا سمت اور سمت کسی نہ کسی معروض کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ شعور کی ایسی مبہم کیفیات موجود ضرور ہیں جن میں سمت بالکل مفقود نظر آتی ہے۔ لیکن قابل ملاحظہ امر یہ ہے کہ ایسی حالتوں میں جذبہ بھی دبا رہتا ہے۔ مثال کے طور اگر مجھے کوئی چندھیا دینے والی ضرب پہنچے تو عین اُس وقت نہ تو مجھے حادثہ کی نوعیت سمجھ میں آئیگی اور نہ کوئی تکلیف محسوس ہوگی۔ مگر باوجود اس بات کا پورا احساس رہے گا کہ کچھ ہوا ضرور ہے ایسی حالت میں تجربہ جذبہ کے طور پر نہیں بلکہ محض واقعہ کی حیثیت میں شعور کے کنارے ایک لمحہ کے لئے انتظار کرتا ہے تا آنکہ عین یعنی خیال اُسے سمجھتا ہے اور جوابی فعل کے لئے ایک راہ واضح کر دیتا ہے اس کا تکلیف دہ ہونا بھی عین اسی وقت محسوس ہوتا ہے اگر یہ بات درست ہے تو جذبہ بھی آمادہ ہے۔۔۔۔ واقعی (OBJECTIVE) شعور ہے جتنا کہ 'خیال' یہ اپنے آپ کو ہمیشہ ذات حال (PRESENT SELF) سے ماورا کسی چیز سے محول و منسوب کرتا ہے۔ اور اس کی اپنی ہستی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ذات (حال) کی رہنمائی اس موضوع تک کر دے جس کی موجودگی میں خود اس کی حرکت و زندگی اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے" یوں آپ دیکھ لیں گے۔ کہ جذبہ کی ذاتی فطرت کے پیش نظر اگرچہ مذہب کا نقطہ آغاز یہی جذبہ ہے۔ لیکن اس کی پوری تاریخ میں کوئی بھی ایسا دور نہیں ہے۔ جب اس نے اپنے آپ کو صرف جذبہ ہی خیال کیا ہو، بلکہ اس کے برعکس یہ ہمیشہ مابعد الطبیعیاتی نظاموں کی تشکیل میں ساعی رہا ہے۔ صوفی کا عقل کو بہ حیثیت ایک ذریعہ علم کے مردود سمجھنا ایک ایسا فعل ہے جس کے لئے حقیقتاً تاریخ مذہب میں کوئی وجہ جواز موجود نہیں۔ لیکن پروفیسر ہاکنگ (HOCKING) کی جو عبارت ابھی ابھی نقل کی گئی ہے۔ اس کے مفہوم کا دائرہ مذہب کے اندر تصور یا عین کا صرف جواز ڈھونڈھنے سے زیادہ وسیع ہے۔ 'جذبہ' و 'خیال' کا سرشتی تعلق وحی متلو کے قدیم دینیاتی مابہ النزاع مسئلے پر بھی روشنی ڈالتا ہے جس نے کبھی مسلمان مفکرین اسلام کو کافی سے زیادہ پریشان

کیا تھا۔ غیر ناطق جذبہ اپنے آپ کو عین یا خیال میں متشکل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اپنی جگہ پر خود اپنے ہی اندر سے اپنا ظاہری لباس یعنی الفاظ پیدا کر لیتا ہے یہ کہنا محض استعارہ نہیں ہے کہ خیال اور جذبہ رحم جذبہ سے بیک وقت ظاہر ہوتے ہیں مگر منطقی سمجھ ہے کہ انہیں مسلسل زمانی (TEMPARAL ORDER) میں پرو دیتی ہے اور یوں انہیں ایک دوسرے سے الگ الگ جان کر اپنی مشکل خود پیدا کر لیتی ہے۔ ایک مفہوم ہے کہ اس کی رو سے لفظ بھی وحی شدہ ہے۔

وجود کے ساتھ صوفی کا گہرا تلازم جو اس کے اندر زمان مسلسل کی موہومیت کا ایک احساس پیدا کر دیتا ہے زمان مسلسل کے ساتھ یکسر بے تعلقی پر دلالت نہیں کرتا۔ صوفیانہ کیفیت اپنی یکتائی کے لحاظ سے کسی نہ کسی صورت میں معمولی تجربہ سے وابستہ رہتی ہے۔ یہ بات اس امر سے واضح ہے کہ صوفیانہ کیفیت جلدی ماند پڑ جاتی ہے اگرچہ اپنے گذر جانے کے بعد یہ دماغ میں اقتدار اور حاکمیت کا ایک گہرا احساس چھوڑ جاتی ہے صوفی اور پیغمبر دونوں معمولی تجربہ کی سطح پر واپس لوٹ آتے ہیں مگر اس امتیاز کے ساتھ کہ پیغمبر کی واپسی جیسا کہ بعد میں ثابت کیا جائے گا نوع انسانی کے لئے بے انتہا معنی خیز ہو سکتی ہے۔

لہٰذا علم کے نقطہ نظر سے صوفیانہ تجربہ کی اقلیم اتنی ہی ٹھوس اور حقیقی ہے جتنا انسانی تجربہ کی اور اقالیم۔ اور محض اس وجہ سے کہ صوفیانہ تجربہ کے ڈانڈے حسی ادراک . . . . (SENCE PERCEPTION) سے ملائے نہیں جا سکتے۔ اسے صرف نظر کر دینا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی صوفیانہ کیفیت کی روحانی قدر و قیمت کو ان نامیاتی (ORGANIC) شرائط کے پیش نظر کم کیا جا سکتا ہے جو بظاہر اسے متعین کرتی ہیں۔ اگر جدید نفسیات کے اس اصول موضوعہ یعنی روح و جسم کے رشتہ باہمی کو سچ بھی مان لیا جائے۔ پھر بھی اظہار حقیقت کے ایک ذریعہ کی حیثیت میں صوفیانہ کیفیت کی قدر و قیمت کو گھٹانا غیر منطقی بات ہی ہوگی۔

[illegible] ذہن کا مرد مذہبی ہو یا غیر مذہبی نامیاتی

[illegible] (ORGANIC) طور پر متعین ہوتی ہیں۔ دماغ کے عملی اور سائنٹیفک (SCIENTIFIC)

[illegible] متعین اتنا ہی نامیاتی طور پر ہوتا ہے جتنا کہ اس کے مذہبی وصف و پہلو کا کیسی فوق العا

[illegible]یت کے کمالات کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے وقت ہماری رائے نہ تو اُن نامیاتی

شرائط سے جو ماہرین نفسیات کے نزدیک اُس کی ذہانت کا باعث ہیں متعین ہوتی ہے،

[illegible] ان سے کسی طرح متاثر ہو۔ ممکن ہے کہ ایک خاص قسم کا مزاج ایک خاص قسم کی قبولیت

(RECEPTIVITY) کے لئے ایک ضروری شرط ہو لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ حاصل ہوا ہے

اُس کی صحت کے بارے میں شرط ماقبل ہی کو پوری پوری سچائی مان لیا جائے حقیقت یہ ہے

کہ ہمارے احوال نفسی کی نامیاتی علیت (ORGANIC CHUSATION) کو اُس معیار سے

کچھ بھی تعلق نہیں ہے جس کی رُو سے ہم انہیں قدر و قیمت کے لحاظ سے ایک دوسرے

پر فوقیت دیتے ہیں پروفیسر ولیم جیمز (WILLIAM JAMES) کہتا ہے کہ "رویا اور

پیغامات کا کچھ حصہ ہمیشہ صریح طور پر نہایت احمقانہ ثابت ہوا ہے اہتزازی کیفیات

اور تشنجی دوروں میں سے بعض چال چلن اور کردار کے لئے اتنے بے نتیجہ رہے ہیں کہ

اُنہیں کوئی بھی اہمیت نہیں دی جا سکتی چہ جائیکہ انہیں الہامی سمجھا جائے۔ عیسوی

تصوف کی تاریخ میں یہ مسئلہ کہ اُن پیغامات اور تجارب میں جو واقعی الہامی معجزے تھے

اور اُن دوسروں میں جن کو شیطان نے اپنے بغض کی وجہ سے اختراع کیا اور یوں اہل

مذہب کو دوہرا جہنمی بنا دینے کا امکان پیدا کر دیا کس طرح فرق و امتیاز کیا جائے اتنا

مشکل رہا ہے کہ اس کو حل کرنے کے لئے ضمیر کے بہترین ناظمین کی پوری ذہانت اور سارے

تجربے کی ضرورت رہا کرتی ہے۔ آخر میں اس امتیاز کا معیار ہمارا تجربی معیار قرار دیا گیا

تھا ان تجارب کو ان کی جڑوں سے نہیں بلکہ ان کے نتائج سے پرکھیں" عیسوی تصوف کے جس مسئلے کی طرف پروفیسر ولیم جیمز نے اشارہ کیا ہے یہ درحقیقت تصوف کا عمومی مسئلہ ہے شیطان اپنے بغض کی وجہ سے ضرور مصنوعی تجربات اختراع کرتا ہے جو صوفیانہ کیفیت کے دائرے میں چپکے سے گھس آتے ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے :-

"ہم نے تم سے پہلے کوئی ایسا نبی یا پیغمبر نہیں بھیجا جس کی خواہشات میں شیطان نے غلط خواہش داخل نہ کردی ہو۔ لیکن خدا شیطان کی ترغیبات کا قلع قمع کردے گا اس طرح خدا اپنی وحی کی تصدیق کریگا۔ کیونکہ خدا عالم و دانا ہے" ۲۲ : ۲۵

اور الہامی سے شیطانی آمیزش کی علیحدگی ہی سے فرائڈ (FREUD) کے متبعین نے مذہب کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ اگرچہ میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اس جدید ترین نفسیات کا سب سے اہم نظریہ مجھے کسی مناسب و موزون شہادت پر مبنی نظر نہیں آتا۔ اگر ہماری بے سروپا تشویقات (IMPULSES) ہمارے خوابوں میں اپنا اظہار کرتی ہیں یا اُن اوقات میں اپنی تسکین کی سعی کرتی ہیں جب ہم اپنے آپ میں نہیں تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ہمارے نفس طبعی (NORMBL SELF) کے پیچھے ایک قسم کے کباڑ خانے میں مقید رہتی ہیں۔ ہمارے نفس طبعی کی قلیم پر ان دبی ہوئی تشویقات کی وقتی یورش ہمارے دماغ کے کسی تاریک کونے کھدرے میں ان کے دوامی قیام کو ثابت کرنے کی بجائے زیادہ تر اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے جوابی افعال کے عادی نظام میں ہنگامی طور پر انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ بہر حال اس نظریہ کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اپنے ماحول کے ساتھ تطبیق و ہم آہنگی پیدا کرنے کے دوران عمل میں ہر طرح کے محرکات ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان محرکات کے جواب میں ہمارے عادی جوابی افعال

آہستہ آہستہ نسبتاً ایک متعین نظام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جس کی پیچیدگی بعض تشویقات کو قبول و اختیار کرنے اور بعض کو جو ہمارے مستقل جوابی افعال کے نظام میں ٹھیک نہیں بیٹھتیں رد کرنے سے ہر لمحہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مستر و تشویقات ہمارے دماغ کے اس حصے میں جو غیر شعوری کہلاتا ہے پسپا ہو جاتی ہیں اور وہاں اپنے اظہار کے لئے مناسب وقت کے انتظار میں رہتی ہیں تاکہ یوں نفس شعوری سے اپنا انتقام لے سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے منصوبوں میں خلل پیدا کر دیں۔ ہمارے خیالات کو بگاڑ دیں، ہماری خوابوں کو تشکیل دیں اور ہماری خیالی اشکال کو جنم دیں۔ اور یا پھر ہمیں قدیم چال چلن کے اُن طریقوں کی طرف واپس پھیرے جائیں جنہیں عمل ارتقا بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب ایک خالص افسانہ ہے جسے نوع انسانی کی انہی مردود و مستر و تشویقات نے اس خیال کے پیش نظر گھڑ لیا ہے تاکہ آزاد اور بلا روک ٹوک حرکت کے لئے ایک قسم کی خیالی دنیا مہیا ہو جائے اس نظریے کی رُو سے مذہبی عقائد کی اصلیت فطرت کے ان قدیم نظریوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے جن کے ذریعے نسل انسانی نے حقیقت کو اس کی بنیادی بدصورتی سے مخلصی دلانے کی سعی کی ہے۔ اور اُسے ٹھوس زندگی کے حقائق کی شہادت سے کہیں زیادہ دلفریب بنا کر پیش کیا ہے مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ بعض مذاہب اور ادب کی کچھ اقسام ایسی ضرور ہیں جو زندگی کے واقعات سے بزدلانہ گریز مہیا کرتی ہیں۔ کام صرف اس امر میں ہے کہ یہ بات تمام مذاہب پر حاوی نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی معتقدات میں ایک حد تک ما بعد الطبیعاتی اہمیت موجود ہوتی ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ اُس مواد یہ تجربہ کی تشریحات نہیں ہیں جو علوم طبعی کا موضوع ہیں مذہب علم طبیعات یا کیمیا نہیں ہے، جو فطرت کی توجیہہ اصول علیت کی بنا پر چاہتا ہے حقیقت میں یہ انسانی تجربہ کے ایک

بالکل ہی علیحدہ خطے کی تشریح و تفسیر کرنا چاہتا ہے۔ مذہبی تجربہ جس کا مواد کسی اور علم کے مواد میں کسی طرح تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت میں یہ بات مذہب کے حق میں ضرور کہی جانی چاہئے کہ اس نے اس سے بہت پہلے کہ سائنس کو اس امر کا علم ہو سکے مذہبی زندگی میں ٹھوس تجربہ کی ضرورت پر زور دیا۔ ان دونوں کا مابہ النزاع مسئلہ اس امر کی وجہ سے نہیں ہے کہ ایک تو ٹھوس تجربہ پر مبنی ہے۔ اور دوسرے کو یہ بات حاصل نہیں ہے بلکہ دونوں کا نقطہ آغاز ہی ٹھوس تجربہ ہے ان کی نزاع دراصل اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم ایک ہی مواد تجربہ کی تفسیر و تطبیق میں مشغول ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مذہب کا مقصد انسانی تجربہ کی ایک قسم خاص کی حقیقی اہمیت کو معلوم کرنا ہے۔

یہ بھی ممکن نہیں کہ مذہبی تجربہ کے محمول (CONTENT) کو تاویلاً تمام کا تمام جنسی تشویش کے فعل کا اثر سمجھ لیا جائے۔ شعور کی یہ دو شکلیں یعنی جنسی اور مذہبی اکثر معاندہوتی ہیں۔ اور نہیں تو کم از کم اپنے کردار۔ اپنے مقصد اور ان اطوار کے لحاظ سے جو ان سے جنم پاتے ہیں یہ ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ مذہبی جذبہ کی حالت میں ہم کسی حقیقت واقعی کو کسی نہ کسی رنگ میں اس شخصیت کے محدود دائرے سے باہر ہی سمجھتے ہیں ایک ماہر نفسیات کے نزدیک مذہبی جذبہ اس تیزی و شدت کی بنا پر جس سے یہ ہمارے وجود کی گہرائیوں میں تلاطم برپا کر دیتا ہے لازمی طور پر آفریدۂ لاشعور ہے۔ جذبہ کا کچھ نہ کچھ عنصر ہر علم میں موجود ہے اور کسی علم کے معروض کی واقعیت جذبہ کی شدت میں کمی یا زیادتی کے تناسب ہی سے گرتی یا بڑھتی ہے وہی شے ہمارے لئے سب سے زیادہ حقیقی ہے جو ہماری شخصیت کے پورے ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر ہاکنگ (HOCKING) بڑے نوکیلے انداز میں کہتا ہے "اگر کبھی وقت کے اسی واہیات پیمانے کے اندر کسی وجود یا کسی ولی ہی پر کوئی ایسی رویت منکشف

ہو جو اس کی اور ہماری زندگیوں کو نئی شاہراہ پر ڈال دے تو یہ اسی وقت ہوگا جب وہ رویت ابدیت کی ساری وسعتوں کے واقعی اور ٹھوس ہونے کے احساس کو کسی حد تک اس کی روح پر مسلط ہو جانے کی اجازت دے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی رویت سے نہ صرف لاشعور کی مستعدی بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رویت اسی کی ایک گونج ہے مگر لاشعور کے غیر مستعمل گوشوں کے پھیلاؤ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم نے بیرونی ہوا میں سانس لینا ہی چھوڑ دیا ہے اگر دیکھا جائے تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔" لہٰذا خالص نفسیاتی اسلوب مذہبی جذبہ کی بہ حیثیت ایک ذریعہ علم کے توجیہہ نہیں کر سکتا۔ جدید ماہرین نفسیات کے ہاتھوں میں یہ اسلوب اسی طرح ناکام رہے گا جس طرح اس سے پیشتر یہ لاک (LOCK) اور ہیوم (HUME) کے ہاتھوں میں ہو چکا ہے۔

بہرحال ابھی ابھی جو بحث ہوئی ہے اس نے ضرور آپ کے دلوں میں ایک نہایت اہم سوال پیدا کر دیا ہوگا۔ میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مذہبی تجربہ اپنی اصلیت کے لحاظ سے جذبہ کی ایک ایسی حالت ہے جس میں ایک وقوفی پہلو بھی موجود ہے، اور جس کے محمول (CONTENT) کو سوائے فیصلہ (JUDGEMENT) کی شکل میں دوسروں تک منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ میرے سامنے ایک ایسا فیصلہ (JUDGEMENT) میری رضامندی کے لئے پیش کریں، جو انسانی تجربہ کے کسی ایسے حصے کی تفسیر و تشریح کا مدعی ہو جو میری دسترس سے باہر ہے تو کیا مجھے یہ بات پوچھنے کا حق نہیں ہے کہ اس کی سچائی کی کیا ضمانت ہے؟ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا معیار موجود ہے جس سے اس کی صحت پرکھی جا سکے؟ اگر اس قسم کی تصدیقات کو ماننے کا معیار صرف ذاتی تجربہ ہی ہوتا ہے تو مذہب کے ماننے والوں کی تعداد محض گنتی کے چند ایک افراد تک محدود ہوتی۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس ایسے معیار موجود ہیں جو دوسرے علوم پر منطبق ہونے والے معیاروں سے مختلف نہیں ہیں۔ انہیں میں عقلی معیار اور وہ ادی معیار کہہ کر

پکارتا ہوں عقلی معیار سے میری مراد — انسانی تجربہ کے مفروضہ وقیاس سے ذہن کو بالکل صاف و پاک رکھتے ہوئے۔ انتقادی تطبیق ہے جس کا مدعا یہ دریافت کرنا ہے کہ آیا ہماری تطبیقات آخر کار اُسی ایک حقیقت کی طرف رہ نمائی کرتی ہیں۔ جسے مذہبی تجربہ نے ظاہر کیا ہے افادی معیار اس کا اندازہ اس کے ثمرات سے کرتا ہے۔ پہلا معیار فلسفی کا معیار ہے اور دوسرا پیغمبر کا۔ ہم آیندہ خطبہ میں عقلی معیار کو عاید کریں گے۔

خطوطِ اقبال

بنام خان صاحب منشی سراج الدین احمد

(محمد عبداللہ قریشی)

خطوط پڑھنے سے قبل یہ سوال پیدا ہونا یقینی ہے کہ یہ خان صاحب منشی سراج الدین احمد کون تھے اور علامہ اقبال علیہ الرحمۃ سے ان کا تعلق کس قسم کا تھا؟ میں سب سے پہلے اسی کا جواب دینے کی کوشش کروں گا تاکہ خطوط اقبالؔ کے ساتھ منشی صاحب کی بھی یاد تازہ ہو جائے۔

خان صاحب منشی سراج الدین احمد میر منشی ریذیڈنسی کشمیر کی شخصیت کسی خاص تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کشمیر کی ڈار فیملی سے تعلق رکھتے اور لاہور کے مشہور وکیل منشی محمد اسمٰعیل مرحوم کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ آپ کا دادا رمضان ڈار کشمیر سے ترکِ وطن کر کے پنجاب آیا اور لاہور میں آباد ہوا۔ جہاں آپ کا کنبہ اب تک پھیلا ہوا ہے[1]

منشی صاحب کی ولادت یکم اکتوبر ۱۸۷۶ء کو ہوئی۔ یہی سال علامہ اقبالؔ کی پیدائش کا ہے آپ نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول جہلم سے حاصل کی۔ اس کے بعد فورمین کرسچن کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے آپ نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ فارسی کے مضمون سے آپ کو خاص لگاؤ تھا۔ اور اس میں اچھا خاصا مذاق رکھتے تھے۔ چنانچہ کالج سے نکلتے ہی انجمن حمایت اسلام لاہور کے منتظمین نے آپ کی خدمات اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ کے لئے حاصل کر لیں جہاں کچھ عرصہ آپ فارسی پڑھاتے رہے۔ جن لوگوں کو آپ سے شرفِ تلمذ حاصل

---

[1] تاریخ اقوام کشمیر جلد اول

کر لیں جہاں کچھ عرصہ آپ فارسی پڑھاتے رہے۔ جن لوگوں کو آپ سے شرفِ تلمذ [illegible]
وہ اعتراف کرتے ہیں کہ منشی صاحب اپنے مضمون پر اتنے قادر ہوتے تھے کہ طلبہ کی توجہ
اُدھر ہٹنے نہ دیتے تھے بلکہ کُند ذہن سے کُند ذہن میں بھی فارسی کا صحیح ذوق پیدا کر دیتے تھے

۱۸۹۹ء میں آپ ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے کشمیر ریذیڈنسی میں ملازم ہوئے اور
۱۹۰۸ء میں ترقی کر کے لداخ ایجنسی میں ہیڈ کلرک بن گئے۔ ۱۹۱۳ء میں پھر وہاں سے کشمیر ریذیڈنسی
میں واپس آئے۔ اور میر منشی کے عہدہ پر فائز ہوئے جہاں آخیر تک رہے ۱۹۱۷ء میں آپ کی
خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت نے آپ کو خاں صاحب کا خطاب عطا کیا۔[۱]

ادب و شعر میں آپ کا مذاق بہت سلجھا ہوا تھا۔ آپ فارسی کے فاضل مانے جاتے تھے
یہ زبان اور اصناف سخن کی باریکیوں کو آپ خوب سمجھتے تھے یہی چیز آپ کی شہرت کا باعث
تھی۔ آپ کشمیر کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی روح رواں تھے۔ آپ کے بغیر کوئی مجلس مکمل نہ سمجھی
جاتی تھی۔ آپ کی بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی سے محفل کا رنگ جم جاتا اور رونق دوبالا ہو جاتی تھی۔
آپ کو قدیم شعرائے فارسی و اردو کے بے شمار شعر زبانی یاد تھے جنہیں آپ خیالات کا تطابق
یا تفاوت دکھانے کے لئے موقعہ بموقعہ پیش کرتے تھے اور ان کا ذخیرہ کبھی ختم نہ ہوتا تھا بعض
اشعار کی تاثیر میں اتنے ڈوب جاتے تھے کہ بے خود ہو کر بھری محفل میں گانے اور ناچنے لگتے تھے
اور اس کیف و سرور سے سننے والوں کو مسحور کر دیتے تھے۔ آپ کے چست فقرے اتنے پُر لطف
ہوتے تھے کہ جس مشاعرے میں آپ شریک نہ ہوتے تھے لوگ پوچھتے تھے ؎

یارب وہ بلبلِ چمنستان کدھر گیا؟
ہر نغمہ جس کا حسنِ تمنائے گوش تھا

---

[۱] فہرست زمانہ بایان۔ رؤسا و مشاہیر جموں و کشمیر مطبوعہ گورنمنٹ آف انڈیا سنٹرل پبلیکیشن برانچ کلکتہ [illegible]

نومشق شعرا آپ کی صدارت میں شعر پڑھتے ڈرتے اور کہنہ مشق آپ کی تحسین سخن شناس سے خوش ہوتے تھے۔ افسوس کہ تین چار سال ہوئے سرینگر کشمیر میں آپ کا انتقال ہو گیا اور آپ اللہ کو پیارے ہو گئے ؎

آخر گلِ اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی ۔ پہنچی وہیں، یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

آپ کو مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ آپ کتابوں کی جلد بندی اپنے ہاتھ سے کرتے اور کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ کر اپنے طاق ادب کی زینت بناتے تھے۔ ریذیڈنسی سے جو انگریز ولایت واپس جاتا تھا آپ کا شوقِ مطالعہ دیکھ کر اپنا ذخیرۂ کتب بھی منشی صاحب ہی کو دے جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا نادر اور کمیاب کتابیں آپ کے کتب خانہ میں موجود تھیں یہی آپ کی عمر بھر کی کمائی تھی اور اس پر آپ کو نازش بھی تھا۔ آپ کی ساری تنخواہ اس جنس گرانمایہ کی تزئین و حفاظت میں صرف ہو جاتی تھی۔ یقیناً یہ آپ کے عزم بالجزم۔ ایثار اور علم دوستی کا ایک روشن ثبوت ہے۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ سے آپ کے مراسم بہت پرانے تھے آپ علامہ کی فطرت کے میلان اور پسند کے رجحان کو خوب سمجھتے تھے۔ اکثر ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں اور خط و کتابت بھی رہتی تھی مگر افسوس کے سوا چار خطوں کے کچھ دستیاب نہیں ہو سکا ورنہ آپ دیکھتے کہ خلوت کی بعض سرگوشیاں جلوت کے آراستہ خیالات سے کہیں زیادہ پرلطف ہوتی ہیں۔

ان چار خطوں میں ایک خط ۱۹۰۲ء کا ایک ۱۹۰۳ء کا اور دو ۱۹۱۵ء کے ہیں پہلے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی صاحب نے کشمیر سے تحفہ کے طور پر چند منقش انگوٹھیاں بھیجی تھیں۔ جن کا منظوم شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پر منشی صاحب کے الطاف و عنایات کا گہرا اثر تھا۔ حضرت علامہ کی طبیعت میں استغنا کا مادہ

شروع ہی سے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ امیروں کی مدح و توصیف میں بہت کم زبان کھولتے تھے اور منشی صاحب تو کوئی امیر بھی نہ تھے محض سفید پوش تھے۔ یوں سمجھئے کہ برابر والوں کے ذرا نظر نیچی نہ ہوتی تھی۔ ان کی دوستی محض اخلاص و محبت پر مبنی تھی۔ علامہ اقبال اس اخلاص مروّت کے معترف تھے۔ اور سپاس کے طور پر اس کا اظہار ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے ؎

نقش وہ اس کی محبت نے میرے دل پر کیا محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار
شکریہ احساں کا اے اقبال لازم تھا مجھے مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

اگرچہ عمر کے آخری دور میں ان کی شانِ فقر اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ دنیا کی جھوٹی اور مصنوعی عزتوں کی بالکل پروا نہ کرتے تھے۔ بلکہ انسانی دوستی کے راستے خداشناسی کی منزل تک پہنچ گئے تھے ؎

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

دوسرے خط میں اپنا تازہ کلام نقل کر کے ترتیب اشعار میں منشی صاحب کے مشورں سے فائدہ اٹھانے کی تمنا ظاہر کی گئی ہے۔

تیسرے خط میں مثنوی اسرارِ خودی پر منشی صاحب کی بے لاگ تنقید اور ان کے شستہ مذاق کی تعریف کی گئی اور مثنوی کے دوسرے حصے کے مندرجات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آخری خط میں ان کی تنقید کے غلطی سے زمیندار میں چھپ جانے پر ندامت کا اظہار کیا گیا ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ علامہ مرحوم اعتقادات اور زبان کی فضول

بحثوں میں اُلجھنا پسند نہ کرتے تھے، فطرت اتنی سعید تھی کہ جو اعتراض معقول ہوتا تھا اُسے قبول کرتے تھے اور اس کے مطابق اپنے کلام پر نظرِ ثانی کر لیتے تھے لیکن محض نکتہ چینی اور غلط قسم کی تنقید برداشت نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب مثنوی اسرارِ خودی کے بعض اشعار پر جو خواجہ حافظ شیرازی کے خلاف تھے حضرت اکبر الٰہ آبادی اور خواجہ حسن نظامی نے بحث شروع کی اور چاروں طرف سے لے دے ہونے لگی تو علامہ نے دوسری اشاعت میں ان اشعار کو کتاب سے خارج کر دیا۔ جس سے بحث کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

اسی طرح جب ایک دفعہ اودھ پنچ لکھنؤ نے آپ کی ایک اردو نظم کہیں سے نقل کر کے اس میں سے زبان کی غلطیاں نکالیں تو آپ نے منشی محمد الدین صاحب فوق مدیر اخبار کشمیری لاہور کو لکھا :۔

"اودھ پنچ لکھنؤ نے جو اعتراضات مجھ پر کئے ہیں۔ ان کا مجھے علم نہیں وہ پرچہ تلاش کرنا چاہئے۔ ممکن ہے ان اعتراضوں میں کوئی کام کی بات ہو لکھنؤ والے یا اور معترض یہ خیال کرتے ہیں کہ اقبال شاعر ہے۔ مگر میری غرض شاعری سے زبان دانی کا اظہار یا مضمون آفرینی نہیں۔ نہ میں نے آج تک اپنے آپ کو شاعر سمجھا ہے حقیقت میں فنِ شاعری اس قدر دقیق اور مشکل ہے کہ ایک عمر میں بھی انسان اس پر حاوی نہیں ہو سکتا پھر میں کیونکر کامیاب ہو سکتا ہوں۔ جسے روزی کے دھندوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ میرا مقصود گاہ گاہ نظم لکھنے سے صرف اسی قدر ہے کہ چند مطالب جو میرے ذہن میں ہیں ان کو مسلمانوں تک پہنچا دوں۔ اور بس ۔" (۶ مارچ ۱۹۱۷ء)

لیکن جب اودھ پنچ کا ایک پرچہ مہیا کر کے آپ کی خدمت میں بھیجا گیا اور آپ نے اعتراضات دیکھے تو جھنجلا کر فرمایا کہ :۔

"نظم زیر تنقید میری ابتدائی نظموں میں سے ہے اس میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن تعجب ہے کہ معترض نے ان میں سے ایک پر بھی اعتراض نہیں کیا اور جس قدر اعتراض ہیں غالباً کتابت کی غلطیوں پر ہیں۔ لوگ اس نظم کو بار بار چھاپتے ہیں اور بغیر میری اجازت کے کم از کم مجھے پروف ہی دکھا لیا کریں۔ اس کا علاج میرے پاس کچھ نہیں"۔ (۲۸ دسمبر ۱۹۱۸ء)

البتہ منشی سراج الدین صاحب کی تنقید کو جو خالص علمی تنقید ہوتی تھی، اور جس میں محاسن و معائب دونوں دکھائے جاتے تھے۔ آپ ہمیشہ پسند فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اشاعت کو چنداں بُرا نہ خیال کیا اور اس پر چیں بر جبیں نہ ہوئے یہ منشی صاحب کی نیک نیتی اور سخن شناسی کی دلیل ہے۔

ان خطوں میں ایک نظم ابر گہربار کا ذکر آتا ہے جو ڈاکٹر صاحب کے مجموعہ کلام میں شامل نہیں یہ نظم کسی ایسے مسئلے پر تھی جن کا تعلق حنفی اعتقادات سے تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خواہ مخواہ کی مدد و کد سے بچنے کے لئے بانگ درا کی ترتیب کے وقت جو سنہ ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ اس نظم کو نظر انداز کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ بہت سی دیگر نظموں اور غزلوں کو بھی جو ابتدائی مشق کے زمانہ کی تھیں، آپ نے بعض مصلحتوں کے ماتحت نہایت بے دردی سے تلف کر دیا کیونکہ وہ آپ کے اپنے معیار انتخاب پر پوری نہیں اُترتی تھیں۔

اب وہ خط ملاحظہ فرمایئے۔ جو علامہ اقبال علیہ الرحمۃ اور منشی صاحب مرحوم کے تعلقات کی بچی کھچی یادگار رہیں:۔

پہلا خط

سنہ ۱۹۰۲ء

ڈیر سراج! دو تین روز سے طبیعت بہ سبب دورہ ——— علیل ہے۔ یہ چند شعر قلم برداشتہ آپ کے شکریہ میں عرض کرتا ہوں۔ میرا ارمغان یہی ہے اس کو قبول کرے۔

مجھے مشکور کیجئے - چاہو تو پیشانی پر چند عدد سطور لکھ کر مخزن میں بھیج دیجئے والسلام

آپ کا اقبال از لاہور

آپ نے بھیجی جو مجھ کو ارمغاں انگشتری — دے رہی ہے مہر و الفت کا نشاں انگشتری
زینتِ دستِ حنا مالیدۂ جاناں ہوئی — ہے مثالِ عاشقاں آتش بجاں انگشتری
تو سراپا آیتے از سورۂ قرآنِ فیض — وقفِ مطلق اے سراجِ مہرباں انگشتری
میرے ہاتھوں سے اگر پہنے اسے وہ دلربا — ہو رموزِ بے دلی کی ترجماں انگشتری
ہو نہ برقِ افگن کہیں لے طائرِ رنگِ حنا — تاکتی رہتی ہے تیرا آشیاں انگشتری
ساغرِ مے میں پڑا انگشتِ ساقی کا جو عکس — بن گئی گردابۂ آبِ رواں انگشتری

ہوں بہ تبدیلِ قوافی فارسی میں نغمہ خواں
ہند سے جاتی ہے سوئے اصفہاں انگشتری

یارم از کشمیر[1] فرستاداست انگشتری — چار در صورت بمعنے صد ہزار انگشتری!
چار را گر صد ہزار آوردہ ام اینک دلیل — شد قبولِ دستِ یارم ہر چہار انگشتری
داغ داغِ موج، میناکاری اش جوشِ بہار — مے دہد چوں غنچۂ گل بوئے یار انگشتری
در لہاور[2] آمد و چشمِ تماشا شد تمام — بود در کشمیر چشمِ انتظار انگشتری
یار را ساغر بہ کف انگشتری در دستِ یار — حلقہ اش خمیازہ و دستِ خمار انگشتری
ما اسیرِ حلقہ اش او خود اسیرِ دستِ دوست — اللہ اللہ دام و صیاد و شکار انگشتری
خاتمِ دستِ سلیماں حلقہ در گوش وے است — اے عجب انگشتری را جاں نثار انگشتری
وہ چہ بکشاید بدستِ آں نگارِ سیم تن — ماند گر زیں پیشتر سربستہ کار انگشتری

---

[1] کشمیر کو کشیر اور کاشمر بھی کہتے ہیں -

[2] لاہور کا پہلا نام لہانور ہے جسے حضرت امیر خسرو دہلویؒ نے قرآن السعدین میں بھی استعمال کیا ہے -

من دلِ گم گشتۂ خود را کجا جویم سراغ — دزد دیشے دزد حنا را پردہ دار انگشتری
راز دار دزد ہم دزد است در بازار حسن — چشمک دزد حنا را راز دار انگشتری
ہر دو باہم ساختند و نقد دل ہا مے برند — پختہ مغز انگشت جاناں پختہ کار انگشتری
نوبہار دلفریب انگشتری در دست یار — برگ گل انگشت و آغوش بہار انگشتری
من خورم خون جگر از حسرت پابوس دوست — بوسہ بر دستش زند لیل و نہار انگشتری
بوالہوس ز انگشتری طرز اطاعت یادگیر — مے نہد سر بر خط فرمان یار انگشتری
ماہ نو تا لب تہی کرد است از حسرت بہ چرخ — جلوہ فرما شد چو در انگشت یار انگشتری
از معانم سلک گوہر ہاست یعنی ایں غزل — کز سراجم نور ہا آمد چہا ر انگشتری

گشت اے اقبال مقبول امیر ملک حسن
کردہ و اوارہ گرہ آخر ز کار انگشتری۔

دوسرا خط

از لاہور۔ بھاٹی دروازہ
۱۱۔ مارچ ۱۹۰۳ء

برادر مکرم السّلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں آج عید کا دن ہے اور بارش ہو رہی ہے گرامی صاحب تشریف رکھتے ہیں اور شعر و سخن کی محفل گرم ہے شیخ عبدالقادر ابھی اٹھ کر کسی کام کو گئے ہیں۔ سید بشیر حیدر بیٹھے ہیں۔ اور ابر گہربار کی اصل علت کی آمد آمد ہے۔ یہ جملہ شاید آپ کو بے معنی معلوم ہوگا۔ مگر کبھی وقت ملاقات آپ پر اس کا مفہوم واضح ہو جائیگا

آپ کے خط نے ایک بڑے فکر سے مجھے نجات دی۔ مجھے دو تین دن سے اس بات کی کاوش تھی کہ نظم کہیں سے ملے تو آپ کو ارسال کروں۔ الحمد للہ کہ آپ کو مل گئی آپ کی داد کا مشکور ہوں اور اس کو کبھی تصنع نہیں سمجھتا۔ آپ کو کس بات سے یہ اندیشہ پیدا

ہوا۔ ترتیب اشعار کی خود مجھے بھی فکر ہو رہی ہے مگر خیال یہ ہے کہ ابھی کلام کی مقدار تھوڑی ہے، بہر حال جب یہ کام ہوگا۔ تو آپ کے صلاح و مشورہ کے بغیر نہ ہوگا۔ مطمئن رہیں۔

ملٹن کی تقلید میں مدت سے کچھ لکھنے کا ارادہ ہے اور اب وہ وقت قریب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان دنوں وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا جس میں اُس کی فکر نہ ہو پانچ چھ سال سے اس آرزو کی دل میں پرورش کر رہا ہوں مگر جتنی کاوش آج کل محسوس ہوتی ہے اس قدر کبھی نہیں ہوئی فکر روزگار سے نجات ملتی ہے تو اس کام کو باقاعدہ شروع کروں گا۔

ابرگہربار شروع کرنے سے پیشتر اس خیال سے کہ کوئی وہابی اس کے بعض اشعار پر فتویٰ نہ دے دے چند باتیں تمہید میں بھی لکھی تھیں اور ایک غزل بھی لکھی تھی جو ارسال خدمت کرتا ہوں [1]

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

جلوہ دکھا کے آپ تو پردہ میں ہو رہے اور کہہ گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی

سو سو امید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

صبح ازل یہ درد محبت نے دی صدا مجھ کو بھی ساتھ حسن کے پیدا کرے کوئی

مدت کے بعد دل نے بھی کی بات ہوش کی اس راہ گزر سے روز نہ گزرا کرے کوئی

محفل ہو شغل مے ہو شب مہتاب ہو اور میں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی

بولے بھی سن کے قصۂ ہجراں تو یہ کہا کی دل لگی تو یہ بھی گوارا کرے کوئی

اقبال عشق نے مرے سب بل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

---

[1] بانگ درا میں اس غزل کے صرف نو شعر درج ہیں۔ حالانکہ اس خط میں ڈاکٹر اقبالؒ نے اپنے قلم سے سترہ شعر لکھے ہیں۔ مطبوعہ اشعار کو چھوڑ کر یہاں صرف شعر نقل کئے جاتے ہیں جو مجموعہ میں شامل نہیں۔

(اس کے بعد آپ نے اپنی مشہور نظم بلبل کی فریاد درج کی ہے اور آخر میں لکھا ہے)
کاغذ ختم ہوگیا ہے۔ دل بھی اُکتا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بڑی ہمت کی اپنے اشعار بھی نقل کر لئے۔ اور آپ کو خط بھی لکھ دیا۔ الحمد للہ ذالک۔ مندرجہ بالا نظم کی بندش ملاحظہ فرمایئے چونکہ بچوں کے لئے ہے۔ اس واسطے اضافات اور دقت مضمون سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں فریاد کرنے والا آخر پرندہ ہے۔ والسلام۔ صادق علی خاں صاحب بخیر باد۔ اور دیگر احباب کی خدمت میں سلام عرض کریں۔

آپ کا صادق
محمد اقبال

تیسرا خط

لاہور۔
۴ر اکتوبر ۱۹۱۵ء

مخدومی۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ پڑھ کر مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ الحمد للہ کہ آپ کو مثنوی پسند آئی۔ آپ ہندوستان کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے اور اگر تیجر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرہ شعرا میں پیدا کرتی۔ بہر حال شعر کا صحیح ذوق شعر رکھنے والا شعر کا ویسا ہی لطف اُٹھا لیتا ہے جیسا کہ خود شاعر اور تصنیف کی شدید تکلیف اسے اٹھانی نہیں پڑتی۔

یہ مثنوی گذشتہ دو سال کے عرصہ میں لکھی گئی۔ مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی۔ چند اتوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ موجودہ مشاغل وقت نہیں چھوڑتے۔ اور جوں جوں اس میں زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے کام بڑھتا جاتا ہے لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اپنی موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔

[illegible] حصہ ختم ہوتا ہے جس کے مضامین سب کے ذہن میں ہیں مجھے یقین ہے وہ حصہ پہلے حصے سے زیادہ لطیف ہوگا کم از کم مطالب کے اعتبار سے۔ گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں ان کا لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہے اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ مثنوی میں اس حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسیحائی صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے۔ اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے انشاء اللہ دوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا، اور صحابہ کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جن کا تصوف حامی ہے ——— اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

آپ کا خادم
محمد اقبال

(چوتھا خط)

لاہور
۱۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء

مخدومی - السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ زمیندار میں آپ کا خط چھپ جانے کی غلطی کا ذمہ دار کسی حد تک میں خود اور زیادہ تر دفتر زمیندار ہے۔ میں نے وہ خط مولوی ظفر علی صاحب کی خدمت میں اس واسطے ارسال کیا تھا کہ وہ اپنے ریویو میں اس

تحریر سے مدد لیں۔ مولوی عمادی ایڈیٹر زمیندار خود ایک ریویو لکھ رہے ہیں۔ جو ہنوز ناتمام ہے۔ مقصد اشاعت نہ تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے وہ تحریر ہی چھاپ دی گئی۔ مجھے اس غلطی کے لئے سخت افسوس ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ میں نے ان کو یہی لکھا تھا کہ یہ ریویو ایک پرائیویٹ خط ہے۔ اس میں بعض باتیں پتہ کی تھیں اور میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب کو ان کو پڑھنے سے مدد ملے گی۔ مگر اس تحریر کی اشاعت کا ذمہ دار غالباً اسسٹنٹ ایڈیٹر ہے جسے معلوم نہ تھا کہ یہ پرائیویٹ خط دفتر میں کیوں بھیجا گیا ہے۔

بہر حال اس ندامت کا سب بوجھ مجھ پر ہے۔ میں مولوی صاحب سے ضرور استفسار کرتا۔ مگر اس وجہ سے کہ محض لٹریری تنقید ہے اور چھپ چکی ہے جس کا علاج اب محال ہے اس واسطے میں نے ان سے استفسار نہ کیا۔ اگر کوئی چارہ کار ہو تو تحریر فرمائیے کہ اس کا علاج کیا جائے۔ والسلام۔

آپ کا
محمد اقبالؒ

ان خطوط پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے باہمی تعلقات کے ارتقا پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کہ ابتدا "ڈیر سراج" سے ہوتی ہے اور انتہا "مخدومی" پر۔ اس ذرا سی بات سے اس حسن عقیدت اور بے پایاں محبت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے جو ایک کے متعلق دوسرے کے دل میں پوشیدہ تھی۔ ایسے مخلص دوست اب کہاں نظر آسکتے ہیں؟

دلِ غم دیدۂ انجام لرز جاتا ہے
اب جو دو شخص بہم عہد وفا کرتے ہیں

محمد عبداللہ قریشی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آہ مولانا عبید اللہ سندھی

(از مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی مدیر البرہان)

واحسرتا! ابھی مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی کے ماتم میں ہمارے آنسو خشک بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ ۲۴ اگست کی صبح کو اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہماری بزم علم و عمل کا ایک اور صدر نشین ہماری محفل سے رخصت ہوگیا یعنی مولانا عبید اللہ سندھی نے چند روز کی علالت کے بعد دین پور ریاست بہاولپور میں ۲۲ اگست کو وفات پائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مولانا مرحوم ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں ایک سکھ گھرانہ میں پیدا ہوئے سولہ سال کی عمر میں خود اپنے غور و خوض اور تحقیق و تلاش کے بعد اسلام قبول کیا۔ پچیس سال کی عمر میں علم دین کی طلب کا شوق انہیں کشاں کشاں دیوبند لے آیا۔ جہاں آپ نے چھ سات سال قیام کرکے درس نظامی کی تکمیل کی اور اس سے فارغ ہوکر سندھ چلے گئے یہاں کئی سال تک درس و تدریس میں مصروف رہے، ایک مدت کے بعد حضرت شیخ الہند نے آپ کو پھر دیوبند بلا بھیجا جہاں وہ اپنے شفیق استاد کی نگرانی میں مختلف اہم اور ضروری کام انجام دیتے رہے اس سلسلہ میں آپ حضرت الاستاذ کے حکم سے ۱۹۱۵ء میں کابل گئے اور یہاں افغانستان کے انقلاب میں براہ راست حصہ لیا سات سال تک اس ملک میں قیام فرمانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں آپ ماسکو آئے جہاں انقلاب کے ہاتھوں ایک نئی دنیا تعمیر ہورہی تھی۔ زار کا روس ختم ہوچکا تھا اور لینن کے فیض دم سے سوویٹ روس کے خاکی تپلہ میں جان پڑ رہی تھی۔ مولانا مرحوم نے ان تمام حالات کا جائزہ بڑے غور و خوض سے لیا۔

اور پھر ایک سال قیام کرنے کے بعد آپ ٹرکی تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یہاں خلافت کے فسخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ اسلامی قوانین کے بجائے سوئٹزر لینڈ کا قانون نافذ کیا جا رہا تھا۔ شیخ اسلام کو ترکی سے رخصت کر دیا گیا تھا۔ عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط کو رائج کیا جا رہا تھا۔ غرض ہر پرانا نقش ایک ایک کر کے مٹایا جا رہا تھا۔ اور نوجوان ٹرکی کے نقشہ میں نئے نئے رنگ ابھر رہے تھے مولانا نے تین ساڑھے تین سال تک یہاں مقیم رہ کر ان تمام عوامل و محرکات کا بغور مطالعہ کیا جو ٹرکی میں اس عظیم الشان انقلاب کا سبب تھے اور ہمارا خیال ہے کہ مولانا کے دماغ پر اس مطالعہ کا اثر آخیر تک بہت گہرا رہا۔

ساڑھے تین سال کے قیام کے بعد آپ ٹرکی سے حجاز آئے جہاں آپ نے بارہ تیرہ سال قیام کیا لیکن اس مدت میں سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو کر ہمہ تن درس و تدریس اور مطالعہ و تحقیق میں مصروف رہے یہاں اسلام کے مرکز میں یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر مولانا نے اپنے مطالعہ تحقیق و تفتیش۔ اور طویل تجربات و مشاہدات کی روشنی میں خاص ہندوستانی مسلمانوں کے استخلاص کے لئے ایک منظم لائحہ عمل مرتب کیا اور آخر کار حکومت ہند کے شرائط کو قبول کر کے آپ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان تشریف لے آئے۔

دنیا میں بڑی شخصیتیں ہمیشہ دو طرح کی ہوتی ہیں بعض تو وہ ہوتے ہیں جو صرف دل کی اچھائیوں کے مالک ہوتے ہیں اور بعضوں میں دماغ کی خوبیاں تو سب جمع ہوتی ہیں لیکن دل کی خوبیوں سے ان کو کوئی حصہ نہیں ملا ہوتا ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو بیک وقت دل اور دماغ دونوں کے قویٰ اور ملکات کے لحاظ سے ایک عظیم شخصیت کے مالک ہوں مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اسی تیسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے ایک طرف وہ علوم دینیہ واسلامیہ کے بڑے عالم اور سیاسیات کے بلند پایہ مفکر تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت شاہ عبد العزیزؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ

رحمہ اللہ کی کتابوں پر عبور تام حاصل تھا۔ انداز فکر تقلیدی کے بجائے سراسر اجتہادی تھا اور
اور دوسری جانب یہ اللہ کے راستے کے ایک ایسے سپاہی تھے جس نے زندگی کا لمحہ لمحہ اسلام اور
مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا ایک جذبہ تھا جو ہر آن انہیں بے چین رکھتا تھا۔
ایک تڑپ تھی جو جان میں ، ۷۰ سے زیادہ کی عمر میں بھی بچوں کی طرح ہر وقت رواں اور متحرک رہتی
تھی۔ عمدہ کھانا پینا ، خواب و راحت ، شہرت و وجاہت ، عشرت و آسائش یہ تمام چیزیں ایسی تھیں
کہ مولانا کے حاشیۂ تصور میں بھی ان کا کہیں دھندلا سا نقش نہیں ہوگا ۔ وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے
لئے اپنا ایک مخصوص پیغام رکھتے تھے ۔ جو ان کے عمر بھر کے غور و فکر اور عمیق مشاہدات و تجربات کا حاصل
تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا ہمارے قافلے کے ایک ایسے میر کارواں تھے جو بڑھاپے میں نوجوانوں سے زیادہ
جوش و خروش جستجو اور سرگرمی رکھتا تھا اور منزل مقصود کی طرف جس کے شوق جادہ پیمائی کی شدت
کا یہ عالم تھا کہ وہ راستے کے نشیب و فراز کی ذرا پرواہ نہ کرتا اور جس راہ کو حق سمجھتا اس پر اس تیز گامی سے
چلتا تھا کہ قافلے کے اچھے اچھے باہمت لوگوں کا شوق پیروی بھی ان کے عذر آبلہ پائی سے عہدہ برآ
نہیں ہو سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی تمام تر جہد مسلسل ، ریاضت و محنت اور مجاہدانہ سعی
و کوشش میں بسر ہوئی لیکن اس کے باوجود اس کے نقش قدم پر چلنے والوں کی تعداد ہمیشہ محدود رہی
بہر حال حضرت شیخ الہند کے فیض صحبت نے مولانا کے دل میں یقین کامل کی جو شمع روشن کر دی تھی
وہ آخر دم دلپسیں تک پوری آب و تاب کے ساتھ منور رہی ۔

اچھا اے جانے والے جا ! تجھ پر ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی طرف سے ہزار در ہزار سلام و
رحمت ، تو نے اپنا سب کچھ قربان کر کے عمر بھر اسلام کی سربلندی کے لئے جد و جہد کی اب یوم الدین کا
مالک تجھ کو اپنی بیش از بیش رحمتوں سے نوازے اور اپنے دامان مغفرت میں چھپا لے ۔ آمین ۔

(رسالہ برہان بابت ستمبر ۱۹۴۴ء)

ہماری مطبوعات

ہمارے ہندوستانی مسلمان

جس میں سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین پر مفصل تبصرہ ہے۔ یہ تحریک ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیاء و تجدید کی ایک آخری اور زبردست کوشش تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کو کس طرح منظم کیا۔ اور کس طرح ان کے اندر بلالی روح پیدا کر دی تھی۔ قیمت دو روپے بارہ آنے ۱۲؍۲

اسلامی پارٹی کا آئین

مسلمانوں کو ہندوستان میں اب کن خطوط پر منظم کیا جا سکتا ہے۔ اور کس طرح ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیاء کے لئے کوشش کی جا سکتی ہے ان سوالات کا جواب معلوم کرنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت ۸؍

شرح اسرارِ خودی

علامہ اقبال کا بنیادی فلسفہ مثنوی اسرار و رموز میں بیان کیا گیا ہے۔ اصل کتاب فارسی میں ہے۔ یہ شرح پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی نے اردو زبان میں تحریر فرمائی ہے بے حد مقبول ہے۔ دوسرا ایڈیشن اس گرانی کے زمانہ میں طبع ہوا ہے قیمت وہی ہے جو پہلے تھی صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ (۸؍۱)

اقبال کا تصور زمان و مکان

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے۔ ایچ۔ پی۔ ڈی نے علامہ اقبال کے نظریہ زمان و مکان کی تشریح اردو زبان میں کر کے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ علامہ کے چھ لیکچروں میں سے دو لیکچروں میں اسی مسئلہ پر بحث ہے۔ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ قیمت دس آنے ۱۰؍

موت و حیات اقبال کے کلام میں

اس چھوٹے سے پمفلٹ میں ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی نے علامہ اقبال کے اس نظریہ پر سیر حاصل بحث کی ہے جو وہ زندگی اور موت سے تعلق رکھتے تھے یہ چھوٹا سا مضمون بے حد پر از معلومات اور دلچسپ ہے قیمت چار آنے

اقبال کے چند جواہر ریزے

یہ علامہ اقبال کے ملفوظات کا ایک نادر مجموعہ ہے جو جناب خواجہ پروفیسر عبدالمجید صاحب گورنمنٹ کالج لاہور نے جمع کیا تھا قیمت ۴؍

اشتراکیت اور اسلام

مولوی محمد مظہر الدین صدیقی بی اے کا یہ مضمون ہر لکھے پڑھے کے مطالعہ میں آنا چاہئے۔ قیمت ۶؍

انتخاب غالب

غالب کے کلام کا یہ ایک نادر مجموعہ ہے جو اب تک شائع نہیں ہوا۔ اس مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ غالب نے خود اپنے کلام کا یہ انتخاب جمع کیا ہے قیمت ۶؍

ہماری وہ مطبوعات جو حال ہی میں چھپکر تیار ہوئی ہیں!

المنبہات یہ عربی زبان کی ایک قابل قدر تصنیف ہے جو علامہ ابن حجر کی طرف منسوب ہے۔ اور ہمارے تمام بڑے بڑے دینی مدارس میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہے۔ عربی زبان کے ابتدائی طالب علموں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) یہ کتاب نصائح اور حکم کا ایک نادر مجموعہ ہے۔ جو قرآن پاک کی آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات خلفائے اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور صوفیائے کرام و علمائے عظام کے اقوال کا مجموعہ ہے

(۲) کتاب کی زبان بڑی سلیس اور مطالب بڑے دل نشین ہیں۔

(۳) جملے چھوٹے چھوٹے اور روزمرہ کے محاورات میں استعمال ہونے والے ہیں۔

(۴) کتابت بڑی خوبصورت اور موٹے قلم سے کرائی گئی ہے۔

(۵) عربی زبان کے طالب علموں کے لئے اس سے اچھی ریڈر کا ملنا محال ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ (عہ)

القرأة الاعظمیہ الجزء الاول یہ پروفیسر محمد حسن الاعظمی جامعہ ازہر یونیورسٹی قاہرہ کے تعلیم یافتہ ہیں اور مروجہ عربی زبان کا اچھا ذوق رکھتے ہیں یہ کتاب ان کی تصنیف ہے

اس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) کتاب کی زبان مروجہ بول چال کی مصری عربی زبان ہے۔

(۲) کتاب کے مضامین ہندوستانی تاریخ کے دلچسپ قصے ہیں۔

(۳) کتاب با اعراب ہے۔ تاکہ اعراب کے بغیر طالب علموں کو پڑھنے کی مشق کرائی جاسکے قیمت بے جلد ۱۲؍

حقیقت نفاق مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں منافق اور نفاق کی ایمان سوز اور شرمناک حرکات .... مفصل بیان ہے۔ قرآن پاک، مومنوں، منافقوں اور کافروں کی حقیقت اور ان کے مسائل کا تذکرہ ہے اس کتاب میں صرف وہ حصہ بیان کیا گیا ہے جو صرف منافقوں سے متعلق ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

قرآن مجید اور نظام شمسی نظام شمسی سے متعلق قرآن مجید نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی تشریح و توضیح۔ بڑا دلچسپ رسالہ ہے قیمت ۳؍

انسان اور قرآن قرآن مجید نے تخلیق آدم اور تخلیق انسان کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ نہایت دلچسپ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ رسالہ پڑھنے کے لائق ہے قیمت ۳؍

مینیجر اقبال اکیڈیمی نمبر ۱۵ الف سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور۔

ہمارے ہندوستانی مسلمان

ولیم ہنٹر آئی۔ سی۔ ایس بنگال نے ۱۸۷۱ء میں انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی (OUR INDIAN MUSLMAN) ہے۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے تحریک مجاہدین پر ایک مفصل تبصرہ لکھا ہے یہ تحریک ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیاء کی ایک آخری کوشش تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے کس طرح مسلمانوں کو حیرت انگیز طور پر منظم کیا۔ اور کس طرح ان کو ایمان افروز قربانیوں کے لئے تیار کیا تھا۔ اس جماعت نے مسلسل ۲۵ سال تک سکھوں اور انگریزوں کی حکومت کو تشویش میں رکھا۔ کتاب میں اسلامی تحریک اور مسلمانوں کی ذہنیت پر خوب کھل کر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ کیا تھے۔ اور ہم کیا ہیں۔ کتاب اردو زبان میں پہلی مرتبہ اس حصہ میں آئی ہے۔ اور ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔ اپنی فرمائش جلد بھیجئے۔ ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔ (۲/۱۲)

حقیقتِ نفاق

مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی قرآن مجید کے اس حصہ کو جو نفاق، منافق، منافقت اور نفاق کی حقیقت سے بحث کرتا ہے۔ بالاستیعاب مطالعہ کر کے اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ قومی زندگی کو تباہ کرنے والا دشمن نمبر (۱) نفاق ہے۔ قرآن مجید نے نفاق کی کتنی قسمیں گنائی ہیں۔ اور منافقوں کی پہچان کیا بتائی ہے۔ اور نفاق اور منافقین سے الگ رہنے کے لئے کیا ہدایتیں دی ہیں۔ اگر ان سب باتوں کو یکجا دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ یہ کتاب تعلیمات قرآنیہ کا نچوڑ ہے۔ اور کوئی اردو لکھا پڑھا آدمی اس کے مطالعہ سے محروم نہیں رہنا چاہئے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ (۱/۸)

ملنے کا پتہ

دفتر اقبال اکیڈیمی نمبر ۴ (الف) اسٹریٹ روڈ بیرون موچی دروازہ۔ لاہور

جانبازِ ملّت نواب بہادر یار جنگ (مرحوم) کی یاد میں

(از جنابہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر — حیدرآباد دکن)

نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ پیغام حق کے پرچہ بابت ماہ جولائی و اگست میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل مرثیہ موصول ہوا۔ آپ کو اس سے اندازہ ہوگا کہ جنابِ قائدِ ملّت نے خود اہلِ حیدرآباد کے دلوں میں کتنی ہر دلعزیزی پیدا کر لی تھی۔ مرحوم کی سچی یاد یہ ہے کہ ہم بھی اپنے اندر اپنی قوم اور اپنے دین کے لئے وہ اخلاص وہ محبت اور ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کر لیں، جس نے اُن کو قبولیتِ عامہ کے اس مقام رفیع پر پہنچا دیا تھا۔ (مدیر)

آہ، اِک درماندہ مفلس قوم کا چشم و چراغ
منکشف جس کی نگاہوں پر تھے منزل کے سُراغ
چل رہا تھا، قوم کو لے کر اندھیری رات میں
اور گُم آفاق تھے، اُس کی مقدس ذات میں
مطمئن ملت تھی، میرِ کارواں بشاش تھا
جادۂ منزل کا ایک اِک راز اُس پر فاش تھا
صبح کے آثار پیدا تھے فضا پُر نور تھی
اور دکھائی دے رہی تھی منزلِ مقصود بھی!
آہ! ایسے میں اچانک ایک طوفاں آ گیا
چھا گئیں تاریکیاں اور کارواں لُوٹا گیا

آہ! کس منہ سے کہوں میں سو گیا شیرِ دکن
وہ کہ جس کے نام نے زندہ کیا نامِ وطن
جس کے ہر انداز سے تھی سطوتِ مومن عیاں
جس کی پیشانی پہ تاباں تھے قیادت کے نشاں
جس کی جاں پُرسوز تھی جس کا سخن تھا دلنواز
جس کی آہیں کارگر، جس کی نگاہیں کارساز
اُس کے مرنے کی خبر ویرانیاں برسا گئی
ملّتِ اسلامیہ پر مُردنی سی چھا گئی
منتشر شیرازۂ تنظیمِ ملّت ہو گیا
فرطِ غم میں ہر کس و ناکس سراپا کھو گیا
برق آسا گردشِ دوراں نے ڈھایا انقلاب
دوپہر کی چھاؤں میں، ڈوبا دکن کا آفتاب
اے بہادر یار جنگ! اے قائدِ روشن ضمیر
صاحبِ الہام، دربارِ رسالت کے سفیر
اے امیرِ کارواں، اے تاجدارِ حریت
تجھ سے قائم تھی جہاں میں رفعتِ انسانیت
اے شہنشاہِ خطابت! نازشِ اُردو زباں
کس قدر نازاں تھی تجھ پر مادرِ ہندوستاں
دردمندوں کا غریبوں، مفلسوں کا غمگسار
سلطنت کا پاسباں، شاہِ دکن کا جاں نثار

اے امیرِ پاک بیں! درویش دل جاگیردار
خدمتِ مخلوق، اور ایثار تھا تیرا شعار
تو غریبوں میں غریب اور تھا امیروں میں امیر
حق پرستی پر صدا قائم رہا تیرا ضمیر
تیرے حسنِ خلق کی تصویر عالم گیر ہے
آج دل میں ہر مسلماں کے تری تصویر ہے
برقِ ایمن تھا سراسر تیرا اندازِ بیاں
عزم سے تیرے لرزتا تھا غرورِ آسماں
ٹولیاں لاکھوں کی آتی تھیں تری آواز پر
دنگ رہتا تھا زمانہ اس ترے اعجاز پر
وہ تدبر، وہ فصاحت، وہ نوائے آتشیں
آگ بھڑکاتا دلوں میں وہ ترا سوزِ یقیں
تیرا ہر انداز، ہر حالت میں جاں پرور رہا
جو ترے دل میں رہا، وہ سب سے منوا کر رہا
عظمتِ مسلم کے مظہر وہ ترے اجلاسِ عام
جشنِ نوروزی مناتی تھی شبِ "دارالسلام"!
جگمگاتے شہ نشیں پر جلوہ فرمائی تری
اور انسانی سمندر پر وہ دارائی تری
یاد ہیں وہ تیری رنگا رنگ بزم آرائیاں
وہ تری شعلہ نوائی کی فلک پیمائیاں

دم بخود رکھتی تری تقریر کی جادوگری
صبح تک بھی گرم رہتی تھی وہ بزمِ ساحری
تیری یکسر خاموشی پر، اب ہر اک حیران ہے
ہے دکن ویران، اور ہندوستاں سنسان ہے
کیسے کیسے آئے ہیں طوفان تیرے سامنے
کس قدر موزوں تھے تیرے ہاتھ اُن کو تھامنے
سابقہ تیرا بہار و باد و باراں سے رہا
ہر جنوں وابستہ تیرے ہی گریباں سے رہا
آہ، تیری جان کتنے بار جوکھم میں رہی
منہمک پر تیری ہمت سعیٔ پیہم میں رہی
معرکہ تیرا سراسر، سحرِ باطل سے رہا
واسطہ تجھ کو ہمیشہ اپنی منزل سے رہا
آزمائش کے کبھی تو مرحلے درپیش تھے
اور کبھی بادِ مخالف کے چلن دل ریش تھے
مسلکِ شاہیں کی پیرو، تیری ہر تلقین تھی
جاہ و دولت کی کشاکش میں تری توہین تھی
اپنی شخصیت پہ تو نے کر دیا سب کچھ نثار
دیکھ! ہے کتنی بلندی پر ترا ذاتی وقار
کرتے ہیں گردش ہزاروں سال جب شام و سحر
مادرِ گیتی عطا کرتی ہے تجھ سا دیدہ ور

"تذکرۂ ذوقِ سفر" کا ہو رہا تھا سر بہ سر
دل میں کیا آیا کہ تو نے کر لیا عزمِ سفر
ہو گیا اقبالؔ میں گُم تیرا نطقِ آخریں
آفریں صد آفریں! اقبالؔ کے رُوح الامیں
"عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام"[1]
ہو گیا دم بھر میں رخصت، والیٔ "دار السلام"!
موت سے یاں، ماہِ ملّت کا جو ماتھا ماند تھا
آسماں پر مضطرب چوتھی رجب کا چاند تھا
ملّتِ اسلامیہ کی کم نصیبی کی دلیل!
کاتبِ قدرت نے لکھّی عمر جو اتنی قلیل!
آہ وہ منظر، کبھی دنیا بھلا سکتی نہیں
کیفیّت الفاظ کی صُورت میں آ سکتی نہیں
تھا سرِ بالیں، تأسّف میں دکن کا تاجدار
سامنے بے جان تھا اُس کا بہادر جاں نثار
جو صداقت پر، بہر حالت رہا ثابت قدم
کھائیگی تاریخ جس کی شاہ پرستی کی قسم!
گُونج اُٹھے شورِ ماتم سے زمین و آسماں
قائدِ ملّت، ہوا جب دوشِ ملّت پر رواں

---

[1] ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا } حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں } قائدِ ملّت انتقال سے قبل علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی تفسیر بیان فرما رہے تھے۔

نوحہ گر تھی قافلے میں وحدتِ خیر الامم
سرنگوں تھے ملتِ بیضا کی مہتابی علَم
اُس جلوسِ منتشر کا "دیدہ ور" بے جان تھا
اِک قیامت کا سماں، مخلوق کا طوفان تھا!
جا رہا تھا آخری منزل کو میرِ کارواں
تھے جلو میں کس مپرسی اور فلاکت کے نشاں
ماہ و مہر و مُشتری کیا، آسماں حیران ہے
تیرے مرنے کی ادا پر، زندگی قربان ہے
یاد تیری ہر قدم پر بجلیاں برسائیگی
ہائے اب تنظیمِ ملت کیا سے کیا ہو جائیگی
اپنی من مانی کرے گی گردشِ لیل و نہار
جانشیں کا تیرے صدیوں تک رہیگا انتظار
گر رہے بھی آسماں پر، مدتوں اُس کے قریب
ہو نہیں سکتا شکوہِ ماہ، تاروں کو نصیب
کھو کے سب الماس و گوہر آور "کوہ نور" کو
حق سے پایا تھا دکن نے اک "سراپا طور" کو
اُس کے دل کے نور سے اب بھی فضا معمور ہے
"موت" میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے

چند آنسو

(خطیرہ مشیر آباد کے ضمن میں)

اے مشیر آباد! کتنا بڑھ گیا تیرا وقار
سو رہا ہے تیرے دامن میں دلوں کا تاجدار
سرمہ سا ہر ذرّہ تیری خاک کا مرغوب ہے
تیرے سینے میں مسلماں قوم کا محبوب ہے
ایک جذبِ اندروں سے تو نے پایا یہ مقام
ہے شکستِ آرزو پر "نوحہ گر" دار السلام
تیرے اس سنسان خطیرے میں جو محوِ خواب ہے
ملّتِ مظلوم کا سرمایۂ نایاب ہے
ہر زمانہ میں یہ کہنا گردشِ افلاک سے
اک نیا خورشید ابھرا تھا دکن کی خاک سے

ادبیات

وہ دن آئیں بھی اے کامل نظامِ زندگی بدلے
نئی ہو اک زمیں پیدا۔ نیا اک آسماں پیدا

نہ ہو بلبل کو خوف باغباں صحنِ گلستاں میں
نئی اک شاخِ گل پر ہو نیا اک آشیاں پیدا

پرانے بُت کدوں پر جبہ سائی اب نہیں ہوتی
الٰہی ہو نیا سجدے کی خاطر آستاں پیدا

بھُلاتے جا رہے ہیں لوگ آدابِ شجاعانہ
کوئی ایسے میں ہوتا کاش میرِ کارواں پیدا

جو اپنی جان دیدیتے ہیں کامل راہِ اُلفت میں
وہی کرتے ہیں بس دنیا میں نامِ جاوداں پیدا

لے سبق زندگی کا دریا سے
مانگ بلبل سے طاقتِ پرواز

سیکھ پروانے سے فداکاری
شمعِ روشن سے خوئے سوز و گداز

راز داری کا درس لے گُل سے
دیکھ بہنے دے اپنے راز کو راز

اک نہ اک دن کوئی سُنے گا ضرور
تو برابر لگائے جا آواز

اپنے ایثار و سرفروشی سے
اک نئی زندگی کا کر آغاز

مجھ کو بھی تو اب جینے کی حسرت نہیں باقی
دنیا کو اگر میری ضرورت نہیں باقی

یہ باز کو کیا ہو گیا اُڑتا ہی نہیں ہے
کیا اگلی سی پرواز کی طاقت نہیں باقی

یہ کیا تغیر ہُوا اے جذبِ محبت
روحوں میں وہ اگلی سی حرارت نہیں باقی

بہتر ہے کہ باقی نہ رہے نام بھی اس کا
جس قوم میں اخلاق و شجاعت نہیں باقی

اے ہمتِ مردانہ کہاں سو گئی جا کر
پروانے میں جل مرنے کی قوت نہیں باقی

کامل جونپوری

تنقید و تبصرہ

ہیگل۔ مارکس اور نظامِ اسلام

مصنفہ مولوی محمد مظہر الدین صدیقی بی اے (حیدر آباد دکن)

سائز ۲۰×۲۶/۸ کاغذ کتابت طباعت بہت عمدہ۔ سرورق خوشنما۔ قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن دارالاسلام پٹھان کوٹ

اسلام اور اشتراکیت کے موضوع پر آج کل بکثرت مضمون نگاری ہو رہی ہے۔ لیکن اکثر اوقات لکھنے والے ان دونوں مضمونوں میں سے ایک ہی کے جاننے والے ہوتے ہیں یعنی جو اسلام سے واقف ہیں وہ اشتراکیت کو نہیں سمجھتے۔ اور جو اشتراکیت کا مطالعہ رکھتے ہیں وہ اسلام سے ناواقف ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ دونوں قسم کے مضمون نگار تنقید کا صحیح حق ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں کبھی کبھار حسنِ اتفاق سے ایسا ہوجاتا ہے کہ اسلام اور اشتراکیت کو یکساں طور پر سمجھنے والا کوئی مضمون نگار حقِ تنقید ادا کرے۔ لیکن اس قسم کی معیاری تحریریں تعداد میں بہت ہی کم اور وسعت میں بہت ہی محدود ہوتی ہیں۔ مولوی مظہر الدین صدیقی پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اشتراکیت اور اسلام کے موضوع پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ایک ضخیم کتاب اردو دان دنیا کے سامنے پیش کر دی ہے۔

زیرِ نظر کتاب "ہیگل۔ مارکس اور نظام اسلام" دو سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دفتر "ترجمان القرآن" دارالاسلام پٹھانکوٹ سے پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

جہاں کتاب کا مضمون مصنف کی قابلیت کا ثبوت پیش کرتا ہے وہاں اس کا حسن ظاہری مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے حسن ذوق کی داد دیتا ہے جن کے زیر اہتمام دارالاسلام پٹھانکوٹ میں اشاعت اسلام کا عظیم الشان سلسلہ جاری ہے۔ یہ کتاب بالاقساط رسالہ ترجمان القرآن میں اس سے پہلے شائع ہو چکی ہے۔

وہ لوگ جو بغیر مطالعہ کئے یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت میں چنداں فرق نہیں وہ جب اس کتاب کا بامعان نظر مطالعہ کریں گے تو انہیں یہ معلوم ہونے پر حیرت ہوگی کہ اسلام اور اشتراکیت میں کتنا زبردست بُعد ہے۔ یہ فرق تفصیلات میں بھی ہے اور اصولوں میں بھی۔ مولوی محمد مظہرالدین صاحب نے ان فروق کو تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا ہے اور پھر یہ ثابت کر دیا ہے کہ جہاں جہاں اسلام کو اشتراکیت سے اختلاف ہے وہاں وہاں اسلام ہی صحیح ہے

کتاب ایک دیباچہ۔ نو ابواب اور ایک تتمہ پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ہیگل کے فلسفہ کی تشریح کی گئی ہے۔ اس لئے کہ مارکس نے اپنے تمام فکر کی عمارت ہیگل کی اساس پر ہی تعمیر کی ہے۔ دوسرے باب میں مارکس کے مادی نظریہ تاریخ اور فلسفہ اشتراکیت پر بحث کی گئی ہے تیسرے باب میں مارکس اور ہیگل کی فکری لغزشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں فاضل مصنف نے وسعت مطالعہ۔ عمق نظر اور تبحر علمی کا حیرت انگیز ثبوت پیش کیا ہے۔ یہاں تک پہنچ کر انسان اشتراکیت کے اصولوں سے واقف اور ان کی کمزوریوں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد چوتھے باب میں اس جدلی عمل کا تخیل پیش کیا ہے جس کے متعلق اسلام میں اشارات پائے جاتے ہیں پھر پانچویں باب میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ مارکس کا نقطۂ نظر مذہب کے بارہ میں کیا ہے۔ چھٹے باب میں اسلام کا اپنا نظام معیشت بیان ہوا ہے۔ ساتویں باب میں "تمدنی مسائل اور الہامی ہدایات" کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ آٹھویں باب کا موضوع "اسلامی نظام میں قانون سازی

اور فکر و رائے کی آزادی ہے" اور آخری یعنی نویں باب میں" اسلامی نظریہ مملکت" پیش ہوا ہے یہ کتاب کا اجمالی خاکہ ہے اب ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کے بعض پہلوؤں پر نظر ڈالیں گے۔

سب سے پہلے دیباچہ میں مصنف کا یہ دعوے ہمارے سامنے آتا ہے کہ" ہیگل اور مارکس کے نظریات صرف نظری حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عملی دنیا میں بھی اسلامی نظام سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ ہیگل کا فلسفہ اسلامی فلسفہ مملکت کا بر عکس ہے کیونکہ اسلامی مملکت ایک جوابدہ مملکت ہے۔ اگرچہ اس کی یہ جواب دہی جمہور کے سامنے نہیں بلکہ دستور قرآنی کے سامنے ہے۔ اس کے برخلاف ہیگل کی مملکت نہ تو کسی اصول کی پابند ہے اور نہ کسی حیثیت سے جواب دہ ہے اسی طرح مارکس اور اس کے نظریاتِ اخلاق و معیشت اسلام کے فلسفہ اخلاق اور اسلامی نظامِ معیشت سے براہ راست متصادم ہوتے ہیں مارکس کے نقطہ نظر سے اخلاقی اصول اور مذہبی احکام معاشی ضروریات کے تابع ہیں ہر مرتبہ جب معاشی تقاضوں اور اخلاقی اصولوں میں تصادم ہوتا ہے تو اخلاق کو سپر ڈالنی پڑتی ہے اور معاشیات کی بالادستی تسلیم کرنی پڑتی ہے"۔

ہیگل کا فلسفہ جدلی عمل کا فلسفہ ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ" ہر شے نہ صرف اپنی ضد سے قائم ہے بلکہ دنیا میں اب تک جو کچھ ترقی ہوئی ہے اور انسانیت نے تاریخ کے میدان میں جتنے قدم بڑھائے ہیں ان کا اصلی سبب اور حقیقی محرک اضداد کی جنگ و پیکار ہے ہر تصور جب ایک حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو اس سے اس کی ضد پیدا ہو جاتی ہے اور ان دونوں کی باہمی آویزش سے ایک نیا تصور وجود میں آتا ہے" لیکن ہیگل اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اس نئے تصور میں اس کے ضد کی یاد باقی رہتی ہے اور یوں یہ نیا تصور پہلے سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔

ارتقا کا یہ عمل ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ نیا تصور پھر اپنی ضد پیدا کر لیتا ہے۔ ان دونوں میں باہمی آویزش شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس آویزش اور امتزاج کا نتیجہ ایک اور نئے تصور کی پیدائش کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ اسی طویل تخریب اور تعمیر کے سلسلہ کے دوران میں جیساکہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے نفی شدہ تصور کی اصلی قدر و قیمت ضائع نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ سلسلہ ارتقا کی تمام کڑیوں کا اصلی جوہر محفوظ رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہیگل کا نظریہ "تحفظِ اقدار" کا نظریہ ہے ہیگل کے نزدیک نوعِ انسانی کی پوری تاریخ اسی کشمکشِ تصورات سے عبارت ہے۔" گویا تاریخ ایک میدانِ جنگ ہے۔ جس میں تصورات و افکار کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ تصورات اور فکری میلانات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اس ہم آہنگی سے ایک فکری وحدت یا کلیت وجود میں آتی ہے۔ جو اس پورے دَور پر حاوی ہوتی ہے۔ اسی کا نام "روحِ عصر" ہے۔ "جو ہر دَورِ تاریخ میں زندگی کی ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور اس دَور کے اعمال و افکار کی صورت گری کرتی ہے۔" دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ "ہر دَور میں زندگی کے مختلف شعبوں میں جو میلانات رونما ہوتے ہیں۔ ان کے اندر ایک مخفی وحدت کا سراغ ملتا ہے۔ تمدن و مذہب۔ سیاست و معیشت۔ معاشرت و اخلاق۔ سب کے سب اسی وحدتِ فکری کے حامل اور روحِ عصر کے زیرِ فرمان ہوتے ہیں۔"

ہیگل کے فلسفہ میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ کشمکش کے اس تمام سلسلہ میں انسان محض آلۂ کار ہے جس سے روحِ عصر کام لیتی ہے۔ انسان خود اس روح کے ہاتھ میں کھلونا ہے غرضیکہ "ہیگل تاریخ کے تمام واقعات و حوادث میں صرف افکار و تصورات کی قوت کارفرما پاتا ہے"۔

مارکس نے اپنے فلسفہ کی عمارت ہیگل کے جدلی عمل کی بنیاد پر تعمیر کی۔ لیکن اوپر کی عمارت ہیگل کے فلسفہ سے بالکل مختلف بنائی۔ ہیگل کے نزدیک اضداد کی جنگ تصورات

کے میدان میں لڑی جاتی ہے۔ لیکن مارکس کے نزدیک تاریخ کی رفتار میں جو چیز حقیقتاً مؤثر اور فیصلہ کن ہے وہ افکار کا جدلی عمل نہیں۔ بلکہ انسان کی خارجی زندگی کے انقلابات ہیں جو جدلی عمل پیدا کرتے ہیں۔" مارکس کا دعویٰ ہے کہ تاریخ انسان کے ہر دور میں زندگی کی اصلی بنیاد اس دور کا معاشی نظام ہوتا ہے۔ جس پر انسان کے اخلاقی اور مذہبی تصورات اس کے تمدن اور علوم و فنون کی عمارت قائم ہوا کرتی ہے۔ ہر دور کا معاشی نظام ایک مدت تک اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ پھر خود اس کے اندر اس کی مخالف قوتیں پیدا ہو کر اس نظام کے خلاف مصروفِ پیکار ہو جاتی ہیں۔ اس جدلی عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک نیا معاشی نظام پیدا ہو کر بدلے ہوئے زمانہ میں انسانی ضروریات کو پورا کرنے لگتا ہے۔ اور اب انسانی ذہن کے تمام تصورات اس نئے معاشی نظام کی روشنی میں نئی صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ غرضیکہ مارکس نے ہیگل کے جدلی عمل کو فکر و تصور کے عالم سے نکال کر خارجی زندگی اور اس کی معاشی تنظیم پر چسپاں کر دیا۔ اور یوں انسان عالم میں فکر کو اولیت حاصل ہونے کی بجائے مادی زندگی کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اور انسان افکار و تصورات اس مادی زندگی کے تابع قرار پا گئے۔

ہیگل کے فلسفہ کی اصل الاصول یعنی جدلیت کے تخیل کو لے کر مارکس نے ایک عظیم الشان عمارت ایسے افکار کی بنائی جنہوں نے ایک دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ اب ہمیں انہیں افکار پر ایک نظر ڈالنی ہے۔ مولوی محمد مظہر الدین صاحب نے جس وقتِ نظر کے ساتھ مارکس کے خیالات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے وہ موجبِ صد مبارک باد ہے۔ اس لئے کہ جب تک ایک زبردست مدرسۂ فکر کو صحیح طور پر سمجھا نہ جائے اس وقت تک اس پر تنقید کرنا محال ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کی اس بارہ میں تمام بحث کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

معاشی ضروریات انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ آفرینش دولت کی اجتماعی کوششوں میں تقسیم کار کے اصول پر کام کرے۔ اس کا نتیجہ تقسیم طبقات کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ان طبقات میں سے ہر طبقہ کا مفاد دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اجتماعی کوششوں سے جو دولت پیدا ہوتی ہے اس کی تقسیم کا ایک نظام وجود میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک نظام ملکیت کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ جس کے مطابق افراد کے ملکیتی تعلقات معین ہوتے ہیں۔ اس تمام معاشی نظام سے انحراف کرنا افراد کے لئے ممکن نہیں ہوتا اس لئے کہ ہر ایسا انحراف مروجہ قانون کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ کے ہر دور کا معاشی نظام مارکس کے نزدیک حالات پیداوار اور پیداواری قوتوں کی مصالحت اور ہم آہنگی کا مظہر ہوتا ہے لیکن ایک مدت کے بعد جب مروجہ معاشی نظام اپنی عمر ختم کر لیتا ہے۔ تو اس وقت اس کے اندر سے نئی پیداواری قوتیں ظہور کرتی ہیں جن سے حالات پیداوار مساعدت نہیں کرتے۔ اس مرحلہ پر حالات پیداوار اور نئی پیداواری قوتوں میں تصادم شروع ہو جاتا ہے کیونکہ حالات پیداوار ان قوتوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔

مارکس کے فکر میں "حالات پیداوار" اور "پیداواری قوتیں" دو بنیادی عناصر ہیں۔ "حالات پیداوار" سے اس کی مراد اس تمام قانونی نظام سماجی تنظیم اور ملکیتی دستور سے ہے جس سے افراد کا باہمی تعلق معین ہوتا ہے۔ اور "پیداواری قوتوں" سے مارکس کی مراد ہے وہ ایجادیں اور انکشافات جو آفرینش دولت کے طریقوں کو بدل کر سماج کی معاشی تنظیم پر اثر ڈالتی ہیں۔ مارکس کہتا ہے کہ ہر زمانہ کا معاشی نظام حالات پیداوار اور پیداواری قوتوں کی مصالحت اور ہم آہنگی کا مظہر ہوتا ہے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ حالات پیداوار بحیثیت مجموعی سماجی نظام کا خاکہ بناتے ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ "مادی زندگی کے حوائج و ضروریات ہر زمانہ میں آفرینش دولت کے مخصوص طریقے وجود . . . .

میں لاتے ہیں اور پھر یہ مخصوص طریقے اس دور کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں۔ غرضیکہ جہاں ہیگل یہ کہتا تھا کہ انسان کا طرز معاشرت اور طریق معیشت اس کے ذہن وشعور کے ارتقاء سے متعین ہوتا ہے مارکس اس بات کا مدعی ہے کہ انسانی ذہن وشعور کی حالت اس کی معاشرت اور طرز معیشت کی آئینہ دار ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب جدلی عمل کے بعد نیا نظام معاشی پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ افکار وتصورات علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی تمام عمارت بھی نئے سرے سے تعمیر ہوتی ہے ؛؛

اس مقام سے آگے بڑھ کر فاضل مصنف ہمیں بتاتے ہیں کہ مارکس کے معاشی فلسفے کے تین بڑے اہم جزو ہیں۔ اوّل طبقاتی نزاع۔ دوم تاریخ کا مادی تصور اور سوم مارکس کا نظریۂ افکار۔ طبقاتی نزاع اس سے پیدا ہوتا ہے کہ جب نئی پیداواری قوتیں نمودار ہوکر حالات پیداوار سے متصادم ہوتی ہیں تو ان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ مروجہ معاشی نظام کی طبقاتی تقسیم بدل دیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ معاشی طبقوں کی تقسیم نئے سرے سے عمل میں لائی جائے۔ اور پرانا ملکیتی نظام بھی بدل دیا جائے۔ یہ چیز موجودہ باقتدار طبقوں کو پسند نہیں ہوتی۔ اور وہ اس تقاضہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہذا باقتدار طبقوں اور محروم طبقوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے اس کشمکش میں موجودہ باقتدار طبقہ مروجہ معاشی نظام کا حامی ہوتا ہے اور محروم ومظلوم طبقہ مروجہ طبقاتی تقسیم۔ معاشی تنظیم اور ملکیتی نظام کو یکسر مٹا دینا چاہتا ہے۔ اس کشمکش میں مظلوم ومقہور فتح پاتے ہیں۔ اور ان کی فتح کے ساتھ ہی معاشی نظام بدل کر طبقاتی تقسیم۔ معاشی تنظیم اور ملکیتی نظام نئی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں۔

اب مارکس کے مادی نظریۂ تاریخ پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ تاریخ کے واقعات اور سیاسی انقلابات کی تہ میں طبقہ داری نزاع ہی کام کرتی ہے۔ اور

اس اصول کو بنیادی حیثیت دے کر مارکس تمام انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالتا ہے اُسے نوعِ انسانی کی تمام کش کش محض اقتصادی حالات کا نتیجہ نظر ہوتی ہے۔ مذہبی لڑائیاں ہوں یا سیاسی۔ مارکس کہتا ہے کہ ان سب کی تہ میں معاشی حالات ہی کارفرما ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کے الفاظ میں مارکس کے نزدیک "تاریخ کی ساری کشمکش معاشی اسباب و محرکات سے پیدا ہوتی ہے ملک گیری کی لڑائیاں۔ مذہبی اصولوں کی خونریزیاں اور ایک ہی ملک کے مختلف عناصر میں باہمی خانہ جنگیاں سب کی تہ میں معاشی اسباب کارفرما رہے ہیں"

مارکس کے فلسفہ کا تیسرا جزو "نظریۂ افکار" ہے۔ مارکس کے نزدیک "تصورات مادی زندگی کی سرزمین سے پھوٹتے اور اپنے عہد کے خارجی ماحول سے تشکیل پاتے ہیں۔ ...... اس لئے ہر دور کی خصوصیاتِ فکر اس کے خارجی ماحول سے زندگی حاصل کرتی اور اسی کی قوتوں سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ پھر چونکہ مارکس کے نزدیک معاشی ضروریات اور انسانی زندگی کے مادی تقاضے ماحول کی تشکیل میں غالب حصہ رکھتے ہیں۔ اس لئے بطور نتیجہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ افکار و تخیلات کی صورت بندی میں بھی زمانہ کے معاشی نظام کا اثر سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے"

مارکس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اخلاق اور قانون کا تمام تر نظام ایک دور کے ان معاشی طبقوں کے تخیلات اور مفادات کے مطابق بنتا ہے جو آلات و وسائلِ پیدائش پر قابض اور معاشی زندگی پر حکمران ہوتے ہیں۔ اس سے مارکس ایک دور رس نتیجہ یہ اخذ کرتا ہے کہ کسی کام کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اچھا یا بُرا ہے۔ جب تک کہ ان حالات کا جائزہ نہ لے لیا جائے جن میں وہ کام ہوا تھا۔

ہیگل اور مارکس کے فلسفہ کی بحث کا ملخص خود مولوی محمد مظہرالدین صاحب باب دوم

کے آخر میں یوں پیش فرماتے ہیں :-

"اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مارکس اور اس کے پیرووں کی نظر میں قانون ۔ اخلاق ۔ مذہب ۔ علوم و فنون ۔ سیاسی ادارے اور معاشرتی آداب و رسوم یہاں تک کہ زبان اور اس کے مختلف اسالیب بیان بھی زندگی کے مادی تقاضوں اور مروجہ معاشی نظام کی ضروریات سے پیدا ہو کر نشو و نما پاتے ہیں۔ ہر دور میں جو معاشی نظام انسانی احتیاجات کا کفیل ہوتا ہے ۔ اسی کی روح پورے دور کے فلسفیانہ نظریات میں ۔ افکار و تصورات میں ۔ اخلاق و تمدن اور مذہب و معاشرت میں جاری و ساری ہوتی ہے ۔ معاشی نظام ہی وہ بنیاد ہے جس پر تمدن کی بالائی عمارت کھڑی کی جاتی ہے اور یہی وہ اساس ہے جس پر انسانوں کے باہمی تعلقات قائم ہوتے ہیں ۔ خواہ یہ تعلقات خانگی زندگی سے متعلق ہوں یا سیاسی اور معاشرتی زندگی سے "

کتاب کے تیسرے باب میں مولوی محمد مظہر الدین صاحب نے ہیگل اور مارکس کی فکری لغزشوں پر فاضلانہ بحث کی ہے۔ مولوی صاحب ہیگل کے اس دعوے کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا میں اضداد کی کشاکش جاری ہے وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہر نظام جب ارتقا کے ایک خاص درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اسی کے اندر سے اس کی مخالف قوتیں نمودار ہو کر ایک نیا نظام ترتیب دیتی ہیں اور یہ نیا نظام پرانے نظام پر غالب آجاتا ہے۔ لیکن وہ ہیگل کے فلسفہ کے دوسرے جزو سے متفق نہیں جو یہ بتاتا ہے کہ ہر نیا تصور نفی شدہ تصور سے مل کر ایک ایسی نئی وحدت پیدا کرتا ہے جس میں نفی شدہ تصور کی یاد باقی رہتی ہے۔ ہیگل کا یہ نظریہ "تحفظ اقدار کا نظریہ" کہلاتا ہے۔ لیکن مولوی صاحب کے نزدیک یہ نظریہ منطقیانہ نقطۂ نگاہ سے غلط ہے۔ اس لئے کہ مختلف تصورات میں سے صالح اجزا کو منتخب کر لینا اور غیر صالح

اجزاء کو چھوڑ دینا ایک صاحب ارادہ قوت ہی کا فعل ہو سکتا ہے۔ لیکن ہیگل کسی ایسی فعال قوت کا وجود تسلیم نہیں کرتا۔ اور مارکس بھی اس چیز کا قائل نہیں۔ پھر مولوی صاحب کے خیال میں "ہر تصور ایک مکمل وحدت ہے جس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ دعوے صحیح نہیں ہو سکتا کہ کسی تصور کے مختلف پہلوؤں میں سے بعض کو اخذ اور بقیہ کو ترک کیا جا سکتا ہے۔"

مولوی صاحب ہیگل کے خلاف اپنی تائید میں تاریخ کا یہ ناقابلِ تردید واقعہ پیش فرماتے ہیں کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں جب یورپ میں مذہب کے خلاف فکری بغاوت پیدا ہوئی تو اس نے مذہبی اندازِ فکر کی کسی خصوصیت کو باقی نہ رہنے دیا۔

مارکس کے خلاف بھی مولوی صاحب کا یہی اعتراض ہے کہ اس نے غلط طور پر یہ خیال قائم کر لیا کہ کسی معاشی نظام کے اندر جو مخالف قوتیں ظہور کرتی ہیں۔ وہ کچھ عرصہ کی کشمکش کے بعد ایک ایسا نیا معاشی نظام ترتیب دیتی ہیں جو سابق نظام پر غالب آجاتا ہے اور یہ نیا نظام پہلے نظام کو مٹا بھی دیتا ہے اور اس کے صالح اجزا کو جذب بھی کر لیتا ہے۔ مولوی صاحب اس خیال کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر "غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ سرمایہ داری میں نظام جاگیرداری کی خصوصیات باقی رہتی ہیں۔ اور نہ جاگیرداری نظام میں نظامی غلامی کے کسی جزو کا سراغ ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی عملی یا فکری تحریک کی منطقی تکمیل کے بعد جب مخالف رجحانات نمودار ہوتے ہیں تو یہ نہیں ہوتا ہے کہ نئے رجحانات اس تحریک سے مل کر ایک نئی ترکیب اختیار کر لیں۔ بلکہ اکثر و بیشتر صورتوں میں مخالف رجحانات تحریک مذکور کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ اور اس کی جگہ ایک نئی تحریک پیدا کر دیتے ہیں جو پرانی تحریک کے ہر پہلو کی نفی کرتی ہے۔"

جہاں مارکس یہ کہتا ہے کہ تاریخی ارتقا کا اصلی محرک معاشی طبقوں کی باہمی کشمکش اور نزاع ہے وہاں اس نے تسلی بخش طور پر یہ نہیں بتایا کہ اشتراکیت کے قیام کے بعد جب طبقات کی تقسیم کا وجود ہی نہ رہے گا تو پھر ارتقاء کا محرک کیا ہو گا۔ جب تیقن کے ساتھ یہ کہہ دیا جائے کہ "انسانی تمدن کی تمام حرکت اور ترقی معاشی طبقات کی باہمی نزاع پر موقوف ہے تو پھر ایک ایسی سوسائٹی میں تبدیلی اور ترقی کا عمل کیوں کر جاری رہ سکتا ہے جس میں نہ معاشی طبقوں کا وجود ہو گا اور نہ طبقاتی نزاع کا نام و نشان "۔

مولوی محمد مظہرالدین صاحب نے مارکس کے مادی نظریہ تاریخ پر بھی بہت فاضلانہ بحث کی ہے۔ مارکس کا دعوٰے یہ ہے کہ تاریخی ارتقا میں مادی محرکات اور معاشی قوتیں ہی تمام اثرات و نتائج مرتب کرتی ہیں۔ نیز مارکس انسانی شخصیت اور اس کے ذاتی اعمال و عزائم کے اثر کا چنداں قائل نہیں۔ مارکس کے خیال میں تاریخی ارتقاء کی اصلی کارفرما قوت معاشی طبقات کی کشمکش ہے"۔ مولوی صاحب اس مارکسی نظریئے سے اختلاف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

> "اگر گہری نظر سے دیکھی جائے تو معلوم ہو گا کہ تاریخی واقعات و حوادث کے اسباب ایسے پیچیدہ اور ان کی علتوں کے رشتے باہم اس قدر مربوط ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا یا ان کا مکمل تجزیہ کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے سیاسی سازشیں جنسی رقابت و حسد۔ اقتدار کی ہوس۔ دبے ہوئے حوصلے۔ مذہبی جوش و خروش۔ اصلاحی جذبات۔ اور اجتماعی کشمکش۔ یہ سب اور دیگر اسباب مل کر بحیثیت مجموعی تاریخی واقعات کی تشکیل پر موثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح غیر معمولی خصوصیات رکھنے والے بڑے بڑے افراد تاریخ پر جو نقوش ثبت کر گئے ہیں ان سے بھی بالکل صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ...... ان تمام تاریخی عوامل کو جو انسانی فطرت سے کسی طرح کم

پیچیدہ نہیں ہیں۔ ایک سادہ ضابطہ میں تحلیل کرنے کی کوشش کرنا نظریہ سازی کی خاطر واقعات کا خون کرنا ہوگا۔ بے شمار حوادث تاریخ کی رفتار اور سمت ترقی پر مؤثر ہوتے ہیں۔ کتنے اتفاقات ہیں کہ اگر واقع نہ ہوتے تو ہماری تاریخ کچھ اور ہوتی۔"

یہاں مولوی صاحب اپنے دعوے کی تائید میں تاریخی شواہد پیش کرتے ہیں مثلاً یہ کہ "کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ روس میں جو انقلاب ہوا اس میں لینن کی شخصیت کام کر رہی تھی اس لئے کہ اگر حکومت جرمنی اس کو روس جانے کی اجازت نہ دیتی۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ روس میں واقعات کی رفتار وہی ہوتی جو اس کے وہاں جانے سے ہوگئی۔ وزیر متعلقہ جس نے لینن کو روس جانے کی اجازت دی اگر طبیعت کے معمولی تکدر کا شکار ہوجاتا اور 'ہاں' کی جگہ 'نہیں' کہہ دیتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ روسی انقلاب کی شکل و نوعیت یا اس کے نتائج میں کوئی فرق نہ پڑتا"

ایسے ہی اگر ہنری ہشتم جذبات عشق سے مغلوب ہوکر این بولین کے دام محبت کا اسیر نہ ہوجاتا تو آج شاید ریاستہائے متحدہ امریکہ کا وجود نہ ہوتا کیونکہ یہی واقعہ بادشاہ انگلستان اور پاپائے روم کی باہمی مخالفت کا سبب بنا اور اسی وجہ سے انگلستان نے پاپائے روم سے اپنا تعلق منقطع کیا۔ اس انقطاع کا نتیجہ خیز پہلو یہ تھا کہ انگلستان نے امریکہ پر پرتگال اور اسپین کے حق ملکیت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ کیونکہ پوپ نے امریکہ کو بطور عطیہ ان دونوں ممالک کے حوالے کیا تھا۔ اس تاریخی اتفاق کی وجہ سے انگلستان نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کیا ورنہ اگر وہ بدستور کیتھولک رہتا تو آج ریاستہائے متحدہ امریکہ شاید اسپینی امریکہ میں شامل ہوتیں۔"

اس سلسلہ میں "انقلاب فرانس" کا واقعہ خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ مارکس

نے اپنے نظریہ تاریخ کی بحث میں اس واقعہ کو بہت اہمیت دی ہے۔ وہ اس کو معاشی طبقات کی باہمی کشمکش کی ایک بیّن مثال قرار دیتا ہے۔ اور پھر یہ بتاتا ہے کہ یہ انقلاب پرانے جاگیرداری نظام کے خلاف بورژوا یعنی متوسط طبقوں کی بغاوت کا نتیجہ تھا۔ اب مولوی محمد مظہر الدین صاحب انقلاب فرانس کے متعلق مارکس کی توجیہہ سے اختلاف کرتے ہیں وہ مدعی ہیں کہ فرانس میں رائج الوقت سیاسی نظام کے خلاف جس طبقہ میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ بے چینی پیدا ہوئی وہ فرانس کے ارباب علم اور اصحاب فکر کی جماعت تھی۔ اسی جماعت نے ملک میں سب سے پہلے بغاوت کے جراثیم پھیلائے تھے لیکن یہ جماعت ان معنوں میں کسی معاشی طبقہ کی تعریف میں نہ آسکتی تھی۔ جس میں مارکس نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ کیونکہ وہ ہر طبقہ کے افراد پر مشتمل تھی۔"

اسی طرح انقلاب فرانس کا مقصد ابتدا میں یہ نہ تھا کہ مروجہ سیاسی نظام کو کلیتہً تباہ و برباد کر دیا جائے۔ بلکہ نظم و نسق کی خرابیاں دور کرنا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آغاز انقلاب میں بادشاہ کی ذات ہی عوام کی امیدوں کا مرجع و مرکز تھی۔

اس سلسلہ میں مولوی صاحب ایک اور حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مارکس تو یہ کہتا ہے کہ انقلاب فرانس معاشی طبقات کی ایک دوسرے کے خلاف جنگ کا نتیجہ تھا۔ لیکن فرانس کے سوا دوسرے یورپین ممالک میں جہاں معاشی حالات بعینہ اسی نوعیت کے تھے کوئی انقلاب رونما نہ ہوا۔ یورپ کے ہر ملک میں اسی زمانہ میں معاشی ابتری اور اقتصادی بدحالی کا دور دورہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود کسی ملک میں مروجہ نظام کے خلاف بغاوت کے آثار پیدا نہ ہوئے۔ مولوی صاحب کے نزدیک "فرانس کے انقلاب کا حقیقی سبب تلاش کرنا ہو تو ان جدید تخیلات اور تازہ افکار کی طرف رجوع کرنا

پڑے گا جو عام انسانوں کے ذہنی میلانات اور ان کے نقطۂ نظر کو تبدیل کرا سکے
اس ذہنی ہیجان نے انقلاب برپا کیا۔ اور پھر اس انقلاب کے بطن سے نئے قوانین۔ نیا
سیاسی اور ملکیتی نظام پیدا ہوا جس نے بالآخر حالات پیداوار کو بالکل بدل ڈالا۔۔۔۔ پس
پیدائش دولت کی نئی قوتوں نے سیاسی پابندیوں اور معاشی زنجیروں کو نہیں توڑا۔
یہ قوتیں تو ہمیشہ کی طرح جمود و سکون کی حالت میں تھیں۔ البتہ انسانی ذہن کے نئے افکار و
تصورات کی جولانی اور ان کی بے پناہ طاقت تھی جس نے فرانس کو اس کی زنجیروں اور
بیڑیوں سے رہائی دلائی۔ اور معاشی پیدائش کی نئی قوتوں کا راستہ کھول کر نئے حالات پیداوار
کی بنیاد رکھی۔"

اسی طرح مارکس اور اس کے متبعین "خاندانی زندگی کے ارتقاء کا اصلی محرک معاشی
بہبود کو قرار دیتے ہیں" لیکن حقیقت یہ ہے کہ "جو چیز خاندانی نظام کو استحکام بخشتی اور اس
کے وجود کو مؤثر بناتی ہے وہ باہمی اُلفت کی فطری کشش۔ خاندانی روایات سے وابستگی
اور وہ خلقی خصوصیات ہیں جو ایک مورث کی اولاد ہونے کی وجہ سے افراد خاندان میں مشترک
ہوتی ہیں۔ یہ تمام محرکات جو یکسر غیر معاشی ہیں خاندان کو ایک منظم ادارہ بناتے ہیں"
طبقاتی نزاع اور معاشی نظام کے اثرات کے متعلق مارکس نے بے انتہا مبالغہ کیا
ہے۔ اسی طرح جس طرح فرائیڈ نے جنسی میلات کے متعلق موجودہ زمانہ میں کیا ہے۔ اس
سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طبقاتی نزاع کو انسانی تاریخ میں اہمیت حاصل رہی ہے
لیکن تمام انسانی تاریخ کو محض اسی نزاع کی داستان قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا
نہ یہ کہنا حق ہے کہ انسانی زندگی کے ارتقا کا واحد محرک محض طبقات کی جنگ ہے۔
تاریخ پر اثر ڈالنے والے عوامل بے شمار ہیں۔ اور اگر مارکس یہ کہتا کہ ان عوامل میں سے

ایک اہم عامل معاشی کشمکش بھی ہے تو اس سے کسی عقلمند کو اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کی ہر جنگ طبقہ وار نزاع کا نتیجہ تھی۔

مولوی محمد مظہر الدین صاحب مارکس کے مادی نظریہ کے خلاف آخری چیز اس باب میں یہ پیش کرتے ہیں کہ "اگر تاریخی واقعات و حالات صرف معاشی عوامل کے نتائج سے عبارت ہیں، تو پھر انسان کی ذاتی قدر و قیمت کیا رہی؟ یقیناً یہ انسان کی عظمت کی نہیں بلکہ اس کے عجز و درماندگی کی دلیل ہے کہ وہ خود اپنے ارادہ کو خارجی واقعات پر اثر انداز نہ کر سکے۔ اور عصری میلانات کے دھارے پر بہتا چلا جائے۔ اگر انسان کا انفرادی یا اجتماعی ارادہ کوئی حقیقت رکھتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے ماحول میں آزادانہ طور پر اپنے حسبِ منشا تبدیلی نہ کر سکے؟

ہیگل اور مارکس کے فلسفہ پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد مولوی مظہر الدین صاحب نے "اسلام اور جدلی عمل" کے موضوع پر کتاب کے باب چہارم میں مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ خود انہیں کے الفاظ میں یہ ہے۔ "تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اکثر و بیشتر صورتوں میں جب کسی تصور کے اندر سے اس کا ضد یا مخالف ظاہر ہوتا ہے تو وہ اس تصور کو بالکل فنا کر دیتا ہے۔ اسی طرح ہر سیاسی معاشی اور عقلی تحریک جب ارتقا کی ایک خاص منزل پر پہنچ لیتی ہے تو اس کے بطن سے بعض مخالف قوتیں نمودار ہو کر اس تحریک کا وجود بالکل مٹا دیتی ہیں اور ایک نئی تحریک کی شکل میں ظاہر ہو کر خود اس کی جگہ لے لیتی ہیں۔ فطرت کے اسی قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (اگر اللہ تعالےٰ نے بعض انسانوں کو بعض کے ذریعہ دفع نہ کر دیا کرے تو زمین پر فساد پھیل جائے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالےٰ کسی جماعت کے غلبہ واقتدار کو ہمیشہ کے لئے بقا نہیں رکھتا۔ بلکہ ایک معین مدت کے بعد اس کے خلاف ایک

دوسری جماعت کھڑی کر دیتا ہے جو اس کے اثر و رسوخ کو مٹا کر دنیا میں اپنا غلبہ قائم کرتی ہے اگر اس عمل کے ذریعہ سے اللہ تعالے روحِ حیات کی تجدید نہ کرے اور کسی جماعت کے اشد اقتدار کو ایک غیر معین مدت تک قائم رہنے دے. خواہ اس کے اصول مسخ ہو چکے ہوں اور اس کا فلسفۂ زندگی اپنی حقیقت کھو چکا ہو تو معاشرتی زندگی کا امن و سکون رخصت ہو جائے دنیا کا اجتماع پارہ پارہ ہو جائے اور فساد فی الارض کی وہی صورت پیدا ہو جائے جس کی طرف فرمودۂ خداوندی میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم کی ایک اور آیت اس قانونِ حیات کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہے وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ۔ (اور ہر قوم کے لئے ایک معین وقت ہے - جب وہ وقت آ جاتا ہے تو نہ ایک لمحہ ادھر دیر ہو سکتی ہے۔ اور نہ ایک لمحہ اُدھر) ظاہر ہے کہ قوم کی اجل سے مراد یہ ہے کہ اُس کی سیاسی اور تمدنی برتری کا خاتمہ ہو جائے. پہلی آیت کو اس کے ساتھ ملا لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ کسی قوم کی سیاسی اور تمدنی برتری از خود زائل نہیں ہوتی بلکہ دوسری کسی قوم کے تصادم سے ایسا ہوتا ہے۔

اسلامی تمدن کے متعلق بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اضداد کی مکمل وحدت و ترکیب سے وجود میں آیا ہے۔ اس لئے کہ یہ نظام جن افکار و تصورات کے مجموعہ سے عبارت ہے ان میں سے کسی تصور پر اتنا غیر متوازن زور نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی ضد میں تبدیل ہو جائے یا اس کی نفی ہونے لگے۔ اسلام میں متقابل میلانات کے مابین ایک عجیب و غریب مصالحت پائی جاتی ہے، یہاں ہر تصور کے ساتھ اس کا مخالف موجود ہے۔ اس حد تک کہ پیام امن کے ساتھ ساتھ فتنہ و فساد مٹانے کے لئے وہ جنگ کو ناگزیر بھی قرار دیتا ہے. قتل کو حرام قرار دینے کے بعد وہ بعض

حالات میں قتل کو ضروری بھی ٹھہراتا ہے۔ عفو و درگزر کی تلقین کے ساتھ وہ انتقام کا حکم بھی دیتا ہے۔ خدا کو رحیم و کریم، ستار و غفار ہونے کے ساتھ جبار و قہار اور شدید العقاب بھی مانتا ہے۔ غرضیکہ ہیگل جس چیز کو اضداد کا امتزاج کہتا ہے۔ اسلام اس کا کمل ترین نمونہ ہے۔

مارکس نے مذہب کی مخالفت جن وجوہ کی بناء پر کی تھی ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے خیال میں (اور وہ خیال محض عیسائیت کے متعلق ہو سکتا ہے) مذہب انسانی زندگی کے دنیوی۔ مادی اور معاشی پہلوؤں کو کلیتہً نظر انداز کرتا ہے۔ اسلام کے متعلق یہ دعوے غلط ہے اس لئے کہ اسلام نے انسان کی معاشی ضروریات اور مادی مقتضیات کو پورا پورا ملحوظ رکھا ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کی بنیاد ایک مضبوط اور عادلانہ نظامِ معیشت پر رکھی ہے اور ہر وہ عملی تدبیر اختیار کی ہے۔ جس سے عوام الناس کی معاشی حالت خراب نہ ہو۔ مولوی محمد مظہر الدین صاحب نے کتاب کے چھٹے باب میں اسی اسلامی نظامِ معیشت کے اصول و مبادیات پیش کئے ہیں اور ہمارے نزدیک کتاب کا اہم ترین حصہ یہی ہے مولوی صاحب ان تمام تدابیر کو جو اسلام نے معاشی زندگی کی اصلاح اور مادی مرفہ الحالی کے حصول کی غرض سے اختیار کی ہیں دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ وہ قانونی احکام جن کا نفاذ زیادہ تر اسلامی حکومت کے قیام پر موقوف و منحصر ہے

۲۔ اخلاقی ہدایات اور معاشرتی ضوابط جو قانونی حیثیت نہیں رکھتے۔

مولوی صاحب پہلی شق کے ماتحت زکوٰۃ۔ فے۔ غنیمت اور وراثت کو شامل کرتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ اکتنازِ مال اور سود کی ممانعت کو بھی اس میں شمار کرتے ہیں اور دوسری شق کے تحت اخلاقی تعلیم و تربیت اور تمدنی ماحول کی اصلاح کو شامل کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہمیں مولوی صاحب سے ایک اختلاف ہے کہ وہ اسلام کے معاشی نظام

کا مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ عامۃ المسلمین کو کم از کم اتنی روزی میسر ہو جائے کہ وہ ننگے اور بھوکے نہ رہیں؟ ہمارے نزدیک کسی عادلانہ نظام معیشت کے لئے یہ معیار نہایت پست ہے۔ اور یقیناً اسلام نے اپنے نام لیواؤں کے لئے دنیوی زندگی کا معیار اتنا پست نہیں رکھا کہ جسم اور روح کے رشتہ کو برقرار رکھنے کے لئے اسے ننگے اور بھوکے رہنے سے بچا لیا جائے۔ اسلام اس کے برعکس معیارِ زندگی کو بلند دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ انسان کے مادی ماحول کو ایسا بنا دینا چاہتا ہے کہ انسان روحانی مدارج طے کرنے کے لئے ضروری آسائش اور یکسوئی پا سکے۔ وہ انسان جس کے لئے سورج چاند اور دوسرے قدرتی سروسامان مسخر کئے گئے۔ جسے اللہ تعالےٰ نے اپنا خلیفہ بنایا۔ جس کے لئے دنیا کی ہر نعمت پیدا کی گئی۔ کیا ایک عادلانہ نظام معیشت کا معراج یہی ہو گا کہ اس انسان کو صرف ننگے اور بھوکے رہنے سے بچا لیا جائے۔ یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تمہارے زندہ رہنے کے لئے اس کرۂ ارض پر دو وقت کی روٹی کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ بلکہ وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (خدا کی ذات وہ ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا فرما دیا۔ جو اس زمین میں ہے) خدا کے برگزیدہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے اس کی وضاحت بھی فرما دی۔ جب آپ نے یہ تاکید فرمائی کہ اگر تم میں سے کسی کے پاس غلام ہو تو وہ اسے ایسا ہی کھلائے جیسا خود کھائے اور ایسا ہی پہنائے جیسا خود پہنے اور اگر اس سے کوئی مشقت کا کام لے تو خود بھی اس میں شریک ہو۔ ظاہر ہے کہ آقا اور غلام کا معیارِ زندگی یکساں ہونے سے غلام کا معیار بلند ہو جائے گا۔ اور جب زر خرید غلاموں کا معیارِ زندگی بلند کرنا مقصود ہو تو عوام کا معیار تو بدرجہ اولیٰ بلند ہو جائیگا۔

نے اور زکوٰۃ کی بحث کے سلسلہ میں مولوی صاحب نے قرآن حکیم کی ایک آیت پیش کی ہے۔

[illegible] کے مفہوم کی طرف ہمارے [illegible] پر [illegible] کی ضرورت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۔ (جو کچھ مال لوٹا دے اللہ اپنے رسول پر بستیوں والوں سے تو وہ اللہ کے لئے ہے اور رسول کے لئے اور (رسول کے) قریبیوں کے لئے اور یتیموں کے لئے اور محتاجوں کے لئے تاکہ وہ (مال و دولت) صرف تمہارے دولت مندوں کے درمیان گردش نہ کرتی رہے)۔

آیت کے آخری الفاظ یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن یہ نہیں چاہتا کہ دولت صرف ایک طبقہ میں محدود رہے۔ لفظ دولت کے معنے ہی اس چیز کے ہیں جو گردش کرتی رہے۔ وہ دولت جو خزانوں میں بھر کر گردش سے روک دی جائے۔ وہ قرآن کے نزدیک دولت نہیں جسے خدا کا فضل اور خیر قرار دیا گیا ہے بلکہ عذاب الٰہی ہے۔ اس لئے ان لوگوں کو عذاب دردناک کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ جو سونے اور چاندی کے خزانے اسی طرح بھرتے ہیں کہ قوم اور ملک ان کی گردش کے فائدے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اسی طرح لفظ زکوٰۃ بھی معانی و مفہوم کا ایک دریا اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے زکوٰۃ روپے کا وہ حصہ ہے جو نکل جانے کے بعد بقیہ حصہ کو پاک کر دیتا ہے یعنی جب تک انسان اپنی دولت میں سے غریبوں کا حق نہ نکالے۔ اس وقت تک اس کی تمام دولت جو اس نے اپنے زور بازو سے کمائی ہے ناپاک رہتی ہے۔ اسی لئے تو قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ "اے رسولؐ ان مسلمانوں سے صدقات وصول کر اور ان کو پاک کر"۔

سُود کے مسئلہ پر مولوی صاحب کی بحث مختصر لیکن پُر از معلومات ہے اسی طرح الفاظ مال

کی ممانعت پر مولوی صاحب کی بحث بہت بصیرت افروز ہے۔ ان کا دعوٰے اور بجا دعوٰے ہے کہ قتل عمد کے بعد شاید ہی کسی بُرے عمل کے لئے قرآن نے اس قدر سخت وعید سنائی ہو جیسی کہ ان لوگوں کو سُنائی گئی ہے جو خدا کی راہ میں صرف کئے بغیر مال و دولت جمع کرتے ہیں پھر وراثت کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اپنے قوانین وراثت میں بھی اسلام نے اس امر کو بدرجۂ اتم ملحوظ رکھا ہے کہ اجتماعی دولت زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم ہوتی رہے۔

کتاب کا یہ حصہ جس میں زکوٰۃ۔ سود اور وراثت کے مسائل پر بحث کی گئی بہت مختصر ہے اور اسے پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان مسائل کا ذکر تشنۂ تکمیل رہ گیا ہے۔ اس لئے ہم قارئین کی توجہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے اس سلسلۂ مضامین کی طرف مبذول کرائیں گے جہاں "سود" کے زیرعنوان ان مسائل پر بہت سیر حاصل بحث کی گئی ہے یہ سلسلۂ مضامین کئی برس گزرے رسالہ "ترجمان القرآن" میں شائع ہوا تھا اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی انجمن خدام الدین لاہور کے پندرہ روزہ انگریزی اخبار "اسلام" میں شائع ہو چکا ہے۔

اس مرحلہ پر پہنچ کر فاضل مصنف نے اسلام اور اشتراکیت کے ایک بہت اہم فرق کو بالتفصیل نمایاں کیا۔ اور وہ یہ ہے کہ جہاں اشتراکیت انسان کی تمام اقتصادی زندگی کو قانونی حدبندی میں محدود کر کے انسان کے ارادہ اور مرضی کو معطل کر دیتی ہے۔ وہاں اسلام معاشی زندگی کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ و قانون کی طاقت کے حوالہ کر کے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس کے تصورات کی اصلاح۔ اس کی سیرت و ذہنیت کی تشکیل اور ایک مناسب اجتماعی ماحول کی تخلیق کے ذریعہ سے بالواسطہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی احساسات کا یہ آزاد عمل غلط سمت میں نہ جانے پائے اسی طرح اسلام نے دیگر تمام امور کی طرح معاشی امور میں بھی انسان کے آزاد اور با اختیار ارادہ کے

لئے ایک ایسا میدان چھوڑ دیا ہے۔ جہاں بس پر اخلاقی احساسات کے سوا قانون یا حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے تاکہ اس میدان میں اس کی اخلاقی آزمائش ہو سکے۔ اگر اشتراکیت کی طرح اسلام نے بھی جملہ معاشی امور کو قانون اور حکومت کے قبضہ میں دے دیا ہوتا تو پھر اس اخلاقی آزمائش کا کوئی موقع باقی نہ رہتا"۔

کتاب کے بقیہ تین ابواب میں "تمدنی مسائل اور الہامی ہدایات"۔ "اسلامی نظام میں قانون سازی اور فکر و رائے کی آزادی" اور "اسلامی نظریۂ مملکت" پر بحث کی گئی ہے اور ان میں سے ہر باب پوری توجہ اور انہماک سے پڑھنے کے قابل ہے۔

آخر میں کتاب کی ادبی حیثیت کے متعلق یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ معاشیات ایسے ٹھوس اور خشک مضمون پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے مولوی محمد مظہر الدین صاحب نے تحریر کا ایک شاندار ادبی معیار پیش فرمایا ہے۔ جس کا اثر یہ ہے کہ انسان کتاب کو شروع سے لے کر آخر تک کمال توجہ اور دلچسپی کے ساتھ پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے ثبوت میں ہم کتاب کے آخری الفاظ پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں تاکہ قارئین کو فاضل مصنف کے اسلوب بیان کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

> اسلام نے جو نظام مقاصد انسانی زندگی کے لئے بنایا ہے۔ وہ مقصدِ کائنات اور مقصدِ آفرینش سے ہم آہنگ ہے۔ جو اُسے تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کے لئے جد و جہد کرتا ہے۔ وہ مقصدِ کائنات اور غایتِ وجود کو پورا کرتا ہے۔ جو اس سے انکار کرتا ہے وہ ایک ایسی تحریک کا جزو بن جاتا ہے۔ جو کائنات کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہے۔ کافر کی تمام اعلیٰ صفات۔ اس کی تمام خوبیاں اور اچھائیاں ایک ایسی جماعت اور تحریک کی جڑیں مضبوط کرتی ہیں۔ جو انسان کے مقصدِ وجود اور کائنات کی اعلیٰ ترین اقدار کے منافی ہے۔

مومن کا ہر عمل غایتِ وجود اور مقصدِ کائنات کے حصول میں معاون ہوتا ہے۔ کفر انسانیت کی موت ہے۔ اسلام زندگی اور طاقت کا لازوال سرچشمہ ہے کفر نفیِ حیات ہے کیونکہ وہ زندگی کو اس کی غایات سے ہٹا کر مخالف سمت میں لے جانا چاہتا ہے۔ اسلام ان اقدار و غایات کا محافظ اور کاروانِ وجود کے سفرِ ارتقا میں انسان کا رہنما ہے کفر باطل ہے۔ اس لئے مٹ جائے گا۔ اسلام ایک دائمی اور ابدی صداقت ہے جو ہمیشہ باقی رہے گی۔

(خواجہ) عبدالوحید

شاہ ولی اللہ اور اُن کا فلسفہ

مصنفہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کاغذ و کتابت طباعت بہت عمدہ گردپوش نہایت جاذب نظر قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- سندھ ساگر اکادمی لاہور۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ الفرقان بریلی کے "ولی اللہ نمبر" کیلئے ایک طویل مضمون سپردِ قلم فرمایا تھا جو "امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف" کے نام سے اس رسالہ میں شائع ہوا۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی متعنا اللہ بطول حیاتہٖ نے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد مولانا محمد منظور ایڈیٹر رسالہ الفرقان بریلی کو بدیں الفاظ خط لکھا۔

"مولانا سندھی کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا بے شک مولانا کی نظر حضرت شاہ صاحب کے فلسفہ اور نظریات پر نہایت وسیع اور عمیق ہے"

چونکہ یہ مضمون جو رسالہ الفرقان میں شائع ہوا۔ بہت کچھ عمیق تھا اور علاوہ ازیں اس کا طرزِ بیان نہایت مغلق اور مشکل تھا اس لئے حضرت مولانا سے استدعا کی گئی کہ اس کو آسان اور عام فہم کرنے کی اجازت دی جائے چنانچہ مولانا نے خود پروفیسر محمد سرور صاحب جامعی مہتمم بیت الحکمت جامعہ نگر دہلی کو فرمایا کہ ہمارے اس مقالہ کو عام فہم زبان میں مرتب کر دو۔ چنانچہ سرور صاحب نے حکم کی تعمیل کی اور اس طرح یہ مضمون کتابی شکل میں چھپ گیا۔ حضرت مولانا عبیداللہ حکمت ولی اللّٰہی کے مسلم استاد تھے آپ شاہ صاحب کی تمام کتابیں تقریباً حفظ تھیں اور ان کے دقائق و مشکلات کو آپ پوری طرح حل کر چکے تھے۔ وہ فکر جو حضرت شاہ صاحب کے ہاں پیدا ہوا اور جس نے حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے ہاں تکمیل پائی وہ اپنی پوری جامعیت کے ساتھ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے سینہ میں محفوظ تھا اس لئے ان کی کتاب کا مطالعہ

آرڈر فارم برائے خریداری رسالہ پیغام حق

مکرمی مینجر صاحب رسالہ پیغام حق، ظفر منزل - تاج پورہ - لاہور -

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ - مجھے رسالہ پیغام حق کی خریداری منظور ہے۔ اس کا سالانہ چندہ پانچ روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں / وی۔ پی وصول کر لیجئے* اور ماہ ——————— سے رسالہ میرے نام جاری کر دیجئے۔

میرا نام و پتہ حسب ذیل ہے:-

نام ———————————

پتہ ———————————

———————————

———————————

مورخہ ———————————

* اگر منی آرڈر نہ بھیجا جائے تو اوپر کی عبارت کاٹ دیجئے۔

بخدمت مینجر صاحب رسالہ پیغام حق ۔ ظفر منزل ۔ تاج پورہ ۔ لاہور

جناب من ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ آپ کی اپیل کے پیش نظر چند حضرات کے اسمائے گرامی درج کرتا ہوں ۔ آپ ان کو رسالہ نمونہ بھجدیجیے ۔ امید ہے کہ یہ اس رسالہ کی خریداری منظور کرلیں گے ۔ والسلام

از ....

اس فارم کو یہاں سے کاٹیے

Registered No. L. 4504

منظور کردہ ... برائے گورنمنٹ سکولز صوبہ سندھ، ریاست بہاول پور و ریاست بھوپال

اکتوبر ۱۹۶۶ء — جلد ۹ — عدد ۴

ماہنامہ پیغامِ حق

اشاعت خاص

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر

مرتبہ
سیّد محمد شاہ ایم۔اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت سالانہ ... روپے — قیمت فی پرچہ ...

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

اقبال پر ایک نظر۔ چند بلند پایہ تنقیدی اور تشریحی مضامین کا مجموعہ۔ ع۸ر

شرح اسرارِ خودی۔ پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی اے - عہ۸ر

تعلیماتِ اقبال۔ " " " " - عہ۸ر

اقبال اور پیامِ حریت۔ " " " " - ۸ر

اقبال کا تصورِ زمان و مکان ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی ۱۰ر

موت و حیات اقبال کے کلام میں " " " " -۱۴ر

تعلیم کا مسئلہ۔ " " " " - عہ۸ر

اقبال کے چند جواہر ریزے۔ پروفیسر خواجہ عبد الحمید ایم اے - ۱۰ر

یادِ اقبال۔ مرتبہ چودھری غلام سرور فگار۔ عہ۸ر

حقیقتِ نفاق۔ مرتبہ مولانا صدر الدین اصلاحی۔ عہ۸ر

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ " " " - عہ۸ر

اسلام اور وطنیت۔ " " " " - عہ۸ر

معرکۂ اسلام و جاہلیت۔ " " " " - عہ۸ر

محمد عبدہٗ۔ مفتی محمد عبدہٗ مصری کے سبق آموز حالات - عہ

ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

جلد ۹	اکتوبر ۱۹۴۴ء مطابق ذی القعدہ ۱۳۶۳ھ	عدد ۴
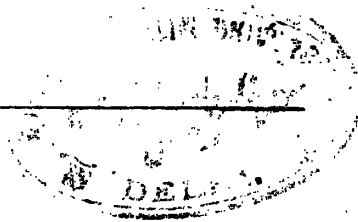
سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس بیرون اکبری دروازہ لاہور میں طبع کرا کر
دفتر رسالہ پیغام حق ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی ایڈیٹر رسالہ ترجمان القرآن و امیر جماعت اسلامی نے ۱۹۴۰ء میں جبکہ اُن کا قیام لاہور میں تھا اور راقم الحروف اُن کے ساتھ کام کر رہا تھا ایک سلسلۂ مضامین "عبادات اسلامی پر ایک تحقیقی نظر" کے نام سے ترجمان القرآن میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ مضمون کئی اقساط میں طبع ہوا۔ اور اس میں نماز اور روزہ پر ایک تحقیقی نظر ڈالی گئی۔ افسوس ہے کہ باقی عبادات پر مولانا کو لکھنے کے لئے فرصت نہ ملی۔

حضرت مولانا کے تبحر علمی، ان کی گہری بصیرت اور اسلام کو ایک بار پھر قلوب پر مسلط دیکھنے دیکھنے کی سچی آرزو جو ان کے دل میں پائی جاتی ہے، اور جو انہیں ہمیشہ بے چین رکھتی ہے اس میں اب کسی کو شک کی گنجائش نہیں رہی۔ مولانا نے اپنے زورِ قلم، جذبِ صادق اور سعی مسلسل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو حقیقی مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اسلام کو انسان کی زندگی پر پوری طرح مسلط اور کارفرما دیکھنے کے لئے بے تاب ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے قلم سے "عبادات اسلامی پر ایک تحقیقی نظر" جیسے مضامین نکل جاتے ہیں۔

ضرورت تھی اس امر کی کہ ہم نے عبادت کا جو غلط تصور اپنے ذہنوں میں جما رکھا ہے اُس کو دور کر کے اس کی جگہ عبادت کا صحیح تصور اور اصلی مفہوم پیدا کریں اور سمجھیں۔ ہماری نمازیں بے اثر کیوں ہیں، آج قرآن کا یہ دعویٰ کیوں پورا نہیں ہوتا کہ "نماز انسان کو فواحش و منکرات سے کھینچ لیتی ہے"

ہم نمازیں پڑھتے ہیں اور اس کے باوجود تمام برائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ اس مضمون کا مطالعہ آپ کو اس کی وجہ بتائیگا۔ اور آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم لوگ نماز کا تصور ہی غلط سمجھے ہوئے ہیں۔ لہذا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری نماز نماز ہی نہیں ہوتی اور چونکہ وہ نماز نہیں ہے اس لئے اس سے وہ اثر مترتب نہیں ہوتا جو نماز سے ہونا چاہیئے۔

خداوند کریم نے ہمیں نماز ادا کرنے، روزے رکھنے، زکوٰۃ دینے اور حج کرنے کے لئے جو حکم دیا ہے وہ بے فائدہ اور لاحاصل نہ تھا۔ ان اعمال کے کرنے سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی بہتری مقصود تھی مگر آج یہ اعمال نہ ہماری انفرادی اصلاح کر رہے ہیں اور نہ ان سے ہمیں اجتماعی فوائد حاصل ہو رہے ہیں آپ جانتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے۔ مولانا مودودی مدظلہ سے سنیئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان عبادات کی جو غرض وغایت آپ نے سمجھی ہے اور ان کو ادا کرنے کا جو طریق آپ نے اختیار کر رکھا ہے اس نے ان عبادات کو عبادات ہی نہیں رہنے دیا۔ بلکہ یہ ایک رسم سی بن کر رہ گئی ہیں یہ تمہارے میکانکی افعال ہیں جو تمہارے قلوب کی تطہیر اور تمہارے اذہان کی جلا سے قاصر ہیں یہ وجہ ہے کہ تم ان عبادات سے کما حقہ فائدہ نہیں اُٹھا رہے۔

اس کے علاوہ حضرت مولانا نے ان عبادات کی ضرورت و اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ آخر نمازیں کیوں پڑھی جائیں اور روزے کیوں رکھے جائیں اور دیگر عبادات کیوں کی جائیں۔

الغرض یہ مضمون میرے نزدیک اس قدر مفید اور ضروری ہے کہ اس کی اشاعت کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھنا چاہیئے۔ میرا ارادہ تھا کہ ادارۂ ترجمان القرآن کی طرف سے اس کو شائع کرکے بکثرت پھیلا دوں مگر جب مولانا نے مجھے ادارہ سے علیحدہ کر دیا تو یہ چیز میرے بس کی نہ رہی۔ میرا خیال تھا کہ ادارے کے نئے کارکن اس طرف توجہ کریں گے مگر معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو اس

مضمون کی ضرورت و اہمیت کا صحیح احساس نہیں ہوا۔

ترجمان القرآن کے سابقہ پرچوں کا فائل بھی دفتر میں مکمل نہیں ہے اکثر پرچے ختم ہو چکے ہیں۔ لہٰذا جن حضرات کو اس مضمون کا علم بعد میں ہوا وہ بھی اب کسی طرح اس کو حاصل کر کے فائدہ نہ اُٹھا سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب اسے اقبال اکیڈیمی کی طرف سے رسالہ پیغام حق میں طبع کر رہا ہوں۔ ترجمان القرآن میں جس قدر اقساط طبع ہوئی تھیں وہ سب اس میں آگئی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ پیغام حق کے خریداروں کو چاہئے کہ یہ مضمون اپنے محلّہ کی مسجد کے امام صاحب کو سنائیں، اور اپنے اپنے احاطۂ واقفیت میں ایک ایک صاحب کو خود سُنائیں۔ بہتر یہ ہو کہ اپنے اپنے شہر کی مساجد کے خطیبوں سے درخواست کی جائے کہ وہ ایک دو جمعوں میں خطبہ کے بجائے یہی مضمون سنائیں دیکھئے جب تک ہم لوگ دین کے غلبہ کے لئے ایک دوسرے سے تعاون نہیں کریں گے۔ اپنی زبان، اپنے ہاتھ پاؤں، اور اپنے مال و دولت سے اسلام کے غلبہ اور اشاعت کے لئے کوشش نہیں کریں گے اور کفر کے مقابلہ پر بالفاظِ قرآن "بنیانٌ مرصوص" یعنی سکّہ پلائی ہوئی دیوار بن کر نہیں کھڑے ہوں گے تب تک کفر و جاہلیت کے مقابلہ پر اسلام کا فروغ اور مسلمانوں کا عروج قطعاً ناممکن ہے دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہمیں اپنے دین کی خدمت کرنے کا موقع دے، آمین۔

یہ مضمون علیحدہ کتابی شکل میں بھی طبع کر دیا گیا ہے تاکہ ضرورت مند حضرات اسے حاصل کر سکیں

مولانا نے ایک اور بڑا معرکۃ الآرا مضمون "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" لکھا تھا۔ نومبر ۱۹۵۴ء کے پرچہ میں وہ مضمون مکمل طور پر پیغام حق میں طبع ہوگا۔ جن حضرات کو زائد کاپیوں کی ضرورت ہو وہ دفتر کو ابھی سے مطلع کریں۔

عبادات اسلامی پر ایک تحقیقی نظر

عبادت کا جاہلی تصور | اسلام میں عبادت کا مفہوم محض پوجا کا نہیں ہے۔ بلکہ بندگی کا ہے۔ عبادت کو محض پوجا کے معنی میں لینا دراصل جاہلیت کا تصور ہے۔ جاہل لوگ اپنے معبود کو انسانوں پر قیاس کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بڑے آدمی، سردار یا بادشاہ، خوشامد سے خوش ہوتے ہیں، نذرانے پیش کرنے سے مہربان ہو جاتے ہیں، ذلت و عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑنے اور سر جھکانے سے پسیج جاتے ہیں، اور اُن سے یُونہی کام نکالا جا سکتا ہے اسی طرح اُن کا معبود بھی انسان سے خوشامد، نذر و نیاز اور اظہار عاجزی کا طالب ہے، انہی تدبیروں سے اس کو اپنے حال پر مہربان کیا جا سکتا ہے اور اس کو خوش کر کے کام نکالا جا سکتا ہے۔ اس تصور کی بنا پر جاہلی مذاہب چند مخصوص اوقات میں مخصوص مراسم ادا کرنے کو عبادت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

عبادت کا جوگیانہ تصور | اسی طرح اسلام میں عبادت کا مفہوم یہ بھی نہیں ہے کہ آدمی دنیا کی زندگی سے الگ ہو کر خدا سے لو لگائے، مراقبہ، نفس کشی اور مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے اپنی اندرونی قوتوں کو نشو و نما دے، کشف و کرامت کی قوتیں اپنے اندر پیدا کرے اور دُنیوی زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کر کے اخروی نجات حاصل کرلے۔ عبادت کا یہ تصور اُن مذاہب میں پایا جاتا ہے جن کی بُنیاد زندگی کے راہبانہ تصور پر ہے۔ جو اس دنیا کو انسان کے لئے قیدخانہ اور جسم کو روح کے لئے قفس سمجھتے ہیں جن کے نزدیک دینداری اور دنیاداری ایک دوسرے کی ضد ہیں جو دنیا کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے تعلقات سے باہر نجات کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ جن کے نزدیک

روحانی ترقی کے لئے مادّی الحاظ یا مادیات سے بے تعلقی ناگزیر ہے۔

عبادت کا اسلامی تصور | اسلام کا تصور ان دونوں سے مختلف ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انسان خدائے واحد کا بندہ ہے۔ اس کا خالق، اس کا رازق، اس کا مالک، اس کا حاکم صرف خداوند عالم ہے۔ خدا نے اس زمین پر اس کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے مامور کیا ہے یہاں کچھ اختیارات اس کو عطا کئے ہیں کچھ ذمہ داریاں اور کچھ خدمتیں اس کے سپرد کی ہیں۔ اپنی مملکت اور اپنی رعیت کے ایک حصہ پر اس کو کچھ اقتدار دیا ہے اس کا کام یہاں اپنے مالک کے مقصد کو پورا کرنا ہے جس قدر زیادہ سرگرمی و جانفشانی کے ساتھ وہ زمین کی زندگی میں اپنی ذمہ داریوں اور اپنی متعلقہ خدمات کو بجالائیگا۔ اور جتنی زیادہ وفاداری اور فرمانبرداری کے ساتھ اپنے اختیارات کے استعمال میں مالک کے قانون کی پیروی کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ کامیاب ہوگا۔ اس کی آئندہ ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ زمین میں اپنی ماموریت کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ مالک کے سامنے حساب کے لئے پیش ہو تو اس کے کارنامۂ زندگی سے یہ ثابت ہو کہ وہ ایک فرض شناس اور مطیع و فرمانبردار بندہ تھا، نہ یہ کہ سست، کام چور، نا فرض شناس تھا، یا یہ کہ باغی و نافرمان تھا۔

اس نقطۂ نظر سے عبادت کے وہ دونوں تصور جو ابتدا میں بیان کئے گئے ہیں غلط اور قطعی غلط ہیں۔ جو شخص اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کو پوجنے کے لئے الگ کرتا ہے۔ اور اس تھوڑے سے وقت میں عبادت کے چند مخصوص مراسم ادا کر دینے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کا حق ادا کر دیا ہے۔ اب میں آزاد ہوں کہ اپنی زندگی کے معاملات کو جس طرح چاہوں انجام دوں، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ملازم جسے آپ نے رات دن کے لئے نوکر رکھا ہو، اور جسے پوری تنخواہ دے کر آپ پرورش کر رہے ہوں، وہ بس صبح شام آ کر آپ کو جھک جھک کر سلام کر لیا کرے اور اس کے بعد آزادی کے ساتھ جہاں چاہے کھیلتا پھرے یا جس جس کی چاہے نوکری بجالائے۔ اسی طرح جو شخص دنیا

اور اس کے معاملات سے الگ ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھتا ہے اور اپنا سارا وقت نمازیں پڑھنے، روزے رکھنے، قرآن پڑھنے اور تسبیح پھرانے میں صرف کر دیتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے آپ اپنے باغ کی رکھوالی کے لئے مقرر کریں، مگر وہ باغ کو اور اس کے کام کاج کو چھوڑ کر آپ کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک آقا آقا پکارتا رہے، اور باغبانی کے متعلق جو ہدایات آپ نے اسے دی ہیں ان کو نہایت خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ بس پڑھتا ہی رہے۔ ان کے مطابق باغ کی اصلاح و ترقی کے لئے کام ذرا نہ کرکے دے۔ ایسے ملازموں کے متعلق جو کچھ رائے آپ قائم کریں گے وہی رائے اسلام کی بھی ایسے عبادت گزاروں کے متعلق ہے، اور جو برتاؤ اس قسم کے ملازموں کے ساتھ آپ کریں گے وہی برتاؤ ان غلط تصورات کے تحت عبادت کرنے والوں کے ساتھ خدا بھی کریگا۔

اسلام کا تصورِ عبادت یہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی خدا کی بندگی میں بسر ہو۔ آپ اپنے آپ کو دائمی اور ہمہ وقتی ملازم سمجھیں۔ آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو اس دنیا میں آپ جو کچھ بھی کریں خُدا کی شریعت کے مطابق کریں۔ آپ کا سونا اور جاگنا، آپ کا چلنا اور پھرنا، غرض سب کچھ خدا کے قانونِ شرعی[1] کی پابندی میں ہو۔ خدا نے جن تعلقات میں آپ کو باندھا ہے۔ اُن سب میں آپ بندھیں

[1] موجودہ زمانہ میں ایک صاحب نے قانونِ شرعی اور قانونِ طبیعی کے فرق کو نظر انداز کرکے گمراہیوں کا ایک عظیم الشان فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک عبادت الٰہی محض قانونِ طبیعی کی پیروی کا نام ہے، قطع نظر اس کے کہ قانونِ شرعی کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر وہ اُن قوموں کو بھی خدا کا عبادت گزار اور خلیفۂ الٰہی اور صالح و مومن قرار دیتے ہیں جو قانونِ طبیعی کے ماتحت تنظیم اور سائنٹیفک ایجادات کے ذریعے طاقت بہم پہنچا لیں۔ اگرچہ اس طاقت سے کام لینے میں خُدا کے قانونِ شرعی کے پابند نہ ہوں۔ یہ ایسی زبردست غلطی ہے جس نے کفر کو عین اسلام، بغاوت کو عین عبادت اور معصیت کو عین طاعت بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور اسلام کے مشن کی اصلی روح ہی کو مسخ کر ڈالا ہے۔ ان صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے آنے کا تو بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ آدمی کو قانونِ طبیعی قانونِ شرعی کے تحت کام لینے کی تعلیم دے۔ اگر انسان محض قانونِ طبیعی کی اطاعت کرنے کے لئے ہوتا تو اس چیز کی تعلیم دینے کے لئے کسی نبی اور کسی کتاب کے آنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے لئے تو حیوانی جبلت ہی کافی تھی۔ اگر آدمی کا کام محض قانونِ طبیعی پر عمل کرنا ہی ہو تو اس میں اور جانوروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جس طرح بھیڑیا بکری کو پھاڑ کھاتا ہے۔ تو یہ اس کے لئے بھی قانونِ طبیعی ہے۔ ایک قوم اگر دوسری قوم سے زیادہ ہوائی جہاز اور بم بنا سکتی ہے۔ اور اس طاقت سے کام لے کر اسے اپنا بندہ بنا لیتی ہے تو یہ بھی اس کے لئے قانونِ طبیعی ہے۔ یہ نظریہ انسان کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر درندوں اور موذی جانوروں کے مرتبہ میں پہنچا دیتا ہے۔ اور اسلام اس سے ہزاروں کوس دور ہے کہ انسان کی اس حیوانیت کو خدا کی عبادت قرار دے۔

اور اُن کو اُس طریقے سے جوڑیں یا توڑیں۔ جس طریقے سے خدا نے اُنہیں جوڑنے یا توڑنے کا حکم دیا ہے۔ خُدا نے جو خدمات آپ کے سپرد کی ہیں اور دنیوی زندگی میں جو فرائض آپ سے متعلق کئے ہیں ان سب کا بار آپ نفس کی پُوری رضامندی کے ساتھ سنبھالیں اور ان کو اس طریقے سے ادا کریں جس کی طرف خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے آپ کی رہنمائی کی ہے۔ آپ ہر وقت ہر کام میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور یہ سمجھیں کہ آپ کو اپنی ایک ایک حرکت کا حساب دینا ہے۔ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ اپنے محلہ میں ہمسایوں کے ساتھ، اپنی سوسائٹی میں دوستوں کے ساتھ، اور اپنے کاروبار میں اہل معاملہ کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ایک ایک بات اور ایک ایک کام میں خدا کی مقرر کردہ حدود کا آپ کو خیال رہے جب آپ رات کے اندھیرے میں ہوں اور کوئی نافرمانی اس طرح کر سکتے ہوں کہ کوئی آپ کو دیکھنے والا نہ ہو اُس وقت بھی آپ کو یہ خیال رہے کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ جب آپ جنگل میں جا رہے ہوں اور وہاں کوئی جرم اس طرح کر سکتے ہوں کہ کسی پکڑنے والے اور کسی گواہی دینے والے کا کھٹکا نہ ہو اُس وقت بھی آپ خُدا کو یاد کر کے ڈر جائیں اور جرم سے باز رہیں جب آپ جھوٹ، بے ایمانی اور ظلم سے بہت سا فائدہ حاصل کر سکتے ہوں اور کوئی آپ کو روکنے والا نہ ہو، اس وقت بھی آپ خُدا سے ڈریں اور اس فائدے کو اس لئے چھوڑ دیں کہ خدا اس سے ناراض ہوگا۔ اور جب سچائی اور ایمانداری میں سراسر آپ کو نقصان پہنچتا ہو اُس وقت بھی آپ نقصان اُٹھانا قبول کرلیں۔ صرف اس لئے کہ خدا اس سے خوش ہوگا۔

پس دنیا کو چھوڑ کر کونوں اور گوشوں میں جا بیٹھنا اور اللہ اللہ کرنا عبادت نہیں ہے بلکہ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر اور دنیوی زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھال کر خدا کے قانون کی پابندی کرنا عبادت ہے۔ ذکر الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان پر اللہ اللہ جاری ہو بلکہ اصلی ذکر الٰہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے غافل کرنے والی ہیں ان میں پھنسو اور پھر خدا سے غافل نہ ہو۔ دنیا کی زندگی میں جہاں قانون الٰہی کو توڑنے کے بے شمار مواقع، بڑے بڑے فائدوں کا لالچ اور بڑے بڑے نقصانوں کا خوف

لئے ہوئے سامنے آتے ہیں وہاں خدا کو یاد کرو اور اس کے قانون کی پیروی پر قائم رہو۔ حکومت کی کرسی پر بیٹھو اور وہاں یاد رکھو کہ میں بندوں کا خدا نہیں ہوں بلکہ خدا کا بندہ ہوں۔ عدالت کے منصب پر متمکن ہو اور وہاں ظلم پر قادر ہونے کے باوجود خیال رکھو کہ خدا کی طرف سے میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں زمین کے خزانوں پر قابض و متصرف ہو اور پھر یاد رکھو کہ میں ان خزانوں کا مالک نہیں بلکہ امین ہوں اور پائی پائی کا حساب مجھے اصلی مالک کو دینا ہے۔ فوجوں کے کمانڈر بنو اور پھر خوفِ خدا تمہیں طاقت کے نشے میں مدہوش ہونے سے بچاتا رہے۔ سیاست و جہانبانی کا کٹھن کام ہاتھ میں لو۔ اور پھر سچائی، انصاف اور حق پسندی کے مستقل اصولوں پر عمل کر کے دکھاؤ۔ تجارت اور مالیات اور صنعت کی بھاگیں سنبھالو۔ اور پھر کامیابی کے ذرائع میں پاک اور ناپاک کا امتیاز کرتے ہوئے چلو۔ ایک ایک قدم پر حرام تمہارے سامنے ہزار خوبصورتیوں کے ساتھ آئے اور پھر تمہاری رفتار میں لغزش نہ آنے پائے۔ ہر طرف ظلم اور جھوٹ اور دغا اور فریب اور بدکاری کے راستے تمہارے سامنے کھلے ہوئے ہوں اور دنیوی کامیابیاں اور مادی لذتیں ہر راستے کے سرے پر جگمگاتے ہوئے تاج پہنے کھڑی نظر آئیں اور پھر خدا کی یاد اور آخرت کی بازپرس کا خوف تمہارے لئے بند پا بن جائے۔ حدود اللہ میں سے ایک ایک حد کے قائم کرنے میں ہزاروں مشکلیں دکھائی دیں، حق کا دامن تھامنے اور عدل و صداقت پر قائم رہنے میں جان و مال کا زیاں نظر آئے اور خدا کے قانون کی پیروی کرنا زمین و آسمان کو دشمن بنا لینے کا ہم معنی ہو جائے، پھر بھی تمہارا ارادہ متزلزل نہ ہو اور تمہاری جبینِ عزم پر شکن تک نہ آنے پائے۔ یہ ہے اصلی عبادت اس کا نام ہے یادِ خدا۔ اسی کو ذکرِ الٰہی کہتے ہیں اور یہی وہ ذکر ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ فرمایا گیا ہے

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

روحانی ارتقاء اور خدا کی یافت کا راستہ | اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا بھی یہی راستہ بتایا ہے

انسان خدا کو جنگلوں اور پہاڑوں میں یا عزلت کے گوشوں میں نہیں پا سکتا۔ خدا اس کو انسانوں کے درمیان دنیوی زندگی کے ہنگامۂ کارزار میں ملیگا۔ اور اس قدر قریب ملیگا کہ گویا وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جس کے سامنے حرام کے فائدے ظلم کے مواقع اور بدکاری کے راستے قدم قدم پر آئے اور ہر قدم پر وہ خدا سے ڈر کر اُن سے بچتا ہوا چلا اُسے خدا کی یافت ہوگئی۔ ہر قدم پر وہ اپنے خدا کو پاتا رہا بلکہ آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ نہ پاتا اور نہ دیکھتا تو اس دشوار گذار گھاٹی سے بخیریت کیونکر گذر سکتا تھا؟ جس نے گھر میں، بازار میں، تفریح کے لمحوں میں اور کاروبار کے ہنگاموں میں ہر کام اس احساس کے ساتھ کیا کہ خدا مجھ سے دور نہیں ہے۔ اس نے خدا کو ہر لحہ اپنے سے قریب، اور بہت قریب پایا جس نے سیاست اور حکومت اور جنگ اور مالیات اور صنعت و تجارت جیسے ایمان کی سخت آزمائش کرنے والے کام کئے اور یہاں کامیابی کے شیطانی ذرائع سے بچ کر خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود کا پابند رہا اُس سے بڑھ کر مضبوط اور سچا ایمان اور کس کا ہو سکتا ہے؟ اُس سے زیادہ خدا کی معرفت اور کسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اگر وہ خدا کا ولی اور مقرب بندہ نہ ہوگا تو اور کون ہوگا؟

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی روحانی قوتوں کے نشوونما کا راستہ یہی ہے۔ روحانی ارتقاء اس کا نام نہیں ہے کہ آپ پہلوان کی طرح ورزشیں کرکے اپنی قوت ارادی کو بڑھالیں اور اس کے زور سے کشف و کرامت کے شعبدے دکھانے لگیں۔ بلکہ روحانی ارتقاء اس کا نام ہے کہ آپ اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پائیں، اپنے ذہن اور جسم کی تمام طاقتوں سے صحیح کام لیں، اور اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونے کی کوشش کریں۔ دنیوی زندگی میں جہاں قدم قدم پر آزمائش کے مواقع پیش آتے ہیں، اگر آپ حیوانی اور شیطانی طریق کار سے بچتے ہوئے چلیں اور پورے شعور اور صحیح تمیز کے ساتھ اُس طریقہ پر ثابت قدم رہیں جو انسان کے شایان شان ہے تو آپ کی انسانیت یوماً فیوماً ترقی کرتی چلی جائیگی۔ اور آپ روز بروز خدا سے قریب ہوتے جائیں گے اس کے سوا روحانی ترقی اور

کسی چیز کا نام نہیں۔

اسلام میں مراسم عبادت کی کیا حیثیت ہے | یہ خلاصہ ہے اسلامی تصورِ عبادت کا۔ اسلام انسان کی پوری دنیوی زندگی کو عبادت میں تبدیل کردینا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی یہ بات لازم آجاتی ہے کہ جس اللہ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے، اُس کا عبد یعنی بندہ بن کر رہے، اور بندہ بن کر رہنے ہی کا نام عبادت ہے کہنے کو تو یہ بہت چھوٹی سی بات ہے۔ اور بڑی آسانی کے ساتھ اسے زبان سے ادا کر دیا جاسکتا ہے مگر عملاً آدمی کی ساری زندگی کا اپنے تمام گوشوں کے ساتھ عبادت بن جانا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے بڑی زبردست ٹریننگ کی ضرورت ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے۔ مضبوط کیرکٹر پیدا کیا جائے۔ عادات اور خصائل کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا جائے۔ اور صرف انفرادی سیرت ہی کی تعمیر پر اکتفا نہ کرلیا جائے۔ بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو بڑے پیمانے پر افراد کو اس عبادت کے لئے تیار کرنے والا ہو، اور جس میں جماعت کی طاقت فرد کی پُشت پناہ، اس کی مددگار اور اس کی کمزوریوں کی تلافی کرنے والی ہو۔ یہی غرض ہے جس کے لئے اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ ان کو عبادت کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس یہی عبادت ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُس اصلی عبادت کے لئے آدمی کو تیار کرتی ہیں یہ اُس کے لئے لازمی ٹریننگ کورس ہیں۔ انہی سے وہ مخصوص ذہنیت بنتی ہے۔ اُس خاص کیرکٹر کی تشکیل ہوتی ہے، منظم عادات و خصائل کا وہ پختہ سانچہ بنتا ہے اور اس اجتماعی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادتِ الٰہی میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔ ان چار چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہوسکے۔ اسی بنا پر ان کو ارکانِ اسلام قرار دیا گیا ہے، یعنی یہ وہ ستون ہیں۔ جن پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی اور قائم رہتی ہے۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک رکن اسلامی زندگی کی عمارت کو کس طرح قائم کرتا ہے اور کس طرح انسان کو اُس بڑی عبادت کے لئے تیار کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

۱۔ نماز

یاددہانی | انسان کی زندگی کو عبادت میں تبدیل کرنے کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں اس بات کا شعور ہر وقت تازہ، ہر وقت زندہ اور ہر وقت کارفرما ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور اسے دنیا میں سب کچھ بندہ ہونے کی حیثیت ہی سے کرنا ہے اس شعور کو بار بار ابھارنے اور تازہ کرنے کی ضرورت اس لئے لاحق ہوتی ہے کہ انسان درحقیقت جس کا بندہ ہے وہ تو اس کی آنکھوں سے اوجھل اور اس کے حواس سے دور ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک شیطان خود آدمی کے اپنے نفس میں موجود ہے جو ہر وقت کہتا رہتا ہے کہ تو میرا بندہ ہے اور لاکھوں کروڑوں شیطان ہر طرف دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک دعویٰ کر رہا ہے کہ تو میرا بندہ ہے۔ یہ شیاطین آدمی کو محسوس ہوتے ہیں، نظر آتے ہیں اور ہر آن نت نئے طریقوں سے اپنی طاقت اس کو محسوس کراتے رہتے ہیں۔ ان دوگونہ اسباب سے یہ شعور کہ میں خدا کا بندہ ہوں اور اس کے سوا مجھے کسی کی بندگی نہیں کرنی ہے، آدمی کے ذہن سے گم ہو جاتا ہے۔ اس کو زندہ اور کارفرما رکھنے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان خدا کی خدائی کا زبان سے اقرار کر لے، یا محض ایک علمی فارمولا کی حیثیت سے اس کو سمجھ لے، بلکہ اس کے لئے قطعاً ناگزیر ہے کہ اسے بار بار ابھارا اور تازہ کیا جاتے ——

یہی کام نماز کرتی ہے صبح اٹھتے ہی سب کاموں سے پہلے وہ آپ کو یہی بات یاد دلاتی ہے۔ پھر جب آپ دن کو اپنے کام کاج میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ ہنگامۂ سعی و عمل کے دوران میں دو دفعہ آپ کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے الگ کھینچ بلاتی ہے تاکہ احساس بندگی کا نقش اگر دھندلا ہو گیا ہو تو اسے تازہ کر دے پھر شام کو جب تفریحوں اور دلچسپیوں کا وقت آتا ہے تو پھر یہ آپ کو آگاہ کرتی ہے کہ تم خدا کے بندے ہو، شیطان نفس کے بندے نہیں ہو۔ اس کے بعد رات آتی ہے، وہ رات جب اندر کا شیطان

اور باہر کے شیاطین، سب مل کر معصیتوں سے سیلہ کر دینے کے لئے دن بھر منتظر رہتے ہیں۔ نماز پھر سامنے آ کر آپ کو خبردار کرتی ہے کہ تمہارا کام خدا کی بندگی کرنا ہے نہ کہ ان شیاطین کی۔

یہ نماز کا پہلا فائدہ ہے اسی بنا پر اسے قرآن میں ذِکر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ اگر نماز میں اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تب بھی صرف یہی ایک صفت اس کو رکن اسلام قرار دینے کے لئے کافی تھی، کیونکہ اس فائدے کی اہمیت پر جتنا زیادہ غور کیا جائے۔ اتنا ہی زیادہ اس امر کا یقین حاصل ہوتا ہے کہ آدمی کا عملاً بندۂ خدا بن کر رہنا اس یاد دہانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

<u>فرض شناسی</u> | پھر چونکہ آپ کو اس زندگی میں ہر قدم پر خدا کے احکام بجالاتے ہیں، خدا کی سپرد کی ہوئی خدمات اُس کے مقرر کئے ہوئے حدود کی نگہداشت کے ساتھ انجام دینی ہیں، اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ میں فرض شناسی پیدا ہو، اور فرض کو مستعدی و فرمانبرداری کے ساتھ انجام دینے کی عادت آپ کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ جو شخص یہ جانتا ہی نہ ہو کہ فرض کیا بلا ہوتی ہے اور اس کا فرض ہونا کیا معنی رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ کبھی ادائے فرض کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جو شخص فرض کے معنی تو جانتا ہو مگر اس کی تربیت اتنی خراب ہو کہ فرض کو فرض جاننے کے باوجود وہ اسے ادا کرنے کی پروا نہ کرے، اس کے کیرکٹر پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اور نہ وہ کسی عملی خدمت کا اہل ہو سکتا ہے۔ پس یہ بالکل ناگزیر ہے کہ جن لوگوں کو کسی ذمہ دارانہ خدمت پر مامور کیا جائے ان کے لئے فرض شناسی اور اطاعت امر کی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے۔ اس کا فائدہ صرف یہی نہیں ہے کہ کام کے آدمی تیار ہوتے رہتے ہیں، بلکہ اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ روزانہ کار آمد آدمیوں اور ناکارہ آدمیوں کے درمیان تمیز ہوتی رہتی ہے۔ روز یہ فرق کھلتا رہتا ہے کہ جو لوگ خدمت کے اُمیدوار ہیں اُن میں کون قابلِ اعتماد ہے اور کون نہیں ہے تمام عملی خدمات کے لئے یہ قطعاً ضروری ہے کہ ہمیشہ

بالالتزام عملی آزمائش کی کسوٹی پر آدمیوں کو پرکھا جاتا رہے تاکہ ناقابلِ اعتماد آدمی ملازمت میں گھسنے پائیں۔
فوج کو دیکھئے۔ کن کن طریقوں سے وہاں ڈیوٹی کو سمجھنے اور اسے ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے
رات دن میں کئی کئی بار بگل بجایا جاتا ہے۔ سپاہیوں کو ایک جگہ حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔
ان سے قواعد کرائی جاتی ہے۔ یہ سب کس لئے ہے؟ اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ سپاہیوں
کو حکم بجالانے کی عادت ہو۔ ان میں فرض شناسی کا مادہ پیدا ہو۔ ان میں ایک نظام اور ترتیب
کے ساتھ کام کرنے کی خصلت پیدا ہو۔ اور اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ روزانہ سپاہیوں کی آزمائش
کی جاتی رہے روز یہ فرق کھلتا رہے کہ جو لوگ فوج میں بھرتی ہوتے ہیں اُن میں سے کون کام کے
آدمی ہیں اور کون ناکارہ ہیں۔ جو سست اور نالائق لوگ بگل کی آواز سُن کر گھر بیٹھے رہیں یا قواعد
میں حکم کے مطابق حرکت نہ کریں انہیں پہلے ہی فوج سے نکال باہر کیا جاتا ہے کیونکہ ان پر یہ بھروسہ
نہیں کیا جاسکتا کہ جب کام کا وقت آئے گا تو وہ فرض کی پکار پر لبیک کہینگے۔

دنیوی فوجوں کے لئے تو کام کا وقت برسوں میں کبھی آتا ہے، اور اس کے لئے یہ اہتمام ہے
کہ روزانہ سپاہیوں کی تربیت اور ان کی آزمائش کی جاتی ہے۔ مگر اسلام جو فوج بھرتی کرتا ہے اس
کے لئے ہر وقت کام کا ہے۔ وہ ہر وقت برسرِ کار ہے۔ اس کے لئے ہر وقت معرکۂ کارزار گرم
ہے۔ اسے زندگی میں ہر آن ہر لمحہ فرائض ادا کرنے ہیں، خدمات بجالانی ہیں، شیطانی قوتوں سے
لڑنا ہے، حدود اللہ کی حفاظت کرنی ہے، اور احکام شاہی کو نافذ کرنا ہے اسلام محض ایک اعتقادی
مسلک نہیں ہے بلکہ عملی خدمت ہے، اور عملی خدمت بھی ایسی جس میں رخصت، تعطیل، آرام کا
کوئی وقت نہیں۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے پیہم اور مسلسل خدمت ہی خدمت ہے۔ اب فوج
کی مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیجیے کہ ایسی سخت عملی خدمت کے لئے کتنے سخت ڈسپلن کیسی
زبردست تربیت اور کتنی شدید آزمائش کی ضرورت ہے۔ محض عقیدہ کا زبانی اقرار اس کے

لئے کیونکر کافی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اس فوج میں رکھ لیا جائے جس کو اتنی اہم خدمت انجام دینی ہو عقیدہ کا اقرار تو صرف اس ملازمت میں داخل ہونے کے لئے امیدواری کا اعلان ہے۔ اس اعلان کے بعد یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اسے ڈسپلن کے شکنجہ میں کسا جائے۔ اس ڈسپلن میں رہ کر ہی وہ اسلام کے کام کا بن سکتا ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو اس شکنجہ کی گرفت میں دینے پر تیار نہیں، اگر وہ فرض کی پکار پر نہیں آتا، اگر وہ احکام کی اطاعت کے لئے کوئی مستعدی اپنے اندر نہیں رکھتا تو وہ اسلام کے لئے قطعی ناکارہ ہے۔ خدا کو اور اس کے دین کو ایسے فضول آدمی کی کوئی حاجت نہیں۔

یہی دوگونہ اغراض ہیں جن کے لئے نماز رات دن میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے یہ روزانہ پانچ بار بگل بجاتی ہے تاکہ اللہ کے سپاہی اس کو سن کر ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں۔ اور ثابت کریں کہ وہ فرض کو پہچانتے ہیں، اللہ کے وفادار ہیں، اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں، اور اس کے احکام بجا لانے کے لئے مستعد ہیں۔ اس طریقہ سے ایک طرف سپاہیوں کی تربیت ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف مومن اور منافق کا فرق کھلتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس آواز پر پابندی کے ساتھ آتے ہیں اور ضابطہ کے مطابق حرکت کرتے ہیں ان میں فرض شناسی، مستعدی، انضباط اور اطاعت امر کا مادہ نشوونما پاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اس آواز کو سن کر اپنی جگہ سے نہیں ہلتے وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ یا تو وہ فرض کو پہچانتے نہیں، یا پہچانتے ہیں تو اسے ادا کرنے کے لئے مستعد نہیں ہیں۔ یا تو وہ اس اقتدار ہی کو تسلیم نہیں کرتے جس نے اسے فرض قرار دیا ہے۔ یا پھر ان کی ذہنی حالت اتنی ناقص ہے کہ جسے اپنا الٰہ اور رب مانتے ہیں اس کے پہلے اور اہم ترین حکم کو بھی بجا لانے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اگر ایمان رکھتے بھی ہیں تو صادق الایمان نہیں ہیں۔ ان میں یہ صفت اور صلاحیت موجود نہیں ہے کہ جس چیز کو حق جانیں اس کے مطابق عمل کرنے کی زحمت بھی اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ پہلی صورت میں وہ مسلمان نہیں

ہیں اور دوسری صورت میں وہ اتنے نالائق اور ناکارہ ہیں کہ اسلامی جماعت میں رہنے کے قابل نہیں اسی بنا پر قرآن میں نماز کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ یعنی جو لوگ خدا کی اطاعت و بندگی کے لئے تیار نہیں ہیں صرف انہی پر نماز گراں گزرتی ہے۔ بالفاظ دیگر جس پر نماز گراں گزرے وہ خود اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی و اطاعت کے لئے تیار نہیں ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ "اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کریں اور نماز کے پابند ہوں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں"۔ یعنی نماز کے بغیر آدمی اسلام کی دینی برادری میں شامل ہی نہیں ہو سکتا اسی بنا پر قرآن کے بارے میں فرمایا کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ "یہ کتاب صرف ان پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے جو ان دیکھی حقیقت پر ایمان لائیں اور نماز کے پابند ہوں اور جو رزق ہم نے دیا ہے اس میں سے راہِ خدا میں دیں"۔ اسی بنا پر منافقین کی یہ صفت بیان کی گئی کہ اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلٰوتِھِمْ سَاھُوْنَ، یعنی وہ اپنی نمازوں سے غافل ہوتے ہیں اور وَاِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی یعنی وہ نماز کے لئے اس طرح کسمساتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اُٹھتے ہیں کہ گویا ان کی جان پر بن رہی ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ بَیْنَ الْعَبْدِ وَبَیْنَ الْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ "بندے اور کفر کے درمیان ترکِ صلوٰۃ واسطہ ہے"۔ یعنی ترکِ صلوٰۃ وہ پل ہے جس کو عبور کر کے آدمی ایمان سے کفر کی طرف جاتا ہے۔ اسی بنا پر رحمۃ للعالمین نے فرمایا کہ جو لوگ اذان کی آواز سن کر گھروں سے نہیں نکلتے، میرا جی چاہتا ہے کہ جا کر اُن کے گھروں میں آگ لگا دوں"۔ اور اسی بنا پر فرمایا کہ العھد بیننا وبینھم الصلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر "ہمارے اور عرب کے

بندوں کے درمیان تعلق کی بنا نماز ہے جس نے اسے چھوڑ دیا وہ کافر قرار پائے گا اور اس سے ہمارا تعلق ٹوٹ جائیگا۔ آج دین سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے جو اذان کی آواز سن کر ٹس سے مس نہیں ہوتے، جن کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ مؤذن کس کو بلا رہا ہے اور کس کام کے لئے بلا رہا ہے، وہ بھی مسلمان سمجھے جاتے ہیں اور یہ خیال عام ہوگیا ہے کہ نماز کی کوئی خاص اہمیت اسلام میں نہیں ہے۔ اس کے بغیر بھی آدمی مسلمان ہوسکتا ہے بلکہ مسلمانوں کا امام اور ملت کا قائد بھی ہوسکتا ہے مگر جب اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ تھا اس وقت یہ حال نہ تھا مستند روایت ہے کہ کان اصحاب النبی صلعم لا یرون شیئًا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں یہ بات متفق علیہ تھی کہ اسلامی اعمال میں سے صرف نماز ہی وہ عمل ہے جس کو چھوڑ دینا کفر ہے۔

تعمیر سیرت | نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو اس خاص ڈھنگ پر تیار کرتی ہے۔ جو اسلامی زندگی بسر کرنے یا بالفاظ دیگر، زندگی کو خدا کی عبادت بنا دینے کے لئے ضروری ہے۔

دنیا میں ہر جگہ آپ دیکھتے ہیں کہ جیسا کام کسی جماعت کو کرنا ہوتا ہے، جیسے مقاصد اس کے پیش نظر ہوتے ہیں، انہی کے لحاظ سے سیرت بنانے کے لئے ایک نظام تربیت وضع کیا جاتا ہے۔ مثلاً سلطنتوں کی سول سروس کا مقصد وفاداری کے ساتھ ملک کا انتظام کرنا ہوتا ہے اس لئے سول سروس کی ٹریننگ میں تمام تر زور حکومت مقتدرہ کی وفاداری اور نظم مملکت کی صلاحیتیں پیدا کرنے ہی پر صرف کیا جاتا ہے۔ تقویٰ اور طہارت کا وہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ پرائیویٹ زندگی خواہ کتنی ہی گندی کیوں نہ ہو، ایک شخص اس کے باوجود سول سروس میں داخل ہوسکتا اور ترقی کرسکتا ہے۔ کیونکہ حکومت میں راستی اور حق کے اصولوں کی پابندی کرنا اور اخلاق کو سیاست کی بنیاد بنانا وہاں سرے سے پیش نظر ہی نہیں ہے۔ اسی طرح فوجوں کی تنظیم کا مقصد جنگ کی قابلیت بہم پہنچانا ہوتا

ہے۔اس لئے سپاہیوں کی تربیت محض اس نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے کہ انہیں مار دھاڑ کے لئے تیار رہنا ہے۔انہیں پریڈ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ منظم صورت میں کام کرسکیں انہیں اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے تاکہ کشت و خون کے فن میں ماہر ہو جائیں۔ان کو اطاعتِ امر کا خوگر بنایا جاتا ہے تاکہ حکومت جہاں اور جس غرض کے لئے بھی ان کے دست و بازو سے کام لینا چاہے وہاں وہ بے تامل کام کریں۔اس کے ماسوا کوئی بلند تر اخلاقی مقصد چونکہ پیش نظر ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے فوجوں کی سیرت میں تقویٰ پیدا کرنے کا خیال تک کسی کو نہیں آتا۔سپاہی اگر ڈسپلن کے پابند ہیں تو حکومت کے مقصد کے لئے بس یہی کافی ہے اس کے بعد کچھ پروا نہیں اگر وہ زانی، شرابی، جھوٹے، بددیانت اور ظالم ہوں۔

اسلام اس کے برعکس ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا ہے جس کا مقصد اوّل نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے جس کو سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلح و جنگ، بین الاقوامی تعلقات، غرض تمدن کے ہر شعبے میں اخلاق کے مستقل اصولوں کی پابندی کرنی ہے جسے زمین پر خدا کے قانون کو نافذ کرنا ہے اس لئے وہ اپنے اہل کار، سپاہی اور افسر ایک دوسرے نظام تربیت کے تحت تیار کرتا ہے تاکہ ان کے اندر وہ سیرت پیدا ہو جو اس خاص نوعیت کی خدمت سے مناسبت رکھتی ہو۔اس سیرت کی بنیاد اسلام کے ایمانیات ہیں۔خدا کا خوف، اس کی محبت اُس کا عشق، اُس کی خوشنودی کو مقصد زندگی قرار دینا، اس کو حاکم اعلیٰ سمجھنا، اس کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ خیال کرنا اور یہ جاننا کہ ایک روز وہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے، یہی وہ اساسی تصورات ہیں جن پر اسلامی سیرت کی بنا قائم ہوتی ہے مسلمان اسلام کے طریقہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جب تک کہ اُسے یہ یقین نہ ہو کہ خدا ہر وقت ہر جگہ ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے۔اس کی ہر ہر حرکت سے باخبر ہے۔اندھیرے میں بھی اس کو دیکھتا ہے۔تنہائی میں بھی اس کے ساتھ ہے اس

ذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ: راستہ ان لوگوں کا جن پر تونے فضل و انعام فرمایا ہے" غَيْرِ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ: ان لوگوں کا رستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا ہے اور نہ اُن کا جو راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں" آمین: خدایا! ایسا ہی ہو۔ مالک! ہماری اس دُعا کو قبول کر"

اس کے بعد تم قرآن کی کچھ آیتیں پڑھتے ہو جن میں سے ہر ایک میں اسلام کے اساسی اصول، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی عملی ہدایات بیان کی گئی ہیں، اور اُس راہِ راست کے نشانات دکھائے گئے ہیں جس کی طرف رہنمائی کی درخواست ابھی اس سے پہلے تم نے کی ہے۔ مثلاً:-

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ: زمانہ کی قسم (یعنی زمانہ اس بات پر گواہ ہے) کہ آدمی نقصان میں ہے" اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے" وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ: اور جو ایک دوسرے کو حق پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہے"۔ ان مختصر جملوں میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ تو بربادی و نامرادی سے بچ نہیں سکتا جب تک خدا پرستی اور نیک عملی اختیار نہ کرے۔ اور صرف انفرادی نیکی ہی کافی نہیں ہے بلکہ تیری فلاح کے لئے ناگزیر ہے کہ تیری سوسائٹی ایسی ہو جس میں حق پرستی کی رُوح کارفرما ہو۔ تیری اپنی تاریخ اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہے۔

یا مثلاً اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ: تُونے دیکھا اُس شخص کو جو روزِ جزا کو نہیں مانتا (وہ کیسا آدمی ہوتا ہے؟) فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ: ایسا ہی آدمی تیم کو دھتکارتا ہے" وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ: اور مسکین کو آپ کھانا کھلانا تو درکنار دوسروں سے بھی یہ کہنا پسند نہیں کرتا کہ غریب کو کھلا دو" فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ

هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ

"پھر افسوس ہے اُن نمازیوں پر جو (آخرت کو نہ ماننے ہی کی وجہ سے) نماز سے غفلت کرتے ہیں اور پڑھتے بھی ہیں تو محض لوگوں کو دکھانے کے لئے۔ اور ان کے دل ایسے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ذرا ذرا سی چیزیں حاجت مندوں کو دیتے ہوئے بھی ان کا دل دُکھتا ہے۔" ان چھوٹے چھوٹے پُراثر فقروں میں یہ بات ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آخرت کا اعتقاد آدمی کی اخلاقی زندگی میں کیا اثر رکھتا ہے اور اس عقیدہ پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کا اجتماعی برتاؤ اور انفرادی رویہ کس طرح خلوص اور ہمدردی سے خالی ہو جاتا ہے۔

یا مثلاً وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ "افسوس ہے ہر اُس شخص کے حال پر جو دوسروں کی عیب چینی کرتا اور آوازے کستا پھرتا ہے" اَلَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ "روپیہ جمع کرتا اور گن گن کر رکھتا ہے" يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ "سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کا ساتھ دے گا" كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ "ہرگز نہیں! ایک دن آنے والا ہے جب وہ یقیناً حُطمہ میں ڈالا جائے گا" وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ "اور تجھے کیا خبر حطمہ کیا چیز ہے" نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ "اللہ کی بھڑکائی آگ، جس کی لپیٹیں دلوں پر چھا جائیں گی" اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ "وہ اُونچے اُونچے ستون جیسے شعلوں کی صورت میں ان کو گھیر لے گی"

یہ محض دو تین نمونے ہیں۔ جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر نماز میں قرآن کا کوئی نہ کوئی حصہ پڑھنا کس لئے لازم کیا گیا ہے اس سے غرض یہی ہے کہ روزانہ کئی کئی وقت خُدا کے احکام اس کی ہدایات اور اس کی تعلیمات بار بار آدمی کو یاد دلائی جاتی رہیں۔ یہ دنیا، یہ دار العمل جس میں کام کرنے کے لئے انسان بھیجا گیا ہے، اسی طرح درست رہ سکتی ہے کہ اس کے اندر کام کرنے

کے دوران میں آدمی کو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد الگ بلایا جاتا رہے تاکہ یہاں جس ہدایت نامے کے مطابق اسے کام کرنا ہے، اس کی دفعات اس کی یاد میں تازہ ہوتی رہیں۔

ان ہدایتوں کو پڑھنے کے بعد تم "اللہ اکبر" کہتے ہوئے رکوع میں جاتے ہو گھٹنوں پر ہاتھ ٹکا کر اپنے بادشاہ کے آگے جھکتے ہو اور بار بار کہتے ہو سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم "پاک ہے میرا رب جو بڑا بزرگ ہے" پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہو اور کہتے ہو سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ "اللہ نے سن لی اس شخص کی بات جس نے اس کی تعریف کی" پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہو، اوپر سے بیٹھ جاتے ہو اور یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہو:

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبَاتُ "ہماری سلامیاں، ہماری نمازیں اور ہمارے تمام اچھے کام اللہ کے لئے ہیں" اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ "سلام ہو آپ پر اے نبی اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں آپ پر نازل ہوں" اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ "سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے سب نیک بندوں پر" اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں" — یہ شہادت دیتے وقت سیدھے ہاتھ کی بیچ کی انگلی اٹھائی جاتی ہے کیونکہ یہ نماز میں مسلمان کے عقیدے کا اعلان ہے اور اس کو زبان سے ادا کرتے وقت خاص طور پر توجہ اور زور دینے کی ضرورت ہے — اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ "خدایا رحمت فرما محمد اور آل محمد پر جس طرح تو نے رحمت فرمائی ابراہیم اور آل ابراہیم پر" اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ

الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَفِتْنَةِ الْمَمَاتِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَاْثَمِ وَالْمَغْرَمِ" خدایا تیری پناہ مانگتا ہوں دوزخ کے عذاب سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں دجال کے فتنہ سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں زندگی اور موت کے فتنہ سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں بُرے اعمال سے اور دوسروں کے حقوق کی ذمہ داری سے"

یہ ہیں وہ عبارتیں جو رات دن کی پانچوں نمازوں میں تکرار کئی کئی مرتبہ دُہرائی جاتی ہیں۔ مگر رات کو سونے سے پہلے سب سے آخری نماز کی سب سے آخری رکعت میں ایک اور دعا پڑھی جاتی ہے۔ جس کا نام دعائے قنوت ہے یہ ایک عظیم الشان اقرار نامہ ہے جو سکون کے لمحوں میں بندہ اپنے خدا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ وَنُثْنِيْ عَلَيْكَ الْخَيْرَ" خدایا ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں تجھ سے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں تجھ پر ایمان لاتے ہیں تیرے ہی اُوپر بھروسہ کرتے ہیں اور تیری بہترین تعریف کرتے ہیں" وَنَشْكُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ۔ "ہم تیرا شکر ادا کریں گے۔ ناشکری نہیں کریں گے۔ جو تیری نافرمانی کرے گا ہم اُسے چھوڑ دیں گے۔ اور اس سے تعلق توڑ دیں گے" اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ" خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں تیرے ہی لئے نماز پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں ہماری ساری کوششوں اور ساری دوڑ دھوپ کا مقصود تو ہے۔ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ" ہم تیری رحمت کے اُمیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں کہ یقیناً تیرا عذاب کفرانِ نعمت کرنے والوں کو آلیگا"

یہ عبارتیں کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں ہیں ہر شخص ان کے اندر خود دیکھ سکتا ہے کہ اسلام اپنی سول سروس اور اپنی فوج کو کن جذبات، کن ارادوں اور کن نیتوں کے ساتھ تربیت کرتا ہے کیا چیزیں

ان کے دل میں بٹھاتا ہے اور کس قسم کی خصلتیں ان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے محض پریڈ سے تیار کی ہوئی فوج اسلام کے کسی کام کی نہیں محض انتظامی قابلیت رکھنے والی سول سروس کی بھی اسے حاجت نہیں اسے تو ان سپاہیوں اور اُن کارکنوں کی حاجت ہے جن کے اندر باضابطگی کے ساتھ تقویٰ بھی ہو جو سر کاٹنے اور کٹوانے کی طاقت کے ساتھ دل بدلنے اور اخلاق کو ڈھالنے کی طاقت بھی رکھتے ہوں، جو صرف زمین کا انتظام کرنے والے ہی نہ ہوں بلکہ اہلِ زمین کی اصلاح کرنے والے بھی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو آپ کا دل گواہی دیگا۔ کہ اسلامی مقاصد کے لئے نماز کے سوا یا نماز سے بہتر کوئی دوسرا نظامِ تربیت ممکن نہیں ہے جو شخص اس نظام کے تحت ٹھیک ٹھیک تربیت پائے اسی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ امانتوں اور ذمہ داریوں اور حقوق اللہ و حقوق العباد کا جو بار دنیوی زندگی میں اُس پر ڈالا جائے گا اُس کو وہ خدا ترسی کے ساتھ سنبھالے گا اور قعرِ دنیا میں رہ کر بھی دامن تر نہ ہونے دیگا۔

اسی بنا پر قرآن میں دعوےٰ کیا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ "یقیناً نماز بے حیائی اور بدی سے روکتی ہے" اسی بنا پر قدیم ترین زمانے سے نماز اسلامی تحریک کا لازمی جزو رہی ہے۔ جس قدر انبیاء خدا کی طرف سے دنیا میں آئے ہیں ان سب کی شریعت میں نماز اولین رکن اسلام تھی کیونکہ اسلام کی تحریک اس نظامِ تربیت کے بغیر دنیا میں چل ہی نہیں سکتی اسی بنا پر قرآن کہتا ہے کہ اسلامی تحریک میں جب کبھی زوال آیا، نماز کا نظامِ تربیت ٹوٹ جانے کی وجہ ہی سے آیا۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا "پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے۔ جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا۔ اور خواہشات نفس کے پیچھے پڑ گئے۔ سو عنقریب وہ کج راہی میں مبتلا ہوں گے" اس کی وجہ ظاہر ہے اسلام کے طریقہ پر چلنے کے لئے اسلامی سیرت ضروری ہے، اور اسلامی سیرت

نماز کے نظام تربیت ہی سے بنتی ہے۔ جب یہ نظام ٹوٹے گا تو سیرتیں بگڑ جائیں گی اور اس کا لازمی نتیجہ زوال و انحطاط ہے۔

ضبطِ نفس تعمیر سیرت کے ساتھ ساتھ نماز انسان میں ضبطِ نفس کی طاقت بھی پیدا کرتی ہے جس کے بغیر تعمیر سیرت کا مدعا حاصل نہیں ہو سکتا۔ تعمیر سیرت کا کام بجائے خود صرف اتنا ہے کہ یہ انسانی خودی کو تربیت دے کر مہذب بنا دیتی ہے۔ لیکن اگر اس تربیت یافتہ خودی کو اُن جسمانی اور نفسانی قوتوں پر جو اس کے لئے آلہ کی حیثیت رکھتی ہیں، عملاً پورا قابو حاصل نہ ہو تو اس کی تربیت و تہذیب کا مقصود، یعنی صحیح برتاؤ اور ٹھیک چلن، حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک مثال کے پیرایہ میں اس کو یوں سمجھیے کہ انسان ایک موٹر اور ایک ڈرائیور کے مجموعہ کا نام ہے یہ مجموعہ ٹھیک کام اُسی حالت میں کر سکتا ہے جب کہ موٹر کے تمام آلات اور اس کی تمام طاقتیں ڈرائیور کے قابو میں ہوں اور ڈرائیور مہذب، تربیت یافتہ اور واقف راہ ہو اگر آپ نے ڈرائیور کو تربیت دے کر تیار کر دیا، مگر اسٹیرنگ، بریک اور ایکسیلریٹر پوری طرح اس کے قابو میں نہ آئے، یا آئے تو بھی کچھ ڈھیلے رہے تو اس صورت میں ڈرائیور موٹر کو نہ چلائیگا بلکہ موٹر ڈرائیور کو چلائیگی۔ اور چونکہ موٹر صرف چلنا جانتی ہے، بینائی تمیز اور راستہ کی واقفیت نہیں رکھتی، اس لئے وہ ڈرائیور کو لیکر چلیگی تو اوندھے سیدھے راستوں پر جدھر چاہے گی اسے کھینچے کھینچے پھرے گی۔ اس مثال کے مطابق انسان کی جسمانی طاقتیں اور اس کی نفسانی خواہشات اور ذہنی قوتیں موٹر کے حکم میں ہیں۔ اور اُس کی خودی ڈرائیور کی حیثیت رکھتی ہے یہ موٹر ویسی ہی جاہل ہے جیسی لوہے والی موٹر ہوتی ہے مگر وہ بے جان ہے اور یہ جاندار۔ یہ خواہشات، جذبات اور داعیات رکھتی ہے اور ہر وقت کوشش کرتی رہتی ہے کہ ڈرائیور اس کو نہ چلائے بلکہ یہ ڈرائیور کو چلائے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا مقصود ڈرائیور کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ وہ اس موٹر کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دے بلکہ خود اس پر سوار ہو اور اسے اپنے اختیار سے چلا کر اُس سیدھی شاہراہ پر سفر کرے جو اس کی منزل مقصود کی طرف جاتی ہے۔ اس غرض کے لئے صرف یہی بات کافی

نہیں ہے کہ ڈرائیور کو راستہ کا علم، موٹر کا طریق استعمال اور مقصد استعمال، اور فی الجملہ ڈرائیوری کے آداب سکھا کر ایک مہذب اور تربیت یافتہ ڈرائیور بنا دیا جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ اسٹیرنگ بریک اور ایکسیلریٹر ہر وقت مضبوطی کے ساتھ کسے ہوئے رکھے جائیں اور ڈرائیور کی گرفت ان پر ڈھیلی نہ ہونے پائے، کیونکہ یہ منہ زور موٹر ہر وقت بے راہ روی کے لئے زور لگا رہی ہے۔

نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی، طہارت وغیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑ اسی لئے لگایا گیا ہے کہ ڈرائیور اپنی موٹر پر پوری طرح قابو یافتہ رہے اور اسے اپنے ارادہ کے تحت چلانے میں مشاق ہو جائے۔ اس طریقہ سے موٹر کی منہ زوری روزانہ پانچ وقت توڑی جاتی ہے، بریک کسے جاتے ہیں ایکسیلریٹر اور اسٹیرنگ مضبوط کئے جاتے ہیں، اور ڈرائیور کی گرفت مستحکم کی جاتی ہے صبح کا وقت ہے نیند مزے کی آ رہی ہے آرام طلب نفس کہتا ہے پڑے بھی رہو، اب کہاں اُٹھ کر جاؤ گے نماز کہتی ہے کہ وقت آ چکا ہے، سیدھی طرح اُٹھو، غسل کی حاجت ہے تو نہاؤ، ورنہ وضو کرو، جاڑے کا موسم ہے تو ہوا کرے پانی گرم نہیں ہے، نہ سہی، ٹھنڈے پانی سے ہی طہارت حاصل کرو اور چلو مسجد کی طرف۔ ان دو متضاد مطالبوں میں سے اگر آپ نے نفس کے مطالبہ کو پورا کر دیا تو موٹر آپ پر سوار ہو گئی۔ اور اگر نماز کے مطالبہ کو پورا کیا تو آپ موٹر پر سوار ہو گئے۔ اسی طرح ظہر، عصر، مغرب، عشا ہر وقت نفس کسی نہ کسی مشغولیت، فائدے، نقصان، لطف، لذت، مشکلات وغیرہ کے بہانے نکالتا ہے۔ موقع ڈھونڈتا رہتا ہے کہ ذرا آپ کے اندر کمزوری پیدا ہو اور یہ آپ پر سوار ہو جائے مگر نماز ہر موقع پر آپ کے لئے تازیانہ بن کر آتی ہے، آپ کی اونگھتی ہوئی قوت ارادی کو جگاتی ہے، اور آپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی موٹر کو اپنے حکم کا تابع بناؤ، اس کے غلام بن کر نہ رہ جاؤ۔ یہ معرکہ روز پیش آتا ہے، مختلف اوقات، مختلف حالتوں اور مختلف صورتوں میں پیش آتا ہے۔ کبھی سفر میں اور کبھی حضر میں کبھی گرمی میں اور کبھی جاڑے میں۔ کبھی آرام کے وقت، اور کبھی کاروبار کے وقت۔ کبھی تفریح کے موقع پر اور کبھی رنج و غم

اور مصیبت کے موقع پر۔ ان بے شمار مختلف النوع حالتوں میں نفس کی طلب اور نماز کی پکار کے مابین کشمکش ہوتی ہے، اور آپ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔ نفس کی بات آپ نے مانی تو شکست کھا گئے خادم آپ کا آقا بن گیا۔ اندھی جاہل موٹر کے قابو میں آپ نے اپنے آپ کو دے دیا۔ اب یہ ٹیڑھے بنگے راستوں پر آپ کو لئے پھرے گی اور آپ بے بسی کے عالم میں اس کے ساتھ ساتھ پھرتے رہیں گے بخلاف اس کے اگر آپ نماز کا مطالبہ برابر پورا کرتے رہے تو آپ اس موٹر کا باغیانہ زور توڑ دیں گے، اس پر حکمراں بن جائیں گے، اور آپ میں یہ طاقت پیدا ہو جائیگی کہ اپنے علم و اذعان اور اپنے ارادے کے مطابق اس کے کل پرزوں اور اس کی قوتوں سے کام لیں۔

اسی بنا پر قرآن میں نماز کے ضائع کرنے کا فوری اور لازمی نتیجہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ آدمی شہوات اور خواہشات کا تابع بن جاتا ہے۔ اور سیدھے راستے سے ہٹ کر ٹیڑھے راستوں میں بھٹکتا چلا جاتا ہے:-

فَخَلَفَ مِنۡ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ”پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے پڑ گئے لہٰذا عنقریب گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔“

افراد کی تیاری کا پروگرام یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ نماز کے فوائد و منافع کا صرف ایک پہلو ہے یعنی یہ کہ نماز افراد کو کس طرح تیار کرتی ہے اب دوسرے پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے فرد کی تیاری کے اس پروگرام پر مجموعی نظر ڈال لیجئے۔ اس پروگرام کے پانچ حصے ہیں:-

(۱) آدمی کے ذہن میں اس حقیقت کے ادراک کو تازہ رکھنا کہ وہ دنیا میں ایک خود مختار وجود نہیں ہے بلکہ رب العالمین کا بندہ ہے اور یہاں اسی حیثیت سے اس کو کام کرنا ہے۔

(۲) بندہ کی حیثیت سے اس کو فرض شناس بنانا اور اس میں ادائے فرض کی عادت پیدا کرنا۔

(۳) فرض شناس اور نا فرض شناس میں تمیز کرنا اور نا فرض شناس افراد کو چھانٹ کر الگ کر دینا۔

(۴) خیالات کا ایک پورا نظام، ایک پوری آئیڈیالوجی آدمی کے ذہن میں اُتار دینا اور اس کو ایسا محکم کرنا کہ ایک پختہ سیرت بن جائے۔

(۵) آدمی میں یہ قوت پیدا کرنا کہ اپنے عقیدے اور اپنے علم و بصیرت کے مطابق جس طرزِ عمل کو صحیح سمجھتا ہو اس پر عمل کر سکے، اور اپنے جسم و نفس کی تمام طاقتوں سے اُس راہ میں کام لے سکے۔ اس کے کیرکٹر میں اس قسم کا ڈھیلا پن نہ رہ جائے کہ صحیح تو سمجھتا ہو ایک طریقہ کو مگر اپنے نفس کی خواہش سے مجبور ہو کر چلے دوسرے طریقہ پر۔

اسلام جو سوسائٹی بناتا ہے اس کے ایک ایک فرد کو وہ اس طرح نماز کے ذریعہ سے تیار کرتا ہے دس برس کی عمر کے بعد اس سوسائٹی کے ہر لڑکے اور ہر لڑکی پر نماز فرض کر دی گئی ہے اور یہ فرض کسی حال میں اس سے ساقط نہیں ہوتا الّا یہ کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو یا عورت حیض و نفاس کی حالت میں ہو۔ بیماری میں، سفر میں، جنگ کے معرکے تک میں یہ فرض اسے ادا کرنا پڑے گا۔ اُٹھ نہ سکے تو بیٹھ کر پڑھے۔ بیٹھنا ممکن نہ ہو لیٹ کر پڑھے۔ ہاتھ پاؤں حرکت نہ کر سکتے ہوں، اشارہ سے پڑھے پانی نہ ملتا ہو مٹی سے تیمم کر کے پڑھے۔ قبلے کی سمت معلوم نہ ہو، جدھر گمان ہو اُسی طرف منہ کر کے پڑھے۔ غرض کوئی عذر اس معاملے میں مسموع نہیں ہے نماز کا وقت جب آجائے تو ہر حال میں مسلمان مامور ہے کہ اس فرض کو ادا کرے۔

بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے اپنے اجزائے ترکیبی یعنی اپنے افراد کو فرداً فرداً تیار کرنے کا ایسا مکمل انتظام کیا ہو۔ دنیا کے اجتماعی نظامات میں عموماً جماعت کی ہیئت ترکیبی بنانے اور افراد کو بیرونی بندشوں سے جکڑنے ہی پر تمام تر زور دیا جاتا ہے، مگر جماعت کے ایک ایک جزء کو اندر سے تیار کرنے اور جماعتی اصولوں کے مطابق بنانے کی کوشش کم کی جاتی ہے حالانکہ جماعت کی حیثیت ایک دیوار کی سی ہے جو اینٹوں سے

بنتی ہے۔ ایک ایک اینٹ اگر مضبوط نہ ہو تو دیوار بحیثیت مجموعی کمزور ہوگی۔ اسی طرح افراد کی سیرت میں اگر کمزوری ہو، اگر ان کے خیالات جماعتی اصولوں کے مطابق نہ ہوں، اور اگر عملاً وہ جماعتی راہ کے خلاف چلنے کے میلانات رکھتے ہوں، تو محض بیرونی بندشیں جماعت کے نظام کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکتیں آخر کار بغاوت رونما ہوگی اور نظام ٹوٹ جائیگا۔

تنظیم جماعت | اب ہمیں نماز کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہئے یہ ظاہر ہے کہ انفرادی سیرت تنہا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ جماعت میں بھی وہی سیرت موجود نہ ہو۔ فرد اپنے نصب العین کو پا ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ لوگ جن کے درمیان وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس نصب العین تک پہنچنے میں اس کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ فرد جن اصولوں پر ایمان رکھتا ہے، ان کے مطابق تنہا عمل کرنا اس کے لئے ناممکن ہے تا وقتیکہ پوری جماعتی زندگی انہی اصولوں پر قائم نہ ہو جائے۔ آدمی دنیا میں اکیلا پیدا نہیں ہوا ہے، نہ اکیلا رہ کر کوئی کام کرسکتا ہے۔ اس کی ساری زندگی اپنے بھائی بندوں، دوستوں اور ہمسایوں، معاملہ داروں اور زندگی کے بے شمار ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں قسم کے تعلقات میں جکڑی ہوئی ہے۔ دنیا میں وہ خدا کی طرف سے مامور اسی لئے کیا گیا ہے، کہ اس اجتماعی زندگی اور ان اجتماعی تعلقات میں خدا کے قانون کو جاری کرے۔ اس قانون پر عمل کرنے اور اس کو نافذ کرنے کا نام ہی عبادت ہے اگر آدمی ایسے لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ہو، جو اس قانون کو مانتے ہی نہ ہوں، یا سب کے سب اس کی نافرمانی پر تلے ہوئے ہوں، یا ان کے باہمی تعلقات اس طرح کے ہوں کہ اس کو جاری کرنے میں وہ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، تو اکیلے آدمی کے لئے خود اپنی زندگی میں بھی اس پر عمل کرنا غیر ممکن ہے کجا کہ وہ جماعتی زندگی میں اس کو نافذ کرسکے۔

علاوہ بریں مسلمان کے لئے یہ دنیا سخت جد وجہد، مقابلہ اور کشمکش کا معرکہ کارزار ہے

ان خدا سے بغاوت کرنے والوں کے بڑے بڑے جتھے بنے ہوتے ہیں قوانین کو پوری
ت کے ساتھ جاری کر رہے ہیں اور ان کے مقابلہ میں مسلمان پر یہ ذمہ داری — بھاری کمر توڑ
ینے والی ذمہ داری — ڈالی گئی ہے کہ یہاں خدا کے قانون کو پھیلائے اور جاری کرے انسان
بنایا ہوا قانون جہاں جہاں چل رہا ہے اُسے مٹائے اور اُس کی جگہ اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے
نون کی حکومت قائم کرے۔ یہ زبردست خدمت جو اللہ نے مسلمان کے سپرد کی ہے اس
باغی جتھوں کے مقابلہ میں کوئی اکیلا مسلمان انجام نہیں دے سکتا اگر کروڑوں مسلمان بھی دنیا میں
جو وہوں مگر الگ الگ رہ کر انفرادی کوشش کریں۔ تب بھی وہ مخالفین کی منظم طاقت کے
مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ سارے بندے جو خدا کی عبادت کرنا
چاہتے ہیں ایک جتھا بنیں۔ ایک دوسرے کے مددگار ہوں ایک دوسرے کی پشت پناہ بنیں
اور مل کر اپنے مقصد کے لئے جدوجہد کریں۔

ان دونوں اغراض کے لئے مسلمانوں کا صرف مل جانا ہی کافی نہیں بلکہ یہ ملنا صحیح طریق
پر ہونا چاہئے صرف اجتماعی نظام پیدا ہو جانا کافی نہیں بلکہ ایک صالح اجتماعی نظام درکار ہے جس میں
مسلمان اور مسلمان کا تعلق ٹھیک ٹھیک ویسا ہی ہو جیسا کہ اسلام چاہتا ہے، ان کے درمیان مساوات
و محبت اور ہمدردی ہو، یک جہتی اور وحدت فی العمل ہو، سب کے اندر خدا کی بندگی کرنے کا
مشترک ارادہ نہ صرف موجود ہو بلکہ پیہم متحرک رہے اور اجتماعی حرکت کرنے کی عادت ان کی طبیعت
ثانیہ بن جائے۔ ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہو کہ جب وہ لیڈر بنے تو جماعت میں اس کا رویہ
کیا ہونا چاہئے۔ اور جب کوئی دوسرا ان کا لیڈر ہو تو وہ کس طرح اس کی اطاعت کریں کس طرح اس کے
حکم پر حرکت کریں، کہاں تک اس کی فرمانبرداری اُن پر واجب ہے کہاں انہیں اس کو ٹوکنا چاہیے
اور کس حد تک پہنچ کر وہ ان کی اطاعت کا مستحق نہیں رہتا۔

نماز باجماعت نماز انفرادی سیرت کی تعمیر کے ساتھ یہ کام بھی کرتی ہے۔ وہ اس اجتماعی نظام کو پورا ڈھانچہ بناتی ہے اس کو قائم کرتی اور قائم رکھتی ہے، اور اسے روزانہ پانچ مرتبہ حرکت میں لاتی ہے تاکہ وہ ایک مشین کی طرح چلتا رہے۔ اسی لئے پنجوقتہ نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا شرط لازم قرار دیا گیا ہے شریعت کی رو سے ایک ایک شخص الگ الگ نماز پڑھ کر فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا بلکہ تمام مسلمانوں کا مسجد میں حاضر ہونا اور باجماعت نماز پڑھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح کہ خود نماز پڑھنا فرض ہے الّا یہ کہ کوئی شخص ایسی جگہ ہو جہاں قیام جماعت ممکن نہ ہو۔ جماعت کی اس تاکید کا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کا نظام اجتماعی اپنی صحیح صورت پر قائم اور متحرک رہے۔ مسجد کا پنجوقتہ اجتماع مسلمانوں کے نظام جماعت کی بنیاد ہے اس بنیاد کی مضبوطی پر اس پورے نظام کی مضبوطی منحصر ہے ادھر یہ کمزور ہوئی اور اُدھر سارا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔

اذان ... ہے کہ ... کی آواز سنتے ہی اٹھ جاؤ اور اپنے اپنے کام چھوڑ کر مسجد کی طرف رُخ کرو۔ اس طلبی کی پکار کو سن کر ہر طرف سے مسلمانوں کا ایک مرکز کی طرف دوڑنا وہی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ جو فوج کی ہوتی ہے فوجی سپاہی جہاں جہاں بھی ہوں، بگل کی آواز سنتے ہی سمجھ لیتے ہیں کہ ہمارا کمانڈر ہمیں بلا رہا ہے۔ اس طلبی پر سب کے دل میں ایک ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی کمانڈر کے حکم کی پیروی کا خیال، اور اس خیال کے آتے ہی سب ایک کام کرتے ہیں، یعنی اپنے اپنے کام چھوڑ کر اُٹھنا اور ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جانا۔ فوج میں یہ طریقہ کس لئے رکھا گیا ہے؟ اسی لئے کہ اول تو ہر سپاہی میں فرداً فرداً حکم ماننے اور اس پر مستعدی کے ساتھ عمل کرنے کی خصلت و عادت پیدا ہو ... کے ساتھ ہی ایسے تمام فرمانبردار سپاہی مل کر ایک گروہ، ایک جتھا، ایک ٹیم بن جائیں اور ان میں یہ عادت پیدا ہو جائے کہ کمانڈر کا حکم پاتے ہی ایک وقت میں ایک جگہ سب مجتمع ہو جایا کریں تاکہ جب کوئی مہم پیش آئے تو ساری فوج ایک آواز پر ایک مقصد کے لئے اکٹھی ہو کر کام کر سکے۔ فوجی اصطلاح میں

اس کو سرعت اجتماع کہتے ہیں اور یہ فوجی زندگی کی جان ہے اگر کسی فوج میں اس طرح جمع ہونے کی صلاحیت نہ ہو اور اس کے سپاہی ایسے خودسر ہوں کہ جس کا جدھر منہ اٹھتا ہو اُدھر چلا جاتا ہو، تو خواہ ایسی فوج کا ایک ایک سپاہی اپنی جگہ تیس مار خاں ہی کیوں نہ ہو، وہ کسی مہم کو سر نہیں کر سکتی اس قسم کے ایک ہزار بہادر سپاہیوں کو دشمن کے پچاس سپاہیوں کا ایک منظم دستہ الگ الگ پکڑ کر ختم کر سکتا ہے ٹھیک اسی مصلحت کی بنا پر مسلمانوں کے لئے بھی یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ جو مسلمان جہاں اذان کی آواز سُنے سب کام چھوڑ کر اپنے قریب کی مسجد کا رُخ کرے۔ اس اجتماع کی مشق ان کو روزانہ پانچ وقت کرائی جاتی ہے، کیونکہ اس خدائی فوج کی ڈیوٹی دنیا کی ساری فوجوں سے زیادہ سخت ہے جیسا کہ اُوپر کہہ چکا ہوں، دوسری فوجوں کے لئے تو مدتوں میں کبھی ایک مہم پیش آتی ہے اور اس کی خاطر ان کو پیاری فوجی مشقیں کرائی جاتی ہیں، مگر اس خدائی فوج کو تو ہر وقت ایک مہم درپیش ہے، اس لئے اس کے ساتھ یہ بھی بہت بڑی رعایت ہے کہ اسے دن رات میں صرف پانچ مرتبہ ہی خدائی بگل کی آواز پر دوڑنے اور خدائی چھاؤنی یعنی مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسجد میں اجتماع یہ تو محض اذان کا فائدہ تھا۔ اب آپ مسجد میں جمع ہوتے ہیں اور صرف اس جمع ہونے ہی میں بے شمار فائدے ہیں یہاں جو آپ جمع ہوئے تو آپ نے ایک دوسرے کو دیکھا، پہچانا، ایک دوسرے سے واقف ہوئے یہ دیکھنا، پہچاننا، واقف ہونا کس حیثیت سے ہے؟ اس حیثیت سے کہ آپ سب ایک خدا کے بندے ہیں ایک رسول کے پیرو ہیں ایک کتاب کے ماننے والے ہیں ایک ہی مقصد سب کی زندگی کا ہے، اسی مقصد کے لئے آپ مسجد میں جمع ہوئے ہیں اور اسی مقصد کے لئے مسجد سے باہر جا کر بھی آپ کو عمل کرنا ہے۔ اس قسم کا تعارف آپ میں خود بخود یہ خیال پیدا کر دیتا ہے کہ آپ سب ایک قوم ہیں ایک ہی فوج کے سپاہی ہیں ایک دوسرے کے بھائی اور رفیق ہیں، دنیا میں آپ کی اغراض، آپ کے مقاصد، آپ کے نقصانات اور آپ کے فوائد سب مشترک ہیں،

آپ کی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں، اٹھینگے تو ایک ساتھ اور گرینگے تو ایک ساتھ۔

پھر آپ جو ایک دوسرے کو دیکھیں گے تو ظاہر ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھیں گے اور یہ دیکھنا بھی دشمن کو دشمن کا دیکھنا نہیں بلکہ دوست کا دوست کو اور بھائی کا بھائی کو دیکھنا ہوگا۔ اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے کہ میرا کوئی بھائی پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے کوئی پریشان صورت ہے کوئی فاقہ زدہ چہرہ لئے ہوئے آیا ہے، کوئی معذور، لنگڑا، لولا یا اندھا ہے، تو خواہ مخواہ آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ آپ میں سے جو خوشحال ہیں وہ غریبوں اور بے کسوں پر رحم کھائیں گے جو بدحال ہیں انہیں امیروں تک پہنچنے اور اپنا حال کہنے کی ہمت ہوگی کسی کے متعلق معلوم ہوگا کہ بیمار ہے یا کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اس لئے مسجد میں نہیں آیا۔ تو آپ اس کی عیادت کو جائیں گے کسی کے مرنے کی خبر ملی تو آپ اس کے جنازہ میں شریک ہوں گے اور غمزدہ عزیزوں کو تسلی دیں گے یہ سب باتیں آپس کی محبت کو بڑھانے والی، آپ کو ایک دوسرے کے قریب کرنے والی اور ایک دوسرے کا مددگار بنانے والی ہیں۔

اور ذرا غور کیجئے۔ یہاں جو آپ جمع ہوتے ہیں تو ایک پاک جگہ پاک مقصد کے لئے جمع ہوتے ہیں آپ کو کسی فلم سٹار کا عشق یہاں کھینچ کر نہیں لایا ہے آپ شراب خواری یا جوئے بازی کے لئے جمع نہیں ہوتے ہیں۔ یہ بدکاروں کا اجتماع نہیں ہے کہ سب کے دل میں ناپاک ارادے بھرے ہوئے ہوں یہ تو اللہ کے بندوں کا اجتماع ہے، اللہ کی عبادت کے لئے ہے اللہ کے گھر میں ہے سب اپنے خدا کے سامنے بندگی کا اقرار کرنے حاضر ہوتے ہیں ایسے موقع پر اول تو ایماندار آدمی کے دل میں خود ہی اپنے گناہوں پر شرمندگی کا احساس ہوتا ہے لیکن اگر اس نے کوئی گناہ اپنے دوسرے بھائی کے سامنے کیا تھا اور وہ بھی یہاں مسجد میں موجود ہے تو محض اس کی نگاہوں کا سامنا ہو جانا ہی اس کے لئے کافی ہے کہ گناہ گار اپنے دل میں کٹ کٹ جائے اور اگر کہیں مسلمانوں میں ایک دوسرے

کو نصیحت کرنے کا جذبہ بھی موجود ہو، اور وہ جانتے ہوں کہ ہمدردی و محبت کے ساتھ ایک دوسرے کی اصلاح کس طرح کرنی چاہیے تو یقین جانیے کہ یہ اجتماع انتہائی رحمت و برکت کا موجب ہوگا۔ اس طرح سب مسلمان مل کر ایک دوسرے کی خرابیوں کو دور کریں گے، ایک دوسرے کے نقائص کی اصلاح کریں گے اور پوری جماعت صالحین کی جماعت بنتی چلی جائیگی۔

صف بندی یہ صرف مسجد میں جمع ہونے کی برکتیں ہیں اب دیکھیے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے میں کتنی برکتیں پوشیدہ ہیں۔ سب مسلمان مسجد میں مساوی الحیثیت ہیں ایک چمار اگر پہلے آیا ہو تو وہ اگلی صف میں ہوگا اور ایک رئیس اگر بعد میں آئے تو وہ پچھلی صفوں میں رہیگا کوئی بڑے سے بڑا آدمی مسجد میں اپنی سیٹ ریزرو نہیں کرا سکتا کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ دوسرے مسلمان کو مسجد میں کسی جگہ کھڑے ہونے سے روک دے یا جہاں وہ پہلے سے موجود ہو وہاں سے اس کو ہٹا دے۔ کوئی اس کا مجاز نہیں کہ آدمیوں پر سے پھاندکر یا صفوں کو چیر کر آگے پہنچنے کی کوشش کرے، سب مسلمان ایک صف میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوں گے۔ وہاں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ نہ کوئی اُونچ نہ نیچ۔ نہ کسی کے چھو جانے سے کوئی ناپاک ہوتا ہے نہ کسی کے برابر کھڑا ہونے سے کسی کی عزت کو بٹہ لگتا ہے۔ بازار کا جاروب کش آئے گا اور گورنر کے برابر کھڑا ہو جائے گا یہ وہ اجتماعی جمہوریت ہے جسے قائم کرنے میں اسلام کے سوا کوئی کامیاب نہیں ہوسکا یہاں روزانہ پانچ وقت سوسائٹی کے افراد کی اونچ نیچ برابر کی جاتی ہے بڑوں کے دماغ سے کبر یائی کا غرور نکالا جاتا ہے چھوٹوں کے ذہن سے پستی کا احساس دور کیا جاتا ہے اور سب کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں تم سب انسان یکساں ہو۔

یہ صف بندی جس طرح طبقاتی امتیازات کو مٹاتی ہے اسی طرح نسل، قبیلہ، وطن اور رنگ وغیرہ کی عصبیتوں کو بھی مٹاتی ہے۔ مسجد میں کسی امتیازی نشان کے لحاظ سے مختلف انسانی گروہوں کے بلاک الگ نہیں ہوتے۔ تمام مسلمان جو مسجد میں آئیں، خواہ کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا فرنگی، سامی ہوں یا آرین اور ان کے قبیلوں اور ان کی زبانوں میں خواہ کتنے ہی اختلافات ہوں، بہرحال سب کے سب ایک صف

میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔ روزانہ پانچ وقت اس نوع کا اجتماع اُن تعصبات کی بیخ کنی کرتا رہتا ہے جو انسانی جماعت میں خارجی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں یہ انسانی وحدت قائم کرتا ہے بین الاقوامیت کی جڑیں مضبوط کرتا ہے اور اس خیال کو دماغوں میں پیوست کر دیتا ہے کہ حسب نسب اور برادریوں کی ساری عصبیتیں جھوٹی ہیں تمام انسان خدا کے بندے ہیں اور اگر خدا کی بندگی و عبادت پر وہ سب متفق ہو جائیں تو پھر وہ سب ایک قوم ہیں۔

پھر جب یہ سب ایک صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک ساتھ رکوع وسجدہ کرتے ہیں تو ان کے اندر منظم اجتماعی حرکت کرنے کی وہی صلاحیتیں پرورش پاتی ہیں جنہیں پیدا کرنے کے لئے فوج کو پریڈ کرائی جاتی ہے۔ اس کا مدعا ہی یہ ہے کہ مسلمانوں میں یکجہتی اور وحدت فی العمل پیدا ہو اور وہ خدا کی بندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر تنِ واحد کی طرح ہو جائیں۔

اجتماعی دعائیں صف بندی کے ان تمام فائدوں کو وہ دعائیں دو آتشہ کر دیتی ہیں جو نماز میں خدا سے مانگی جاتی ہیں۔ سب یک زبان ہو کر اپنے مالک سے عرض کرتے ہیں کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ "ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں"۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ "ہم سب کو سیدھے رستہ کی ہدایت دے"۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ "ہم سب پر سلامتی ہو اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر بھی"۔ نماز کی دعاؤں میں کہیں آپ کو واحد کا صیغہ نہ ملے گا۔ جہاں آپ دیکھیں گے جمع ہی کا صیغہ پائیں گے۔ اجتماعی عبادت اور اجتماعی حرکات کے ساتھ مل کر یہ اجتماعی دعائیں ہر مسلمان کے ذہن میں یہ نقش ثبت کر دیتی ہیں اور روزانہ ثبت کرتی رہتی ہیں کہ وہ اکیلا نہیں ہے اسے سب کچھ تنہا اپنے ہی لئے چاہنا اور مانگنا نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی جماعت کے ساتھ مربوط ہے جماعت کی بھلائی میں اس کی بھلائی ہے جماعت ہی کے راہ راست پر چلنے میں اس کی خیر ہے خدا کی طرف سے فضل اور سلامتی جماعت پر نازل ہو گی تب ہی وہ خود بھی اس سے متمتع ہو سکیگا یہ چیز دماغوں سے انفرادیت کو

نکالتی ہے اجتماعی ذہنیت پیدا کرتی ہے۔ افراد جماعت میں خیر خواہی کے جذبات اور مخلصانہ محبت کے روابط کو نشوونما دیتی ہے۔ اور روزانہ پانچ مرتبہ اس طریقہ سے مسلمانوں کے احساس اجتماعیت کو اکسایا جاتا ہے تاکہ مسجد کے باہر زندگی کے وسیع میدان میں ان کا برتاؤ درست ہوتا رہے۔

امامت | یہ اجتماعی عبادت ایک امام کے بغیر انجام نہیں پاتی۔ دو آدمی بھی اگر فرض نماز پڑھیں تو لازم ہے کہ ان میں سے ایک امام بنے اور دوسرا مقتدی۔ جماعت جب کھڑی ہو جائے تو اس سے الگ ہو کر نماز پڑھنا سخت ممنوع ہے بلکہ ایسی نماز ہوتی ہی نہیں۔ حکم ہے کہ جو آتا جائے اُسی امام کے پیچھے جماعت میں شامل ہوتا جائے۔ امامت کا منصب کسی طبقہ یا کسی نسل یا گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں نہ اس کے لئے کوئی ڈگری یا سند درکار ہے ہر مسلمان امام بن سکتا ہے البتہ شریعت یہ سفارش کرتی ہے کہ امام بنانے میں آدمی کی چند صفات کا لحاظ کیا جائے جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

جماعت میں امام اور مقتدیوں کا تعلق جس طور پر قائم کیا گیا ہے اس میں ایک ایک چیز انتہا درجہ کی معنی خیز ہے اس میں دراصل ہر مسلمان کو قیادت اور اتباع قیادت کی مکمل ٹریننگ دی جاتی ہے اس میں بتایا جاتا ہے کہ اس چھوٹی مسجد سے باہر اس وسیع مسجد میں جس کا نام زمین ہے مسلمانوں کا جماعتی نظام کیسا ہونا چاہئے۔ جماعت میں امام کی کیا حیثیت ہے۔ اس کے فرائض کیا ہیں۔ اس کے حقوق کیا ہیں امام بننے کی صورت میں اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہئے دوسری طرف جماعت کو اس کی اطاعت کس طرح کرنی چاہئے اور کن باتوں میں کرنی چاہئے۔ اگر وہ غلطی کرے تو مسلمان کیا کریں۔ کہاں تک غلطی میں بھی اس کی پیروی کریں۔ کہاں وہ اس کو ٹوکنے کے مجاز ہیں۔ کہاں ان کو اس سے یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور کس موقع پر وہ اس کو امامت سے ہٹا سکتے ہیں یہ سب گویا چھوٹے پیمانہ پر ایک بڑی سلطنت کو چلانے کی مشق ہے جو ہر روز پانچ مرتبہ ہر چھوٹی سے چھوٹی مسجد میں مسلمانوں سے کرائی جاتی ہے۔

ہدایت کی گئی ہے کہ امام ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جو پرہیزگار ہو نیک سیرت ہو دین کا علم رکھتا ہو اور

سن رسیدہ بھی ہو۔ حدیث میں ترتیب بھی بتا دی گئی ہے کہ ان صفات میں سے کون سی صفت کس صفت پر مقدم ہے یہیں سے یہ تعلیم بھی دیدی گئی کہ سردار قوم کے انتخاب میں کن چیزوں کا لحاظ کرنا چاہیئے۔

حکم ہے کہ امام ایسے شخص کو نہ بنایا جائے جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو۔ یوں تھوڑے بہت مخالف کس کے نہیں ہوتے۔ لیکن اگر جماعت میں زیادہ تر آدمی کسی کا اقتدا کرنے سے کراہت کرتے ہوں تو اسے امام نہ بنایا جائے یہاں پھر سردار قوم کے انتخاب کا ایک قاعدہ بتا دیا گیا۔ ایک بڑی شہرت کا آدمی جس کی بد سیرتی و بدکرداری سے عام لوگ نفرت کرتے ہوں، اس قابل نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کا امیر بنایا جائے۔

حکم ہے کہ جو شخص امام بنے وہ نماز پڑھانے میں جماعت کے ضعیف لوگوں کا بھی لحاظ رکھے۔ محض جوان مضبوط تندرست اور فرصت والے آدمیوں کو ہی پیش نظر رکھ کر لمبی لمبی قرأت اور لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ کرنے لگے۔ بلکہ یہ بھی خیال رکھے کہ جماعت میں بوڑھے بھی ہیں، بیمار بھی ہیں، کمزور بھی ہیں اور ایسے مشغول آدمی بھی ہیں جو اپنا کام چھوڑ کر نماز کے لئے آئے ہیں۔ اور جن کو نماز سے پھر اپنے کام کی طرف واپس جانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں یہاں تک رحم اور شفقت کا نمونہ پیش فرمایا ہے۔ کہ نماز پڑھاتے میں اگر کسی بچے کے رونے کی آواز آجاتی۔ تو آپ نماز مختصر کر دیتے تھے۔ تاکہ اگر بچے کی ماں جماعت میں شامل ہے تو اسے تکلیف نہ ہو۔ یہ گویا سردار قوم کو تعلیم دی گئی ہے کہ جب وہ سردار بنایا جائے تو جماعت میں اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیئے۔

حکم ہے کہ اگر نماز پڑھانے کے دوران میں امام کو کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے جس کی وجہ سے وہ نماز پڑھانے کے قابل نہ رہے، تو فوراً ہٹ جائے، اور اپنی جگہ پیچھے کے آدمی کو کھڑا کر دے یہاں پھر سردار قوم کے لئے ایک ہدایت ہے اس کا بھی یہی فرض ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو سرداری کے قابل نہ پائے۔ تو خود ہٹ جائے اور دوسرے اہل آدمی کے لئے جگہ خالی کر دے۔ اس میں نہ شرم کا کچھ کام ہے اور نہ خود غرضی کا۔

حکم ہے کہ امام کے فعل کی سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیئے۔ اس کی حرکت سے پہلے حرکت کرنا سخت

ممنوع ہے، حتیٰ کہ جو شخص امام سے پہلے رکوع یا سجدے میں جائے اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز وہ گدھے کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔ یہاں قوم کو سبق دیا گیا ہے کہ اسے اپنے سردار کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے۔ امام اگر نماز میں غلطی کرے، مثلاً جہاں اسے بیٹھنا چاہیے تھا وہاں کھڑا ہو جائے یا جہاں کھڑا ہونا چاہیے تھا وہاں بیٹھ جائے تو حکم ہے کہ سُبحان اللہ کہہ کر اُسے غلطی سے متنبہ کرو سبحان اللہ کے معنی ہیں "اللہ پاک ہے"۔ امام کی غلطی پر سبحان اللہ کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ خطا سے پاک تو بس اللہ ہی کی ذات ہے، تم انسان ہو، تم سے بھول چوک ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں یہ طریقہ ہے امام کو ٹوکنے کا۔

اور جب اس طرح امام کو ٹوکا جائے تو اس کو لازم ہے کہ بلا کسی شرم و لحاظ کے اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور صرف اصلاح ہی نہ کرے بلکہ نماز ختم کرنے سے پہلے اللہ کے سامنے اپنے قصور کے اعتراف میں دو مرتبہ سجدہ بھی کرے البتہ اگر ٹوکے جانے کے باوجود امام کو اس امر کا پورا وثوق ہو کہ اس مقام پر اُسے کھڑا ہی ہونا چاہیے تھا یا بیٹھنا ہی چاہیے تھا، تو وہ اپنے وثوق کے مطابق عمل کر سکتا ہے اس صورت میں جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ امام کا ساتھ دے، اگرچہ وہ اپنی جگہ اس امر کا یقین واثق ہی کیوں نہ رکھتی ہو کہ امام غلطی کر رہا ہے نماز ختم ہو جانے کے بعد مقتدیوں کو حق ہے کہ امام پر اس کی غلطی ثابت کریں، اور اس سے مطالبہ کریں کہ دوبارہ نماز پڑھائے۔

امام کے ساتھ جماعت کا یہ طرزِ عمل تو صرف ان غلطیوں کے بارے میں ہے جو معمولی جزئیات سے تعلق رکھتی ہوں لیکن اگر امام سنت نبوی کے خلاف نماز کی ہیئت اور ترکیب بدل دے، یا قرآن کو تحریف کرکے پڑھے، یا نماز پڑھانے کے دوران میں کفر و شرک یا صریح معصیت کا ارتکاب کرے یا کوئی اور ایسا فعل کرے جس سے معلوم ہو کہ یا تو وہ قانون الٰہی کی پیروی سے منحرف ہو گیا ہے یا اس کی عقل میں فتور آ گیا ہے تو جماعت کا فرض ہے کہ نماز توڑ کر اس سے الگ ہو جائے اور اسے ہٹا کر کسی دوسرے شخص کو امامت کی جگہ قائم کرے۔ پہلی صورت میں امام کی پیروی نہ کرنا جتنا بڑا گناہ ہے، دوسری صورت میں اُس کی

پیروی کرنا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔

بعینہٖ یہی حیثیت بڑے پیمانہ پر قوم اور اس کے سردار کے تعلق کی بھی ہے۔ جب تک سردار اسلامی کانسٹی ٹیوشن کے اندر کام کر رہا ہے۔ اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے نافرمانی کریں گے تو گناہگار ہوں گے زیادہ سے زیادہ وہ اُسے ٹوک سکتے ہیں لیکن اگر ان کے ٹوکنے پر بھی وہ فروعی معاملات میں غلطیاں کرے تو انہیں اس کی اطاعت پر قائم رہنا چاہئے۔ مگر جب وہ اسلامی کانسٹی ٹیوشن کی حدود سے نکل رہا ہو تو پھر وہ مسلمانوں کی جماعت کا امیر نہیں رہ سکتا۔

اب تک نماز کے مقاصد اور اس کے اثرات کی جو تحقیق کی گئی ہے اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس کو اسلام کا رکن اعظم کیوں قرار دیا گیا ہے۔ رکن ستون کو کہتے ہیں جس کے سہارے پر عمارت قائم ہوتی ہے۔ اسلامی زندگی کی عمارت کو قائم ہونے اور قائم رہنے کے لئے جن سہاروں کی ضرورت ہے ان میں سب سے مقدم سہارا یہ ہے کہ مسلمانوں کے افراد میں فرداً فرداً اور ان کی جماعت میں بحیثیت مجموعی وہ اوصاف پیدا ہوں جو خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے اور دنیا میں خلافت الٰہی کا بار سنبھالنے کے لئے ضروری ہیں وہ غیب پر سچا اور زندہ ایمان رکھنے والے ہیں وہ اللہ کو اپنا واحد فرمانروا تسلیم کریں اور اس کے فرض شناس و اطاعت کیش بندے ہوں اسلام کا نظام فکر و نظریہ حیات ان کی رگ رگ میں ایسا پیوست ہو جائے کہ اسی کی بنیاد پر ان میں ایک پختہ سیرت پیدا ہو اور ان کا عملی کردار اسی کے مطابق ڈھل جائے۔ اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر وہ اتنے قابو یافتہ ہوں کہ اپنے ایمان و اعتقاد کے مطابق اُن سے کام لے سکیں۔ ان کے اندر منافقین کی جماعت اگر پیدا ہو گئی ہو یا باہر سے گھس آئی ہو تو وہ اہل ایمان سے الگ ممتاز ہو جائے۔ ان کی جماعت کا نظام اسلام کے اجتماعی اصولوں پر قائم ہو اور ایک مشین کی طرح پیہم متحرک رہے ان میں اجتماعی ذہنیت کارفرما ہو۔ ان کے درمیان محبت ہو، ہمدردی ہو، تعاون، مساوات ہو، وحدتِ روح اور وحدتِ عمل ہو، وہ قیادت اور

گھنٹہ کھانے پینے اور مباشرت کرنے سے رُکا رہتا ہے، اور جب سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نفس کے مطالبات سے یکایک ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور جب افطار کا وقت آتے ہی نفس کے مطلوبات کی طرف اس طرح لپکتا ہے کہ گویا فی الواقع اس کے ہاتھوں اور اس کے مُنہ اور حلق پر کسی اور کی حکومت ہے جس کے بند کرنے سے وہ بند ہوتے اور جس کے کھولنے سے وہ کھُلتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس دوران میں اللہ کی حاکمیت اور اپنی بندگی کا احساس اس پر ہر وقت طاری رہا ہے، اس پورے ایک مہینے کی طویل مدّت میں یہ احساس اس کے شعور یا تحت الشعور سے ایک لمحہ کے لئے بھی غائب نہیں ہُوا، کیونکہ اگر غائب ہو جاتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ ضابطہ کو توڑنے سے باز رہ جاتا۔

اطاعتِ امر | احساسِ بندگی کے ساتھ خود بخود جو چیز لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کے حکم کی اطاعت کرے۔

ان دونوں چیزوں میں ایسا فطری اور منطقی تعلق ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے۔ نہ ان کے درمیان کبھی تناقض کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے اس لئے کہ اطاعت دراصل نتیجہ ہی اعترافِ خداوندی کا ہے۔ آپ کسی کی اطاعت کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اس کی خداوندی[1] نہ مان لیں۔ اور جب حقیقت میں کسی کی خداوندی آپ مان چکے ہوں تو اس کی بندگی

---

[1] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ناظرین چند اصطلاحات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں فارسی زبان میں لفظ خدا اور خداوند کے وہی معنی ہیں جو عربی میں الٰہ و رب کے معنی ہیں۔ انگریزی میں چھوٹے حرف کے ساتھ (god) کا بھی قریب قریب یہی مفہوم ہے۔ ہندی میں دیو یا دیوتا کے الفاظ بھی اسی کے قریب المعنیٰ ہیں ان تمام الفاظ کا استعمال دنیا کی مختلف قومیں ایسی ہستیوں کے متعلق کرتی رہی ہیں جن کے ہاتھ میں انسان کو نفع اور نقصان پہنچانے کے اختیارات ہیں، جن کا حکم اس کائنات کے نظام میں چھوٹے یا بڑے پیمانے پر چلتا ہو جن کی بندگی بجالانے پر ہی انسان کی فلاح و کامرانی موقوف ہو۔ جاہل قوموں کا ہمیشہ یہ گمان رہا ہے اور اب بھی ہے کہ ایسی ہستیاں بہت بلکہ بے شمار ہیں۔ اور ان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸ پر دیکھیے)

واطاعت سے کسی طرح باز بھی نہیں رہ سکتے۔ انسان نہ اتنا احمق ہے کہ خواہ مخواہ کسی کا حکم مانتا چلا جائے۔ درانحالیکہ وہ اس کے حق حکمرانی کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اور نہ انسان میں اتنی جرأت موجود ہے کہ جس کو فی الواقع وہ اپنے قلب و روح میں حاکم ذی اقتدار سمجھتا ہو، اور جسے نافع وضار اور پروردگار مانتا ہو اس کی اطاعت سے منہ موڑ جائے۔ پس درحقیقت خداوندی کے اعتراف اور بندگی واطاعت کے عمل میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے۔ اور یہ عین عقل و منطق کا تقاضا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ہر پہلو سے کامل توافق ہو۔ آفاقی و خداوندی میں توحید لامحالہ بندگی واطاعت میں توحید پر منتج ہوگی، اور آفاقی و خداوندی میں شرک کا نتیجہ لازماً بندگی واطاعت میں شرک ہوگا۔ آپ ایک کو خداوند سمجھیں گے تو ایک ہی کی بندگی بھی کریں گے۔ دس کی خداوندی تسلیم کریں گے تو بندگی واطاعت کا رُخ بھی ان دسوں کی طرف پھریگا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ خداوندی تو ایک کی مان رہے ہوں اور بندگی دس کی بجا لائیں، یا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) میں صرف غیر انسانی وجود مثلاً فرشتے اور جن ہی شامل نہیں ہیں بلکہ بعض انسان مثلاً بادشاہ اولیا اور غیر معمولی کمالات دکھانے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ اسی لئے قریب قریب سب زبانوں میں ان الفاظ کی جمع آتی ہے۔ چنانچہ عربی میں الٰہ اور ارباب، فارسی میں خدایگان اور خداوندان، انگریزی میں (gods) اور ہندی میں دیویوں اور دیوتاؤں کے الفاظ جمع کے ساتھ آتے ہیں۔ مگر ان سب سے اوپر ایک ایسی ہستی کا تصور بھی تمام قوموں میں رہا ہے۔ جو ساری کائنات کی خالق ہے۔ اور جو سب سے بالاتر ہے۔ عربی میں اللہ، فارسی میں خدائے خدایگان انگریزی میں بڑے حرف کے ساتھ (God) اور ہندی میں مہادیو اسی ہستی کے نام ہیں۔ اور اس کے نام کی جمع کسی زبان میں نہیں آتی۔ اسلام جس چیز کی دعوت دیتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جن اختیارات واقتدارات کے لئے تم الٰہ اور خداوند وغیرہ الفاظ بولتے ہو وہ تنہا اسی ایک ہستی کے ہاتھ میں ہیں۔ ساری کائنات میں صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ تمہارا نفع اور نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور جن جن کو تم اس سلطنت میں ذی اقتدار سمجھ کر خدا اور خداوند اور دیوتا مانتے ہو وہ سب تمہاری ہی طرح اس کے بندے ہیں۔ حقیقی اقتدار میں ان کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں لہٰذا الٰہ اور رب اور خداوند اور دیوتا وہ سب نہیں بلکہ صرف وہی ایک ہے جس کو تم اللہ اور دوسرے ہم معنی الفاظ سے یاد کرتے ہو۔ اس تعلیم کے لحاظ سے اصطلاحات میں جو فرق واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ غیر مسلم کے لئے تو وہی پچھلی اصطلاحیں برقرار رہینگی۔ اور وہ چھوٹے خداؤں اور بڑے خدا کے لئے الگ الگ الفاظ استعمال کریگا مگر مسلمان کے لئے الٰہ اور رب بھی ہوگا جو اللہ ہے گاڈ صرف بڑے حرف کے ساتھ باقی رہیگا۔ اور چھوٹے حرف سے اس کا استعمال نہ ہوگا، دیوا اور دیوتا کے الفاظ مہادیو میں ضم ہوجائیں گے۔ خدا اور خداوند کے الفاظ صرف خداوند عالم کے ساتھ خاص ہوجائیں گے۔ اور ان میں سے کسی لفظ کی جمع استعمال نہ کی جائیگی ۔

خداوندی وہ کس کی تسلیم کر رہے ہوں اور اطاعت ایک کی کریں۔

ذاتِ خداوند کا تعین لامحالہ سمتِ بندگی کے تعین پر منتج ہو گا۔ آپ جس کی خداوندی کا اعتراف کریں گے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریں گے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ خداوند ایک کو مانیں اور اطاعت دوسرے کی کریں۔ تعارض کا امکان زبانی اعتراف اور واقعی بندگی میں تو ضرور ممکن ہے مگر قلبی وروحی حقیقی احساس و شعور اور جوارح کے عمل میں ہرگز ممکن نہیں کوئی عقل اس چیز کا تصور نہیں کر سکتی کہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہے ہیں اس کے بجائے آپ کی بندگی کا رُخ کسی ایسی ہستی کی طرف پھر سکتا ہے جس کا بندہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو نہ سمجھتے ہوں بخلاف اس کے عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس کی طرف بھی آپ کی بندگی کا رُخ پھر رہا ہے اسی کی خداوندی کا نقش دراصل آپ کے ذہن پر مرتسم ہے خواہ زبان سے آپ اس کے سوا کسی اور کی خداوندی کا اظہار کر رہے ہوں۔

خداوندی کے اعتراف اور بندگی کے احساس میں کمی وبیشی لازماً اطاعت امر کی کمی وبیشی پر منتج ہوگی کسی کے خدا ہونے ...... اور اپنے بندہ ہونے کا احساس آپ کے دل میں جتنا زیادہ شدید ہوگا اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ آپ اس کی اطاعت کریں گے اور اس احساس میں جتنی کمزوری ہوگی، اتنی ہی اطاعت میں کمی واقع ہو جائیگی، حتٰی کہ اگر یہ احساس بالکل نہ ہو تو اطاعت بھی بالکل نہ ہوگی۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام کا مدعا اللہ کی خداوندی کا اقرار کرانے اور اس کے سوا ہر ایک کی خداوندی کا انکار کرا دینے سے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرے جب وہ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ[1] الْخَالِصُ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اطاعت خالصاً ومخلصاً صرف اللہ کیلئے ہے

---

[1] لفظ "دین" کے اصلی معنی اطاعت کے ہیں۔ اور مذہب وملت کے لئے اس لفظ کا استعمال مجازاً اس بنا پر ہوتا ہے کہ مذہب وملت دراصل ایک نظامِ اطاعت کا نام ہے جس کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد آدمی ایک قانون اور ضابطہ کی فرمانبرداری اختیار کر لیتا ہے۔

کسی دوسری مستقل بالذات اطاعت کی آمیزش اس کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جب وہ کہتا ہے کہ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرنے پر انسان مامور ہے، اور اس کی بندگی کرنے کی شرط یہ ہے کہ انسان اس کی اطاعت کے ساتھ کسی دوسرے کی اطاعت مخلوط نہ کرے۔ جب وہ کہتا ہے کہ قَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کی اطاعت پوری کی پوری اللہ ہی کے لئے وقف ہے اور ہر اس طاقت سے مسلمان کی جنگ ہے جو اس اطاعت میں حصہ بٹانا چاہتی ہو، جس کا مطالبہ یہ ہو کہ مسلمان خداوند عالم کے ساتھ ساتھ اس کی اطاعت بھی کرے یا خداوند عالم کے بجائے صرف اسی کی اطاعت کرے۔ پھر جب وہ یہ کہتا ہے کہ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ تو اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب ہو، اطاعت اور بندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور سارے پہلوؤں کے ساتھ اطاعت الٰہی کے نیچے آ جائے، جس کی فرمانبرداری بھی ہو خداوند عالم کی اجازت کے تحت ہو، اور جس فرمانبرداری کے لئے وہاں سے حکم یا سند جواز نہ ملے اس کا بند کاٹ ڈالا جائے، یہ اس دین حق اور اس ہدایت کا تقاضا ہے جو اللہ اپنے رسول کے ذریعے بھیجتا ہے۔ اس تقاضے کے مطابق خواہ انسان کے ماں باپ ہوں، خواہ خاندان اور سوسائٹی ہو .... خواہ قوم اور حکومت ہو، خواہ امیر یا لیڈر رہو، خواہ علماء اور مشائخ ہوں، خواہ وہ شخص یا ادارہ ہو جس کی ملازمت کر کے پیٹ پالتا ہے اور خواہ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشات ہوں، کسی کی اطاعت بھی خداوند عالم کی اصلی اور بنیادی اطاعت کی قید سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ جو اس کی خداوندی کا اقرار کر چکا اور جس نے اس کے لئے اپنی بندگی کو خالص کر لیا وہ جس کی اطاعت بھی کرے گا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ماتحت رہ کر کریگا جس حد تک جس کی بات ماننے کی وہاں سے اجازت ہوگی، اسی حد تک مانے گا۔ اور جہاں اجازت کی حد ختم ہو جائے گی، وہاں وہ

ہر ایک کا باغی اور صرف اللہ کا فرمانبردار نکلے گا۔

روزے کا مقصد آدمی کو اسی اطاعت کی تربیت دینا ہے۔ وہ مہینہ بھر تک روزانہ کئی کئی گھنٹے آدمی کو اس حالت میں رکھتا ہے کہ اپنی بالکل ابتدائی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی اس کو خداوند عالم کے اذن واجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے غذا کا ایک بھورا اور پانی کا ایک قطرہ تک، وہ حلق سے گزار نہیں سکتا جب تک کہ وہاں سے اجازت نہ ملے ایک ایک چیز کے استعمال کے لئے وہ شریعت خداوندی کی طرف دیکھتا ہے۔ جو کچھ وہاں حلال ہے وہ اس کے لئے حلال ہے خواہ تمام دنیا اسے حرام کرنے پر متفق ہو جائے، اور جو کچھ وہاں حرام ہے وہ اس کے لئے حرام ہے خواہ ساری دنیا مل کر اسے حلال کر دے۔ اس حالت میں خدائے واحد کے سوا کسی کا اذن اس کے لئے اذن نہیں، کسی کا حکم اس کے لئے حکم نہیں، اور کسی کی نہی اس کے لئے نہی نہیں۔ خود اپنے نفس کی خواہش سے لیکر دنیا کے ہر انسان اور ہر ادارے تک کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جس کے حکم سے مسلمان رمضان میں روزہ چھوڑ سکتا ہو یا توڑ سکتا ہو اس معاملہ میں نہ بیٹے پر باپ کی اطاعت ہے، نہ بیوی پر شوہر کی، نہ ملازم پر آقا کی، نہ رعیت پر حکومت کی، نہ پیرو پر لیڈر یا امام کی، مرید پر پیر کی، بالفاظ دیگر اللہ کی بڑی اور اصلی اطاعت تمام اطاعتوں کو کھا جاتی ہے اور، ۲۰ گھنٹے کی اس طویل مشق و تمرین سے روزہ دار کے دل پر کالنقش فی الحجر یہ سکہ بیٹھ جاتا ہے کہ ایک ہی مالک کا وہ بندہ ہے ایک ہی قانون کا وہ پیرو ہے اور ایک ہی اطاعت کا حلقہ اس کی گردن میں پڑا ہے۔

اس طرح یہ روزہ انسان کی فرمانبرداریوں اور اطاعتوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر ایک مرکزی اقتدار کی جانب پھیر دیتا ہے اور تیس دن تک روزانہ بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے تک اسی سمت میں جمائے رکھتا ہے تاکہ اپنی بندگی کے مرجع اور اپنی اطاعت کے مرکز کو وہ اچھی طرح متحقق کرلے اور رمضان کے بعد جب اس ڈسپلن کے بند کھولے جائیں تو اس کی اطاعتیں اور فرمانبرداریاں بکھر کر مختلف مرجعوں

کی طرف بھٹک نہ جائیں اطاعت امر کی اس تربیت کے لئے بظاہر انسان کی صرف دو خواہشوں دینے غذا لینے کی خواہش اور صنفی خواہش) کو چھانٹ لیا گیا ہے اور ڈسپلن کی ساری پابندیاں صرف انہی دو پر لگائی گئی ہیں، لیکن روزے کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی پر اس حالت میں خدا کی خداوندی اور اپنی بندگی و غلامی کا احساس پوری طرح طاری ہو جائے اور وہ ایسا مطیع امر ہو کر یہ ساعتیں گذارے کہ ہر اُس چیز سے رُکے جس سے خدا نے روکا ہے اور ہر اس کام کی طرف دوڑے جس کا حکم خدا نے دیا ہے روزے کی فرضیت کا اصل مقصد اسی کیفیت کو پیدا کرنا اور نشو ونما دینا ہے نہ کہ محض کھانے، پینے اور مباشرت سے روکنا۔ لہٰذا یہ کیفیت جتنی زیادہ ہو روزہ اتنا ہی مکمل ہے، اور جتنی اس میں کمی ہو اتنا ہی وہ ناقص ہے، حتیٰ کہ اگر کسی آدمی نے روزہ اس احمقانہ طریقہ سے رکھا کہ جن جن چیزوں سے روزہ ٹوٹتا ہے ان سے تو پرہیز کرتا رہا، اور باقی تمام اُن افعال کا ارتکاب کئے چلا گیا جنہیں خدا نے حرام کیا ہے تو اس کے روزے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک مردہ لاش کہ اس میں وہ اعضا تو سب کے سب موجود ہیں جن سے صورت انسانی بنتی ہے مگر جان نہیں ہے جس کی وجہ سے انسان، انسان ہے۔ جس طرح اس بے جان لاش کو کوئی شخص انسان نہیں کہہ سکتا اسی طرح اس بے روح روزے کو بھی کوئی روزہ نہیں کہہ سکتا۔ یہی بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ

من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ کو اس کی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا چھوڑ دے اور پینا چھوڑ دے

جھوٹ بولنے کے ساتھ " جھوٹ پر عمل کرنے" کا لفظ جو ارشاد فرمایا گیا ہے یہ بڑا ہی معنی خیز ہے دراصل یہ لفظ تمام نافرمانیوں کا جامع ہے۔ جو شخص خدا کو خدا کہتا ہے اور پھر اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ وہ حقیقت میں اپنے اقرار کی تکذیب کرتا ہے۔ روزے کا اصل مقصد تو عمل سے اس اقرار کی تصدیق ہی کرنا تھا مگر جب وہ روزے کے دوران میں اسی کی تکذیب کرتا رہا تو پھر روزے میں بھوک

پیاس کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ حالانکہ خدا کو اس کے خالی معدہ کی کوئی حاجت نہ تھی۔ اسی بات کو دوسرے انداز میں حضورؐ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

كم من صائم ليس له من صيامه الا الظمأ وكم من قائم ليس له من قيامه الا السهر

کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور کتنے ہی راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں جنہیں اس قیام سے رتجگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اور یہی بات ہے جس کو خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح تر الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ:-

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے توقع ہے کہ اس ذریعہ سے تم تقویٰ کرنے لگو گے۔

یعنی روزے فرض کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ تقویٰ کے اصل معنی حذر اور خوف کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد خدا سے ڈرنا اور اس کی نافرمانی سے بچنا ہے۔ اس لفظ کی بہترین تفسیر جو میری نظر سے گزری ہے، وہ ہے جو حضرت اُبی بن کعب نے بیان کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا "تقویٰ کسے کہتے ہیں؟" انہوں نے عرض کیا، "امیر المومنین! آپ کو کبھی کسی ایسے رستے سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں اور رستہ تنگ ہو؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا "بارہا"۔ انہوں نے پوچھا "تو ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں اپنا دامن سمیٹ لیتا ہوں اور بچتا ہوا چلتا ہوں کہ دامن کانٹوں میں نہ اُلجھ جائے"۔ حضرت اُبی نے کہا "بس اسی کا نام تقویٰ ہے"۔ زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے، دونوں طرف افراط اور تفریط، خواہشات اور میلاناتِ نفس، وساوس اور ترغیبات، گمراہیوں اور نافرمانیوں کی خاردار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس راستہ پر کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے چلنا اور اطاعتِ حق کی راہ سے ہٹ کر بداندیشی و بدکرداری کی جھاڑیوں میں نہ اُلجھنا، یہی تقویٰ ہے اور یہی تقویٰ پیدا کرنے

کے لئے اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کئے ہیں یہ ایک متقوی دوا ہے۔ جس کے اندر خدا ترسی و راست روی کی قوت بخشنے کی خاصیت ہے۔ مگر فی الواقع اس سے یہ قوت حاصل کرنا انسان کی اپنی استعداد پر موقوف ہے اگر آدمی روزے کے مقصد کو سمجھے، اور جو قوت روزہ دیتا ہے۔ اس کو لینے کے لئے تیار ہو اور روزہ کی مدد سے اپنے اندر خوفِ خدا اور اطاعت امر کی صفت کو نشو و نما دینے کی کوشش کرے تو یہ چیز اس میں اتنا تقویٰ پیدا کر سکتی ہے کہ صرف رمضان ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی سال کے باقی گیارہ مہینوں میں زندگی کی سیدھی شاہراہ پر دونوں طرف کی خاردار جھاڑیوں سے دامن بچائے ہوئے چل سکتا ہے اس صورت میں اس کے لئے روزے کے نتائج (ثواب) اور منافع (اجر) کی کوئی حد نہیں۔ لیکن اگر وہ اصل مقصد سے غافل ہو کر محض روزہ نہ توڑنے ہی کو روزہ رکھنا سمجھے اور تقویٰ کی صفت حاصل کرنے کی طرف توجہ ہی نہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے نامۂ اعمال میں بھوک پیاس اور رت جگے کے سوا اور کچھ نہیں پا سکتا۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

كل عمل ابن آدم يضاعف الحسنة بعشر امثالها الى سبع مائة ضعف قال الله تعالى الا الصوم فانه لى و انا اجزى به۔

آدمی زادے کا ہر عمل خدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے ایک نیکی دس گنی سے سات سو گنی تک پھلتی پھولتی ہے۔ مگر اللہ فرماتا ہے کہ روزہ مستثنیٰ ہے وہ میری مرضی پر موقوف ہے جتنا چاہوں اس کا بدلہ دوں۔

یعنی روزے کے معاملہ میں بالیدگی و افزودگی کا امکان بے حد و حساب ہے۔ آدمی اس سے تقویٰ حاصل کرنے کی جتنی کوشش کرے اتنا ہی وہ بڑھ سکتا ہے صفر کے درجہ سے لے کر اوپر لاکھوں، کروڑوں، اربوں گنے تک وہ جا سکتا ہے بلکہ بلا نہایت ترقی کر سکتا ہے پس یہ معاملہ چونکہ آدمی کی اپنی استعداد اخذ و قبول پر منحصر ہے کہ روزے سے تقویٰ حاصل کرے یا نہ کرے، اور کرے تو کس حد تک کرے، اس وجہ سے آیت مذکورۂ بالا میں یہ نہیں فرمایا کہ روزے رکھنے سے تم یقیناً متقی بن جاؤ گے ——— بلکہ

لعلکم تتقون[1] کا لفظ استعمال فرمایا جس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ توقع کی جاتی ہے یا ممکن ہے کہ اس ذریعہ سے تم تقویٰ کرنے لگو۔

تعمیر سیرت:۔ یہ تقویٰ ہی دراصل اسلامی سیرت کی جان ہے جس نوعیت کا کیرکٹر اسلام ہر مسلمان فرد میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کا اساسی تصور اسی لفظ تقویٰ کے لفظ میں پوشیدہ ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل اس لفظ کا مفہوم بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص طرز کی شکل و وضع بنا لینا چند مشہور نمایاں گناہوں سے بچنا اور بعض ایسے مکروہات سے پرہیز کرنا جنہوں نے عوام کی نگاہ میں اہمیت اختیار کر لی ہے بس اسی کا نام تقویٰ ہے حالانکہ دراصل یہ ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے قرآن مجید انسانی طرزِ خیال و طرزِ عمل کو اصولی حیثیت سے دو بڑی قسموں پر تقسیم کرتا ہے:۔

ایک قسم وہ ہے جس میں انسان:

(۱) دنیوی طاقتوں کے ماسوا کسی بالاتر اقتدار کو اپنے اوپر نگران نہیں سمجھتا اور یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے کسی فوق البشر حاکم کے سامنے جواب دہی نہیں کرنی ہے۔

(۲) دنیوی زندگی ہی کو زندگی، دنیوی فائدے ہی کو

دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان

(۱) اپنے آپ کو ایک ایسے بالاتر حکمران کا تابع اور اس کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے اور یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے ایک روز اپنی دنیوی زندگی کے پورے کارنامے کا حساب اس حاکم کو دینا ہے۔

(۲) دنیوی زندگی کو اصل حیات انسانی کا صرف ایک ابتدائی

---

[1] عام طور پر لوگ اس لفظ کا ترجمہ "تاکہ" کرتے ہیں مگر یہ لغت کے اعتبار سے درست نہیں لعل کا لفظ عربی میں امید، توقع، اندیشہ اور امکان یا وثوق کا مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بخلاف اس کے تاکہ میں محض تعلیل یا غرضیت کا مفہوم ہے اگر اللہ تعالیٰ کو صرف غرضیت صوم کی غرض ہی بیان کرنی ہوگی۔ تو لعلکم تتقون کے بجائے لتکونوا من المتقین فرمایا ہوتا شاید لوگ اس موقعہ پر کلمۂ شک کو دیکھ کر اس کی حکمت نہ سمجھ سکے اس لئے انہوں نے لعل کا ترجمہ "تاکہ" کر دیا تاکہ صحیح ترجمہ سے جو بات بنتی نظر آتی تھی وہ غلط ترجمہ سے چھپ جائے۔

فائدہ اور دنیوی نقصان سمجھتا ہے اور اس بنا پر کسی طریقے کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ صرف دنیوی فائدے اور نقصان ہی کے لحاظ سے کرتا ہے	مرحلہ سمجھتا ہے اور ان فوائد و نقصانات کو جو اس مرحلہ میں ظاہر ہوتے ہیں عارضی اور دھوکہ دینے والے نتائج خیال کرتا ہے اور اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ ان مستقبل کے فائدوں اور نقصانات کی بنا پر کرتا ہے جو آخرت کی پائدار زندگی میں ظاہر ہوں گے۔
(۳) مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی فضائل کو بے وقعت سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی نقصانات کو ہلکا خیال کرتا ہے۔	(۳) مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی فضائل کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ اور مادی نقصانات کی بہ نسبت اخلاقی و روحانی نقصانات کو شدید تر خیال کرتا ہے۔
(۴) کسی مستقل اخلاقی دستور کی پابندی نہیں کرتا بلکہ موقع و محل کے لحاظ سے خود ہی اخلاقی اصول وضع کرتا ہے اور دوسرے موقع پر خود ہی ان کو بدل دیتا ہے	(۴) ایک ایسے مستقل اخلاقی دستور کی پابندی کرتا ہے جس میں اپنی اغراض و مصالح کے لحاظ سے اس کو ترمیم و تنسیخ کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔

ان میں سے پہلی قسم کے طرزِ خیال و طرزِ عمل کا جامع نام قرآن نے "فجور"[1] رکھا ہے۔ اور دوسرے طرزِ خیال و عمل کو وہ "تقویٰ"[2] کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ دراصل زندگی کے دو مختلف راستے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں اور اپنے نقطۂ آغاز سے لیکر نقطۂ انجام تک کہیں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ فجور کے راستے کو اختیار کرکے آدمی کی پوری زندگی اپنے تمام اجزاء اور تمام شعبوں کے ساتھ ایک خاص ڈھنگ پر لگ جاتی ہے جس میں تقویٰ کی ظاہری اشکال تو کہیں نظر آسکتی ہیں، مگر تقویٰ کی اسپرٹ کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا، کیونکہ فجور کے تمام فکری اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط رکھتے ہیں،

---

[1] آج کل کی اصطلاحوں میں ہم اسے مادہ پرستی، افادیت، مصلحت پرستی اور ابن الوقتی کے ناموں سے موسوم کر سکتے ہیں۔ [2] مغربی ذہن چونکہ اس طرزِ خیال سے بڑی حد تک بیگانہ ہے اس لئے جدید زمانہ کی اصطلاحوں میں ایسے الفاظ مشکل سے مل سکیں گے جو تقویٰ کے مفہوم کو ادا کر سکیں۔

اور تقویٰ کے فکری اجزا میں سے کسی چیز کو بھی ان کے اس مروجہ نظام میں راہ نہیں مل سکتی۔ برعکس اس کے تقویٰ کا راستہ اختیار کر کے انسان کی پوری زندگی کا ڈھنگ کچھ اور ہوتا ہے، وہ ایک دوسرے ہی طرز پر سوچتا ہے، دنیا کے ہر معاملہ اور ہر مسئلہ کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور ہر موقع و محل پر ایک دوسرا ہی طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ ان دونوں راستوں کا فرق صرف انفرادی زندگی ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی اس کا اتنا ہی تعلق ہے۔ جو جماعت فاجر افراد پر مشتمل ہوگی یا جس میں فاجرین کی اکثریت ہوگی اور اہل فجور کے ہاتھ میں جس کی قیادت ہوگی اس کا پورا تمدن فاجرانہ ہوگا۔ اس کی معاشرت میں، اس کے اخلاقیات میں، اس کے معاشیات میں، اس کے نظام تعلیم و تربیت میں، اس کی سیاست میں، اس کے بین الاقوامی رویہ میں، غرض اس کی ہر چیز میں فجور کی روح کارفرما ہوگی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اس کے اکثر یا بعض افراد ذاتی خود غرضیوں اور منفعت پرستیوں سے بالاتر نظر آئیں مگر زیادہ سے زیادہ جس بلندی پر وہ چڑھ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو اس قوم کے مفاد میں گم کر دیں جس کی ترقی سے ان کی اپنی ترقی اور جس کے تنزل سے ان کا اپنا تنزل وابستہ ہے لہٰذا اگر شخصی سیرت میں فجور کا رنگ کم بھی ہو تو اس سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ قومی رویہ بہرحال افادیت، ابن الوقتی مصلحت پرستی اور مادہ پرستی ہی کے اصولوں پر چلے گا۔ اسی طرح تقویٰ بھی محض انفرادی چیز نہیں ہے جب کوئی جماعت متقین پر مشتمل ہوتی ہے یا اس میں اہل تقویٰ کی کثرت ہوتی ہے اور متقی ہی اس کے رہنما ہوتے ہیں تو اس کے پورے اجتماعی رویہ میں ہر حیثیت سے خدا ترسی کا رنگ ہوتا ہے وہ وقتی اور ہنگامی مصلحتوں کے لحاظ سے اپنا طرز عمل مقرر نہیں کرتی۔ بلکہ ایک مستقل دستور کی پیروی کرتی ہے۔ اور ایک اعلیٰ نصب العین کے لئے اپنی تمام مساعی وقف کر دیتی ہے قطع نظر اس کے کہ دنیوی نظام سے قوم کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے، یا کیا نقصان پہنچتا ہے۔ وہ مادی فائدوں کے پیچھے نہیں دوڑتی بلکہ پائدار اخلاقی و روحانی منافع کو اپنا مطمح نظر بناتی ہے۔ وہ مواقع کے لحاظ سے اصول توڑتی اور بناتی

نہیں ہے بلکہ ہر حال میں اصولِ حق کا اتباع کرتی ہے، کیونکہ اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کی مدِمقابل قوموں کی طاقت کم ہے یا زیادہ، بلکہ اوپر جو خدا موجود ہے وہ اس سے ڈرتی ہے۔ اور اس کے سامنے کھڑے ہوکر جواب دہی کرنے کا جو وقت بہرحال آناہے اس کی فکر اُسے کھائے جاتی ہے۔

اسلام کے نزدیک دنیا میں فساد کی جڑ اور انسانیت کی تباہی و بربادی کا اصلی سبب "فجور" ہے وہ اس فجور کے سانپ کو ہلاک کردینا چاہتا ہے یا کم سے کم اس کے زہریلے دانت توڑ دینا چاہتا ہے تاکہ اگر یہ سانپ جیتا رہے تب بھی انسانیت کو ڈسنے کی طاقت اس میں باقی نہ رہے اس کام کے لئے وہ نوعِ انسانی میں سے ان لوگوں کو چُن چُن کر نکالنا اور اپنی پارٹی میں بھرتی کرنا چاہتا ہے جو متقیانہ رجحانِ طبع رکھتے ہوں۔ فجور کی جانب ذہنی رجحان رکھنے والے لوگ اس کے کسی کام کے نہیں خواہ وہ اتفاقاً مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوگئے ہوں اور مسلم قوم کے درد میں کتنے ہی تڑپتے ہوں اسے دراصل ضرورت ان لوگوں کی ہے جن میں خود اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جو آپ اپنا حساب لینے والے ہوں، جو خود اپنے دل کی نیتوں اور ارادوں پر نظر رکھیں جن کو قانون کی پابندی کے لئے کسی خارجی دباؤ کی حاجت نہ ہو بلکہ جوان کے اپنے باطن میں ایک محاسب اور آمر بیٹھا ہو جو انہیں اندر سے قانون کا پابند بناتا ہو اور ایسی قانون شکنی پر بھی روکتا ٹوکتا ہو جس کا علم کسی پولیس، کسی عدالت اور کسی رائے عام کو نہیں ہوسکتا۔ وہ ایسے افراد چاہتا ہے جنہیں یقین ہو کہ ایک آنکھ ہر حال میں انہیں دیکھ رہی ہے، جنہیں خوف ہو کہ ایک عدالت کے سامنے بہرحال انہیں جانا ہے، جو دنیوی منافع کے بندے، ہنگامی مصالح کے غلام اور شخصی یا قومی اغراض کے پرستار نہ ہوں، جن کی نظر آخرت کے اصلی و حقیقی نتائج پر جمی ہوئی ہو، جن کو دنیا کے بڑے سے بڑے فائدے کا لالچ یا سخت سے سخت نقصان کا خوف بھی خداوند عالم کے دیئے ہوئے نصب العین اور اس کے بتائے ہوئے اصولِ اخلاق سے نہ ہٹا سکتا ہو، جن کی تمام سعی و کوشش صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو جنہیں

اس امر کا پختہ یقین ہو کہ پایان کار بندگی حق ہی کا نتیجہ بہتر اور بندگی باطل ہی کا انجام برا ہوگا، چاہے اس دنیا میں معاملہ برعکس ہو پھر اس کو جن آدمیوں کی تلاش ہے وہ ایسے آدمی ہیں جن کے اندر اتنا صبر موجود ہو کہ ایک صحیح اور بلند نصب العین کے لئے برسوں بلکہ ساری ساری عمر لگاتار سعی بے حاصل کر سکتے ہوں جن میں اتنی ثابت قدمی ہو کہ غلط راستوں کی آسانیاں، فائدے، اور لطف و لذت کوئی چیز بھی ان کو اپنی طرف نہ کھینچ سکتی ہو، جن میں اتنا تحمل ہو کہ حق کے راستے پر چلنے میں خواہ کسی قدر ناکامیوں، مشکلات، خطرات، مصائب اور شدائد کا سامنا ہو، ان کا قدم نہ ڈگمگائے، جن میں اتنی یکسوئی ہو کہ ہر قسم کی عارضی اور ہنگامی مصلحتوں سے نگاہ پھیر کر اپنے نصب العین کی طرف بڑھے چلے جائیں، جن میں اتنا توکل موجود ہو کہ حق پرستی و حق کوشی کے دیر طلب اور دور رس نتائج کے لئے خداوند عالم پر بھروسہ کر سکیں۔ خواہ دنیا کی زندگی میں اس کام کے نتائج سرے سے برآمد ہوتے نظر ہی نہ آئیں۔ ایسے ہی لوگوں کی سیرت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اور جو کام اسلام اپنی پارٹی سے لینا چاہتا ہے اس کے لئے ایسے ہی قابل اعتماد کارکنوں کی ضرورت ہے۔

تقویٰ کی اس صفت کا ہیولیٰ (ابتدائی جوہر) جن لوگوں میں موجود ہو، ان کے اندر اس صفت کو نشو ونما دینے اور اسے مستحکم کرنے کے لئے روزے سے زیادہ طاقتور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ روزے کے ضابطہ پر ایک نگاہ ڈالئے۔ آپ پر خود منکشف ہونے لگے گا کہ یہ چیز کس مکمل طریقہ سے ان صفات کو بالیدگی اور پائیداری بخشتی ہے۔ ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ روزہ خدا نے تم پر فرض کیا ہے۔ صبح سے شام تک کچھ نہ کھاؤ نہ پیو، کوئی چیز حلق سے اتاروگے تو تمہارا روزہ ٹوٹ جائے گا۔ لوگوں کے سامنے کھانے پینے سے اگر تم نے پرہیز کیا اور در پردہ کھاتے پیتے رہے تو خواہ لوگوں کے نزدیک تمہارا شمار روزہ داروں میں ہو مگر خدا کے نزدیک نہ ہوگا۔ تمہارا روزہ صحیح صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ خدا کے لئے رکھو، ورنہ دوسری کسی غرض مثلاً صحت تندرستی یا نیک

نامی کے لئے رکھوگے تو خدا کی نگاہ میں اس کی کوئی قیمت نہیں خدا کے لئے اپنا روزہ پورا کروگے تو اس دنیا میں کوئی انعام نہ ملے گا اور توڑ دوگے یا نہ رکھوگے تو یہاں کوئی سزا نہ دی جائیگی، مرنے کے بعد جب خدا کے سامنے پیش ہوگے اسی وقت انعام بھی ملیگا اور اسی وقت سزا بھی دے جائیگی۔

یہ چند ہدایات دیکر آدمی کو چھوڑ دیا جاتا ہے، کوئی سپاہی، کوئی ہرکارہ، کوئی سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی اس پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ کہ ہر وقت اس کی نگرانی کرے۔ زیادہ سے زیادہ رائے عام اپنے دباؤ سے اس کو اس حد تک مجبور کرسکتی ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے کچھ نہ کھائے پیئے مگر چوری چھپے کھانے پینے سے اس کو روکنے والا کوئی نہیں۔ اور اس بات کا حساب لینا تو کسی رائے عام یا کسی حکومت کے بس میں نہیں کہ وہ رضائے الٰہی کی نیت سے روزہ رکھ رہا ہے۔ یا کسی اور نیت سے۔ ایسی حالت میں جو شخص روزے کی تمام شرائط پوری کرتا ہے، غور کیجئے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھرتی ہیں:۔

۱۔ اس کو خداوند عالم کی ہستی کا، اس کے عالم الغیب ہونے کا، اس کے قادر مطلق ہونے کا اور اس کے سامنے اپنے محکوم اور جوابدہ ہونے کا کامل یقین ہے۔ اور اس پوری مدت میں جبکہ وہ روزے سے رہا ہے اس کے یقین میں ذرا تزلزل نہیں آیا۔

۲۔ اس کو آخرت پر، اس کے حساب کتاب پر اور اس کی جزا و سزا پر پورا الیقین ہے اور یہ یقین بھی کم از کم ان بارہ چودہ گھنٹوں میں برابر غیر متزلزل رہا ہے جبکہ وہ اپنے روزے کی شرائط پوری کر رہا تھا۔

۳۔ اس کے اندر خود اپنے فرض کا احساس ہے وہ آپ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے۔ وہ اپنی نیت کا خود محتسب ہے۔ اپنے دل کے حال پر خود نگرانی کرتا ہے خارج میں قانون شکنی یا گناہ کا صدور ہونے سے پہلے نفس کی اندرونی تہوں میں اس کی خواہش پیدا ہوتی ہے اسی وقت وہ اپنی قوت ارادی سے اس کا استیصال کر دیتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ پابندی قانون کے لئے خارج میں کسی دباؤ کا وہ محتاج نہیں ہے

۴۔ مادیت اور اخلاق و روحانیت کے درمیان انتخاب کا جب اسے موقع دیا گیا تو اس نے اخلاق و روحانیت کو انتخاب کیا۔ دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اس کے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی۔ اس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ اخلاقی فائدے کی خاطر مادی نقصان و تکلیف کو اس نے گوارا کیا، اور آخرت کے نفع کی خاطر دنیوی مضرت کو قبول کر لیا۔

۵۔ وہ اپنے آپ کو اس معاملہ میں آزاد نہیں سمجھتا کہ اپنی سہولت دیکھ کر اچھے موسم، مناسب وقت اور فرصت کے زمانہ میں روزہ رکھے، بلکہ جو وقت قانون میں مقرر کر دیا گیا ہے اسی وقت روزہ رکھنے پر وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے خواہ موسم کیسا ہی سخت ہو، حالات کیسے ہی ناساز گار رہوں اور اس کی ذاتی مصلحتوں کے لحاظ سے اس وقت روزہ رکھنا کتنا ہی نقصان دہ ہو۔

۶۔ اس میں صبر، استقامت، تحمل، یکسوئی، توکل اور دنیوی ترغیبات و تحریصات کے مقابلہ کی طاقت کم از کم اس حد تک موجود ہے کہ رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس کام کے دوران میں وہ رضاکارانہ اپنی خواہشات نفس کو روکتا ہے سخت گرمی کی حالت میں پیاس سے حلق چٹخا جا رہا ہے، برفاب سامنے موجود ہے آسانی سے پی سکتا ہے، مگر نہیں پیتا۔ بھوک کے مارے جان پر بن رہی ہے، کھانا حاضر ہے چاہے تو کھا سکتا ہے، مگر نہیں کھاتا۔ جوان میاں بیوی ہیں، خواہش نفس زور کرتی ہے چاہیں تو اس طرح قضائے شہوت کر سکتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے، مگر نہیں کرتے۔ ممکن الحصول فائدوں سے یہ صرف نظر، اور ممکن الاحتراز نقصانات کی یہ پذیرائی اور خود اپنے منتخب کئے ہوئے طریق حق پر یہ ثابت قدمی کسی ایسے نفع کی امید پر نہیں ہے جو اس دنیا کی زندگی میں حاصل ہونے والا ہو بلکہ ایک ایسے مقصد کے لئے ہے جس کے متعلق پہلے ہی نوٹس دیدیا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے اس کے حاصل ہونے کی امید ہی نہ رکھو۔

یہ کیفیات ہیں جو پہلے روزہ کا ارادہ کرتے ہی انسان کے نفس میں ابھرنی شروع ہوتی ہیں۔
جب وہ عملاً روزہ رکھتا ہے تو یہ بالفعل ایک طاقت بن جاتی ہیں۔ جب تیس دن تک مسلسل وہ اسی
فعل کی تکرار کرتا ہے تو یہ طاقت راسخ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور بالغ ہونے کے بعد سے مرتے وقت تک
تمام عمر ایسے ہی تیس تیس روزے ہر سال رکھنے سے وہ آدمی کی جبلت میں پیوست ہو کر رہ جاتی ہے
یہ سب کچھ اس لئے نہیں ہے کہ یہ صفات صرف روزے ہی رکھنے میں اور صرف رمضان ہی کے
مہینے میں کام آئیں، بلکہ یہ اس لئے ہے کہ انہی اجزا سے انسان کی سیرت کا خمیر بنے، وہ فجور سے یکسر
خالی ہو، اور اس کی ساری زندگی تقویٰ کے راستہ پر پڑ جائے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس مقصد کے لئے
روزہ سے بہتر کوئی طریق تربیت ممکن ہے؟ کیا اس کے بجائے اسلامی طرز کی سیرت بنانے کے لئے
کوئی دوسرا کورس تجویز کیا جا سکتا ہے؟

ضبط نفس اس تربیت کے ضابطہ میں کسنے کے لئے صرف دو خواہشوں کو منتخب کیا گیا ہے یعنی شہوت
شکم اور شہوت فرج۔ اور ان کے ساتھ ایک تیسری خواہش — آرام لینے کی خواہش — بھی زد میں آگئی
ہے کیونکہ تراویح کے قیام اور سحری کے لئے آخر شب میں مزے کی نیند توڑ کر اٹھنے کی وجہ سے اس پر بھی
اچھی خاصی ضرب پڑتی ہے۔

حیوانی زندگی کے مطالبات میں یہ تین مطالبے اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں۔ بقائے نفس کے لئے
غذا کا مطالبہ۔ بقائے نوع کے لئے صنف مقابل سے اتصال کا مطالبہ۔ اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں کو بحال
کرنے کے لئے آرام کا مطالبہ۔ انہی تین ضرورتوں کا تقاضا تمام حیوانی خواہشات کا مبدا اور تمام حیوانی اعمال
کا محرک ہے۔ اور یہ تقاضا اتنا طاقتور ہے کہ حیوان جو کچھ کرتا ہے اسی کے زور سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔
انسان کو خدمتگار اور آلۂ کار کی حیثیت سے جو بہترین ساخت کا حیوان دیا گیا ہے اس کے
بنیادی مطالبات بھی یہی تین ہیں۔ اور چونکہ وہ تمام حیوانات سے زیادہ اونچی قسم کا حیوان ہے اس لئے

اس کے مطالبات ان سب سے بڑھے ہوئے ہیں وہ صرف زندہ رہنے کے لئے غذا ہی نہیں مانگتا بلکہ اچھی غذا مانگتا ہے طرح طرح کی مزے دار غذائیں مانگتا ہے، غذائی مواد کی نئی نئی ترکیبوں کا مطالبہ کرتا ہے، اور اس کے اس مطالبہ میں سے اتنی شاخیں نکلتی چلی جاتی ہیں کہ انہیں پورا کرنے کے لئے ایک دنیا کی دنیا مددگار رہتی ہے، وہ صرف بقائے نوع کے لئے صنف مقابل سے اتصال ہی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس مطالبہ میں ہزار نزاکتیں اور ہزار باریکیاں پیدا کرتا ہے۔ تنوع چاہتا ہے، حُسن چاہتا ہے، آرائش کے بے شمار سامان چاہتا ہے، طرب انگیز سماں اور لذت انگیز ماحول چاہتا ہے، غرض اس سلسلہ میں بھی اس کے مطالبات اتنی شاخیں نکالتے ہیں کہ کہیں جا کر ان کا سلسلہ رُکتا ہی نہیں۔ اسی طرح اس کی آرام طلبی بھی عام حیوانات کے مثل صرف کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے کی حد تک نہیں رہتی بلکہ وہ بھی بے شمار شاخیں نکالتی ہے جن کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا وہ صرف کھوئی ہوئی طاقتوں کو بحال ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ چاہتا ہے کہ حتی الامکان قوتیں کھونے کی نوبت ہی نہ آنے پائے، مشقت سے جی چراتا ہے محنت کے بغیر کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے، طرح طرح کی تدبیریں اس غرض کے لئے نکالتا ہے کہ بلا محنت یا کم سے کم محنت سے مقصد برآری ہو جائے اور خصوصاً ایسے مقاصد کے لئے محنت کرنے میں تو اس کی جان پر بنتی ہے جو اس کے حیوانی مقاصد سے بالاتر ہوں۔ اس طرح ان تین ابتدائی خواہشوں سے خواہشات کا ایک لامتناہی جال بن جاتا ہے جو انسان کی پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہے پس دراصل انسان کے اس خادم، اس منہ زور حیوان کے پاس یہی تین ہتھیار، وہ سب سے بڑے ہتھیار ہیں جن کی طاقت سے وہ اس کا خادم بننے کے بجائے خود اس کو اپنا خادم بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہمیشہ زور لگاتا رہتا ہے کہ اس کے اور انسان کے تعلق کی نوعیت صحیح فطری نوعیت کے برعکس ہو جائے یعنی بجائے اس کے کہ انسان اس پر سوار ہو، اُلٹا وہ انسان پر سوار ہو کر اُسے اپنی خواہشات کے مطابق کھینچے

کھینچے پھرے۔ اگر انسان پوری قوت سے اُس پر اپنا اقتدار مسلط نہ کرے اور تمیز و ارادہ کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دے تو بالآخر وہ اس پر غالب آجاتا ہے۔ پھر وہ اپنے خدمتگار کا غلام اور اس کا خدمتگار اُس کا آقا ہوتا ہے علم اسما کی جو نعمت اللہ نے اس کو دی ہے فکر و استدلال اور تسخیر و ایجاد کی جو قابلیتیں اسے عطا کی ہیں وہ سب کی سب اُس اندھے، جاہل، نادان جانور کی خدمت میں لگ جاتی ہیں بلندیوں پر اُڑنے کے بجائے پستیوں میں اُترنے کے کام آتی ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے انسانی مقاصد کی جگہ ذلیل حیوانی مقاصد حاصل کرنے کا آلہ بن جاتی ہیں ان کا کوئی مصرف اس کے سوا باقی نہیں رہتا کہ رات دن بس اسی حیوان کی خواہشات پوری کرنے کے لئے نئے نئے وسائل تلاش کرتی رہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حیوان شر الدواب —— تمام حیوانات سے بدتر قسم کا حیوان —— بن کر رہ جاتا ہے بھلا جس حیوان کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے انسان جیسا خادم مل جائے اُس کے شر کی بھی کوئی حد ہو سکتی ہے! جس بیل کی بھوک کو بحری بیڑا بنانے کی قابلیت میسر آجائے. زمین کی کس چراگاہ میں اتنا بل بوتا ہے کہ اس کے معاشی مفاد کی لپیٹ میں آنے سے بچ جائے؛ جس کتے کی حرص کو ٹینک اور ہوائی جہاز بنانے کی قوت مل جائے کس بوٹی اور کس ہڈی کا یارا ہے کہ اس کی کچلیوں کی گرفت میں آنے سے انکار کرے؟ جس بھیڑیے کو اپنے جنگل کے بھیڑیوں کی قومیت بنانے کا سلیقہ ہو اور جو پریس اور پروپیگنڈا سے لے کر لمبی مار کی توپوں تک سے کام لے سکتا ہو زمین میں کہاں اتنی گنجائش ہے کہ اس کے لئے کافی شکار فراہم کرسکے؟ جس بکرے کی شہوت ناول، ڈراما، تصویر، موسیقی، رقص، ایکٹنگ اور حسن افزائی کے وسائل ایجاد کرسکتی ہو، جس میں بکریوں کی تربیت کے لئے کالج، کلب، فلستان تک پیدا کرنے کی لیاقت ہو اس کی داد عیش کے لئے کون حد و انتہا مقرر کرنے کا ذمہ لے سکتا ہے؟

ان پستیوں میں گرنے سے انسان کو بچانے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اس کے سامنے

انسانی زندگی کا اصلی نصب العین پیش کیا جائے اور اسے انسانی قوتوں کا صحیح مصرف بتایا جائے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس حیوان کے ساتھ اس کے تعلق کی جو فطری نوعیت ہے اس کو عملاً قائم کیا جائے اور مشق و تمرین کے ذریعہ سے سوار کو اتنا چست کر دیا جائے کہ وہ اپنی سواری پر جم کر بیٹھے، ارادے کی باگیں مضبوطی کے ساتھ تھامے، اور اس پر اتنا قابو یافتہ ہو کہ اس کی خواہشات کے پیچھے خود نہ چلے بلکہ اپنے ارادے کے مطابق اسے سیدھا سیدھا چلائے۔ اس حیوان کو خدا نے اس لئے ہمارے سپرد کیا ہے کہ ہم اس سے کام لیں اور اس کو اپنی زندگی کے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں اس کا دماغ ہمارے لئے فکر کرنے کا وسیلہ ہے۔ اس کے آلات حواس ہمارے لئے علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں ہمارے لئے سعی و عمل کرنے کے آلات ہیں جتنی چیزیں خدا نے اس دنیا میں ہمارے لئے مسخر کی ہیں ان میں سب سے زیادہ کارآمد چیز یہی حیوانی جسم ہے اس کے اندر جتنی فطری خواہشات ہیں وہ سب اس کی حقیقی ضرورتوں سے تعلق رکھتی ہیں جن کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے ہم پر اس کا حق ہے کہ اسے آرام سے رکھیں اس کو قوت بخش غذا دیں۔ بقائے نوع کے لئے اس کی طلب کو پورا کریں، اور اسے خواہ مخواہ ضائع نہ کردیں لیکن بہرحال یہ ہماری اور ہمارے مقصد زندگی کی خدمت کے لئے ہے نہ کہ ہم اس کی اور اس کے مقصد زندگی کی خدمت کے لیے۔ اس کو ہمارے ارادے کے تابع ہونا چاہئے نہ کہ ہمیں اس کی خواہشات کے تابع۔ اس کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ ایک فرمانروا کی طرح اپنی خواہشات ہم سے پوری کرائے بلکہ اس کا صحیح مرتبہ یہ ہے کہ ایک غلام کی طرح ہمارے سامنے اپنی خواہشات پیش کرے اور یہ ہماری تمیز دار و تربیت یافتہ خودی کا کام ہے کہ اس کی جس درخواست کو جب اور جس طرح مناسب سمجھیں پورا کریں یا رد کریں۔

روزے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر یہی اقتدار بخشنا ہے جو تین خواہشیں تمام حیوانی خواہشات کا مبداء ہیں، جو تین ہتھیار اس حیوان کے پاس

ایسے طاقتور ہیں کہ اُن کے زور سے یہ ہمیں اپنا مطیع بنانے کے لئے اُٹھتا ہے، روزہ اُنہی تینوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس کے منہ میں مضبوط لگام دے کر اس کی راسیں ہماری اُس خودی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو خدا پر ایمان لاتی ہے اور اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا عزم کر چکی ہے۔ اُس وقت اس جانور کی بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک یہ دانہ پانی مانگتا رہتا ہے اور ہم اس کو کچھ نہیں دیتے۔ یہ پانی کی طرف لپکنا چاہتا ہے مگر ہم باگیں کھینچ لیتے ہیں۔ یہ کھانا دیکھ کر اس پر منہ مارنا چاہتا ہے مگر ہم اسے جنبش نہیں کرنے دیتے۔ یہ کہتا ہے اچھا سگرٹ، حقہ، پان کسی چیز سے تو مجھے اپنی آگ بجھا لینے دو مگر ہم اس کی ہر درخواست رد کر دیتے ہیں یہ اپنے جوڑے کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے اور ملاعبت شروع کر دیتا ہے مگر جہاں تسکین نفس کا سوال بیچ میں آیا اور ہم نے لگام کھینچ لی۔ اس طرح دن بھر اس کی خواہشوں کو ٹھکرانے کے بعد ہم اپنے مالک کے مقرر کئے ہوئے وقت پر اسے چارہ پانی دیتے ہیں۔ اب یہ تھکا ہارا چاہتا ہے کہ ذرا آرام لے۔ مگر عشا کی اذان سنتے ہی ہم کان پکڑ کر اسے سیدھا اُٹھا کھڑا کرتے ہیں اور مسجد کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ دوسرے دنوں میں تو اسے عشا کے وقت تھوڑا ہی قیام کرنا پڑتا تھا۔ رمضان میں معمولی نماز کے علاوہ تراویح کی غیر معمولی رکعتوں کے لئے بھی ہم اسے کھڑا رکھتے ہیں۔ اس رگید سے نکل کر بے چارہ سونے کے لئے دوڑتا ہے اور چاہتا ہے کہ بس صبح کی خبر لائے۔ مگر رات کے پچھلے پہر میں جبکہ اس کا رُواں رُواں میٹھی نیند کے نشے میں سرشار ہوتا ہے ہم ایک چابک ایسا رسید کرتے ہیں کہ سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے پھر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے مالک کا حکم دن کے بجائے اس وقت تجھے دانہ پانی دینے کا ہے لہٰذا جو کچھ کھانا چاہتا ہے اب کھا لے۔

یہ مشق ہے جو ہمیں ہر سال تیس دن کرائی جاتی ہے تاکہ اپنے اس خادم پر ہمیں پورا اقتدار حاصل ہو جائے۔ اس سے ہم اپنے جسم اور جسمانی قوتوں کے با اختیار حاکم بن جاتے ہیں۔ حیوانی خواہشات کی جابرانہ قہرمانی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم میں اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی جس خواہش کو جس حد پر

چاہیں روک دیں، اور اپنی جس قوت سے جس طرح چاہیں کام لے سکیں وہ شخص جسے اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت ہی نہ رہی ہو جو نفس کے ہر مطالبہ پر بے چون و چرا سر جھکا دینے کا خوگر رہا ہو، اور جس کے لئے حیوانی جبلت کا ہر داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ہو دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ بڑے درجے کے کام انجام دینے کے لئے بہرحال آدمی کی خودی میں اتنا بل ہونا چاہئے کہ وہ نفس کی خواہشات کو اپنے قابو میں رکھ سکے اور ان قوتوں کو جو اللہ نے اس کے نفس و جسم میں ودیعت کی ہیں اپنے ارادے کے مطابق استعمال کر سکے۔ اسی لئے رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ سال کے دوران میں کبھی کبھی نفل روزے بھی رکھنے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تاکہ اس اقتدار کی گرفت مضبوط ہوتی رہے۔

لیکن بہت فرق — اصولی اور جوہری فرق — ہے اُس اقتدار میں جو اسلامی روزہ انسان کی خودی کو اس کے نفس و جسم پر دیتا ہے، اور اُس اقتدار میں جو غیر اسلامی طرز پر نفس کشی کی مشقوں یا قوت ارادی کو نشو و نما دینے کی ورزشوں سے حاصل کیا جاتا ہے، یا جو فطری طور پر بڑے آدمیوں کو خود بخود حاصل ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کا اقتدار تو دراصل ایک ایسی جاہل مطلق العنان خودی کا استبداد ہے جو اپنے سے بالاتر کسی حاکم کی مطیع، کسی ضابطہ و قانون کی پابند اور کسی علم صحیح کی متبع نہیں ہے۔ اس کو اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر جو فرمانروائی حاصل ہوتی ہے، لازم نہیں بلکہ ممکن نہیں کہ وہ اسے صحیح مقصد کے لئے اور صحیح طریقہ پر استعمال کرے۔ دنیا میں سنیاس، رہبانیت اور ترک لذات کی بیماریاں اسی نوعیت کے اقتدار سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی اقتدار کی بدولت نفس اور جسم کے جائز حقوق چھینے گئے ہیں۔ اسی اقتدار کی بدولت انسان نے اپنی قابلیتوں کو تہذیب تمدن کے ارتقا میں صرف کرنے کے بجائے تنزّل و انحطاط کی کوششوں میں صرف کیا ہے۔ اسی اقتدار کی بدولت دنیا کے بہت سے بڑے آدمیوں نے خدا کے بندوں پر اپنی خدائی مسلط کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی طاقتوں کو حق کے بجائے ظلم کی راہ میں استعمال کیا ہے برعکس اس کے اسلامی روزہ جس خودی کو نفس و جسم پر اقتدار دیتا ہے وہ

مطلق العنان خودی نہیں ہے بلکہ خدا اور اس کے قانون کی اطاعت کرنے والی خودی ہے۔ وہ جاہل خودی نہیں ہے ایسی خودی نہیں ہے جو آپ اپنی رہنما ہو بلکہ ایسی خودی ہے جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت، العلم، کتاب منیر کی رہنمائی میں چلنے والی ہے وہ خدا کے دئیے ہوئے نفس و جسم کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتی کہ اس پر قابو پا کر اپنی صواب دید کے مطابق جس طرح چاہے حکمرانی کرے بلکہ وہ اسے خدا کی امانت سمجھتی ہے اور اس امانت پر خدا کے منشأ کے مطابق حکومت کرتی ہے ایک مومن متقی انسان جس کی خودی اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے سپر ڈال چکی ہو، دنیا کی کسی چیز پر بھی ظلم نہیں کر سکتا کجا کہ خود اپنے جسم حیوانی کا حق مارے اور اپنے اس رفیق پر ظلم کرے جس کو اللہ نے مدۃ العمر کے لئے اس کا بہترین مددگار بنایا ہے۔ وہ اس کو اچھے سے اچھا کھلائے گا، اچھے سے اچھا پہنائیگا بہتر سے بہتر مکان میں رکھے گا، زیادہ سے زیادہ آرام دے گا، اس کے ہر فطری جذبہ کی تسکین کا سامان فراہم کرے گا نہ اس لئے کہ اس کا نفس یہ چاہتا ہے کہ ایسا کیا جائے بلکہ اس لئے کہ خدا نے اس کا حق مقرر کیا ہے اور اس حق کو ادا کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہے۔ البتہ وہی نفس جب اچھا کھانے کے لئے حرام غذا یا حرام کی کمائی کا تقاضا کرے گا جب اچھے لباس، اچھی سواری، اچھے مکان کے لئے ایسی تدبیریں اختیار کرنے کا مطالبہ کرے گا جنہیں اللہ نے پسند نہیں کیا ہے، جب وہ اپنے جذبات شہوانی کی تسکین کے لئے ایسے دروازے کھولنا چاہے گا جنہیں اللہ نے بند کیا ہے، جب وہ اپنی آرام طلبی کے لئے ان فریضوں اور ان خدمتوں کو ادا کرنے

ل اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے اپنے نفس پر صدقہ کرو، پھر اپنے اہل و عیال پر پھر دوسرے لوگوں پر۔ اپنے نفس پر صدقہ کرنا، یا اپنے اہل و عیال پر صدقہ کرنا ایک عجیب سا تخیل معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اسلام کا انداز فکر کچھ ہے ہی دنیا سے نرالا۔ یہاں جو شخص اپنی خواہش نفس سے کھاتا ہے وہ تو بس کھا لیتا ہے مگر جو خدا کی طرف سے مقرر کیا حق سمجھ کر اپنی حلال کی کمائی سے اپنے جسم کو غذا دیتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کو کھلاتا ہے وہ دراصل ایک ثواب کا کام کرتا ہے، ایک ایک لقمہ پر وہ اللہ کے ہاں اجر کا مستحق ہے۔

ںبھی چڑائے گا جو اللہ نے اس پر عائد کئے ہیں، اور جب وہ اُس جگہ اپنی خواہشات اور خود اپنی قربانی
ے سے رُکنا چاہے گا، جہاں اللہ کی رضا ہے کہ اسے اور اس کی خواہشوں کو قربان کر دیا جائے،
ں مومن کی خودی اپنے حاکمانہ اختیارات کو پوری شدت کے ساتھ استعمال کرے گی اور بجز اس
سرکشی و نافرمانی کے راستہ سے ہٹا کر فرمانبرداری کے سیدھے راستہ پہ لے جائے گی۔ اسی چیز کی مشق مومن
، رمضان میں کرائی جاتی ہے تاکہ دنیا کی اس امتحان گاہ میں نازک مواقع جب پیش آئیں۔
وہ روز ہر وقت پیش آتے ہیں ـــــ تو اس کے ارادے کی باگیں اس منہ زور جوان کو قابو میں
ھنے سے عاجز نہ رہ جائیں۔

رادی تربیت کا اجمالی نقشہ | یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق افراد کی تربیت سے
۔ اب روزے کے اجتماعی پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ایک مجموعی نظر انفرادی تربیت کے اس
وگرام پر ڈال لیجئے۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں، اسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایسی جماعت بنانا ہے جو انسانی
ن کو خیر و صلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے مگر اس غرض کے لئے وہ صرف اجتماعی اصول وضع کرنے
ان اصولوں کی بنیاد پر ایک نظام تمدن بنا دینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ساتھ ساتھ اپنے جماعتی
م کے لئے افراد کو تیار کرنے کا بھی انتظام کرتا ہے تاکہ جماعت (سوسائٹی) جن افراد پر مشتمل ہو ان
کا ایک ایک شخص اپنے خیالات، اپنی سیرت اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس نظام کے ساتھ
ازبیش موافقت رکھتا ہو، اور باغیانہ میلانات کے ساتھ مجبورانہ اطاعت کرنے کے بجائے اپنے
و روح کی پوری آمادگی، اپنے دل و دماغ کے مخلصانہ عقیدے، اور اپنی سیرت کی ذاتی قوت کے
تھ اس کی پیروی کرے۔ اس اسکیم میں روزے کے رکن سے جو کام لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ :-
۱- اس تربیت کے ذریعہ سے جماعت کے ہر فرد کو خداوند عالم کی حاکمیت کے مقابلہ میں اپنی

خود مختاری سے عملاً دست بردار ہو جانے کے لئے تیار کیا جائے۔ تاآنکہ وہ اپنی پوری زندگی کو الٰہی قانون کے تابع کر دے۔

۲- ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے کا اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ عملی مشق و تمرین کے ذریعہ سے اس طرح جاگزین کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس کی بنا پر، نہ کہ کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے، قانون الٰہی کی خفیہ اور علانیہ اطاعت کرنے لگے۔

۳- ہر فرد کے اندر یہ روح پھونک دی جائے کہ وہ ماسوئی اللہ کی بندگی و اطاعت سے اعتقاداً وعملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لئے اس طرح خالص ہو جائے کہ جس حکم یا جس قانون یا جس اقتدار کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی سند نہ ہو، اس کی اطاعت کے لئے فرد مومن کے نفس میں کوئی آمادگی بھی نہ ہو۔

۴- ہر فرد کے ذہن کی ایسی تربیت کی جائے کہ دنیا کی زندگی میں اس کا نقطۂ نظر کلیتہً تبدیل ہو جائے۔ وہ مادہ پرست، ابن الوقت، بندۂ مصلحت اور دنیوی منافع کا غلام نہ ہو بلکہ اس کی نگاہ میں اصلی قدر و قیمت اخلاقی و روحانی منافع کی ہو، وہ ہر حال میں خداوند عالم کے مقرر کئے ہوئے اصولِ حیات کی پابندی کرے، اور دنیا کے عارضی فوائد یا نقصانات سے بے پروا ہو کر اس راستی پر قائم رہے جس میں خدا کی رضا ہے۔

۵- ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طور پر کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر عملاً پورا اقتدار حاصل ہو، وہ اپنے نفس و جسم کی تمام قوتوں پر اتنا قابو رکھتا ہو کہ اپنے عقیدے اور علم و بصیرت کے مطابق ان سے کام لے سکے اس میں صبر، تحمل، جفاکشی، توکل علی اللہ، اور ثابت قدمی و یکسوئی کی صفات پیدا ہو جائیں اور اس کے کیرکٹر میں اتنی قوت آ جائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور اپنے نفس کے ناجائز میلانات کا مقابلہ کر سکے۔

یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لئے اسلام نے رمضان کے روزے ہر اس شخص پر فرض کئے ہیں جو اسلامی

جماعت کا رکن ہو، کوئی عاقل و بالغ فرد، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس فریضہ سے مستثنیٰ نہیں ہے بیماری سفر اور بعض دوسرے شرعی عذرات کی بنا پر کوئی شخص اس فرض کو ادا نہ کر سکتا ہو تو اس پر قضا یا فدیہ لازم ہے بہر حال اسلام کے دائرے میں رہ کر کوئی انسان روزے کی فرضیت سے چھوٹتا نہیں ہے
اگرچہ یہ لازم نہیں کہ روزے کی تربیت سے تمام افراد کے اندر وہ خصوصیات بدرجۂ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں، کیونکہ ان کی پیدائش اور تکمیل کے لئے خود تربیت لینے والے میں ذاتی استعداد بھی ضروری ہے، لیکن بجائے خود اس نظامِ تربیت کی فطرت میں یہ عناصر موجود ہے، کہ اس سے یہ خصوصیات انسان میں پیدا ہوں اور ان خصوصیات کو پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر، بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا نظامِ تربیت تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص صداقت پسندی کی نظر سے دیکھے تو اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا میں اسلام کے سوا کوئی اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے افراد کو تیار کرنے کا اتنا وسیع وہمہ گیر انتظام کیا ہو کہ پوری کی پوری آبادیاں اس کے دائرے میں آکر خود بخود اخلاقی تربیت پاتی چلی جائیں۔

پھر اس کا مزید کمال یہ ہے کہ سوسائٹی کے حدود میں اگر کوئی فرد ایسا ناقص نکل آئے کہ اس اجتماعی نظام کا جز بن کر نہ رہ سکتا ہو، تو وہ خود بخود الگ ممتاز ہو جاتا ہے جہاں اس نے بغیر عذر شرعی کے روزہ ترک کیا اور فوراً ہی یہ بات سوسائٹی پر آشکارا ہو گئی کہ اس کے درمیان ایک منافق موجود ہے جو خدا کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا اور اپنی حیوانی جبلت کا بندہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس صریح علامت سے سوسائٹی کو اپنے جسم میں ایک سڑے ہوئے عضو کی موجودگی کا بروقت علم ہو جاتا ہے اور اس کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے زہر سے محفوظ کرلے ــــــ کم از کم اسلام نے تو اپنی حد تک منافقین کی نشان دہی کا پورا انتظام کر دیا ہے اور ہر مسلم سوسائٹی کے لئے اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ عین وقت پر ان کے وجود سے آگاہ ہو کر یا ان کی اصلاح کرے یا انہیں اپنے

دائرے سے خارج کردے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بے حس نام نہاد مسلم سوسائٹی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائے اور ایسے لوگوں کو نہ صرف اپنی گود میں پرورش کرے بلکہ انہیں اپنے سر پر بٹھائے اور زندہ باد کے نعرے لگائے!

روزے کا اجتماعی پہلو | نماز کی طرح روزہ بھی بجائے خود ایک انفرادی فعل ہے لیکن جس طرح نماز کے ساتھ جماعت کی شرط لگا کر اس کو انفرادی سے اجتماعی فعل میں تبدیل کر دیا گیا ہے اسی طرح روزے کو بھی ایک ذرا سی حکیمانہ تدبیر نے انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل بنا کر اس کے فوائد و منافع کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تدبیر بس اتنی سی ہے کہ روزے رکھنے کے لئے ایک خاص مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ اگر شارع کے پیش نظر محض افراد کی اخلاقی تربیت ہوتی تو اس کے لئے یہ حکم دینا کافی تھا کہ ہر مسلمان سال بھر کے دوران میں کبھی تیس دن کے روزے رکھ لیا کرے۔ اس طرح وہ تمام مقاصد پورے ہو سکتے تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، بلکہ ضبطِ نفس کی مشق کے لئے یہ صورت زیادہ مناسب تھی کیونکہ اجتماعی عمل سے روزہ رکھنے میں جو آسانی افراد کے لئے پیدا ہو جاتی ہے وہ انفرادی عمل کی صورت میں نہ ہوتی اور ہر شخص کو اپنا فرض ادا کرنے میں نسبتاً زیادہ شدت کے ساتھ اپنی قوت ارادی استعمال کرنی پڑتی لیکن اسلام کا قانون جس حکیم نے بنایا ہے اس کی نگاہ میں افراد کی ایسی تیاری کسی کام کی نہیں ہے۔ جس کے نتیجہ میں ایک جماعت صالحہ وجود میں نہ آئے، اس لئے اس نے روزے کو محض ایک انفرادی عمل بنانا پسند نہیں کیا بلکہ سال بھر میں ایک مہینہ روزے کے لئے مخصوص کر دیا تاکہ سب مسلمان بیک وقت روزہ رکھیں اور وہی نظام تربیت جس سے افراد تیار ہوں، ایک صالح اجتماعی نظام بنانے میں بھی مددگار ہو جائے،

اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کئے جاتے ہیں۔

تقویٰ کی فضا | اجتماعی عمل کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا

ہو جاتی ہے ایک شخص انفرادی طور پر کسی خاص ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں اس کے شریک ہوں، تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پائے گا، اس کی کیفیت ذہنی صرف اسی کی ذات تک محدود اور صرف اسی کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی، اس کو نشو و نما پانے کے لئے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی، بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے الٹا گھٹا دیں گے لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو، اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں، تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی، جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی۔ اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد حساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ایک شخص اکیلا برہنہ ہو اور گرد و پیش سب لوگ کپڑے پہنے ہوئے ہوں تو وہ کس قدر شرمائے گا؟ بے حیائی کی کتنی بڑی مقدار اس کو برہنہ ہونے کے لئے درکار ہوگی، اور پھر بھی ماحول کے مخالف اثرات سے اس کی شدید بے حیائی بھی کس طرح بار بار شکست کھائے گی؟ لیکن جہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوں، وہاں شرم بے چاری کو پھٹکنے کا موقع بھی نہ ملے گا۔ اور ہر شخص کی بے شرمی دوسروں کی بے شرمی سے مدد پا کر افزوں در افزوں ہوتی چلی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور دہلا کہ جنگ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ مگر جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہامت و حماست کا ایک طوفان امنڈ آتا ہے جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے نیکی ہو یا بدی، دونوں کی ترقی میں اجتماعی نفسیات کو غیر معمولی دخل حاصل ہے جماعت مل کر بدی کر رہی ہو تو فحش، بے حیائی اور بدکاری کے جذبات اُبل پڑتے ہیں، اور جماعت مل کر نیکی کر رہی ہو تو پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات کا سیلاب آجاتا ہے جس میں بد بھی نیک بن جاتے ہیں خواہ تھوڑی دیر

ہی کے لئے سہی۔

اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دے کر رمضان سے شارع نے یہی کام لیا ہے جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتیوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے جس میں برائیاں دبتی ہیں نیکیاں پھلتی ہیں، پوری پوری آبادیوں پر خوف خدا اور حُبّ خیر کی روح چھا جاتی ہے۔ اور ہر طرف پرہیزگاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے اس زمانہ میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے، ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے، کسی غریب کو کھانا کھلائے کسی ننگے کو کپڑا پہنائے کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے۔ اس وقت لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں، ظلم سے ہاتھ رک جاتے ہیں، برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے، توبہ اور خشیت و انابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں، نیک بہت نیک ہو جاتے ہیں، اور بدوں کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس جلاب سے اس کا اچھا خاصہ تنقیہ ضرور ہو جاتا ہے غرض اس زبردست حکیمانہ تدبیر سے شارع نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر سال ایک مہینہ کے لئے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے اس کو اوورہال کیا جاتا رہے اس کی کایا پلٹی جائے اور اس میں مجموعی حیثیت سے روح اسلامی کو از سر نو زندہ کر دیا جائے اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اذا دخل رمضان فُتِّحت ابواب الجنة وغُلِّقت ابواب جھنم و سُلسلت الشیاطین ـ	جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اور شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:-

اذا کان اول لیلۃ من شہر رمضان صفدت الشیاطین ومردۃ الجن وغلقت ابواب النار فلم یفتح منہا باب وفتحت ابواب الجنۃ فلم یغلق منہا باب وینادی منادیا یا باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر اقصر	جب رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے، تو شیاطین اور سرکش جن باندھ دئے جاتے ہیں۔ دوزخ کی طرف جانے کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں ان میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور جنت کی طرف جانے کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا اس وقت پکارنے والا پکارتا ہے اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور اے برائی کے خواہش مند ٹھہر جا۔

سکتہ کے مریض کا آخری امتحان اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کی ناک کے پاس آئینہ رکھتے ہیں اگر آئینہ پر کچھ دھندلاہٹ سی پیدا ہو تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے، ورنہ اس کی زندگی کی آخری امید بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کسی بستی کا تمہیں امتحان لینا ہو تو اسے رمضان کے زمانہ میں دیکھو۔ اگر اس مہینہ میں ان کے اندر کچھ تقویٰ، کچھ خوف خدا، کچھ نیکی کے جذبہ کا ابھار نظر آئے تو سمجھو ابھی زندہ ہے، اور اگر اس مہینہ میں بھی نیکی کا بازار سرد ہو، فسق و فجور کے آثار نمایاں ہوں، اور اسلامی حس مردہ نظر آئے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لو۔ اس کے بعد زندگی کا کوئی سانس مسلمان کے لئے مقدر نہیں ہے۔[1]

[1] یہ تو ہے امتحان کا اسلامی معیار۔ مگر اب اس جانچ کے لئے کچھ دوسرے معیار ایجاد ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی آبادی غلام ہو تو اس کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ قومی مفاد (یعنی قوم کے معاشی و سیاسی مفاد) کے لئے ان میں کتنی تڑپ ہے، اس مفاد کی حفاظت کے لئے وہ کہاں تک لڑ کر جھگڑ سکتے ہیں اور جلسوں میں اسلام اور اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت کا نام کس جوش و خروش سے لیا جاتا ہے۔ اور اگر وہ آبادی آزاد ہو تو اس کی زندگی کا امتحان لینے کے لئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے ہوائی جہاز کتنے بنائے، ریلیں کتنی بنائیں، مدرسے اور کارخانے کس قدر قائم کئے، اپنی عورتوں کو بے حیائی میں کہاں تک طاق کیا اور تہذیب و تمدن اور معاشرت میں یورپ میں لگا کھانے کی کہاں تک کامیاب کوشش کی۔ ان آزمائشوں میں اگر کوئی آبادی پوری اتر گئی تو کہا جاتا ہے کہ الحمد للہ اسلام زندہ ہے اور بس "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا"

جماعتی احساس | اجتماعی عمل کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے نسل یا زبان یا مرزبوم یا معاشی اغراض کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتا۔ آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہو یہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے باندھتا ہے اور جس کے ساتھ خیالات اور عمل میں اتفاق نہ ہو اس سے کبھی دل نہیں ملتا۔ خواہ دونوں ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہوں جب کوئی شخص اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی کیفیت کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہم یگانگت، رفاقت، یک جہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، ان کے درمیان کوئی اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ قلب و روح کا اشتراک اور عمل کا اتفاق ان کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیتا ہے۔

خواہ نیکی ہو یا بدی، دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتے ہیں۔ چوروں میں چوری کا اشتراک اور شرابیوں میں مے نوشی کا اشتراک بھی یونہی برادری پیدا کرتا ہے مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستہ میں افراد کی نفسانیت کا دخل رہتا ہے جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے اس لئے ایسے راستوں میں برادری کبھی بے آلائش اور مستحکم نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے نیکی کے راستہ میں نفسانیت دبتی ہے انسانی روح کو حقیقی تسکین ملتی ہے، اور پاک جذبات کے ساتھ آدمی اس راستہ پر چلتا ہے اس لئے نیک خیالات اور نیک عمل کا اشتراک وہ بہترین رشتہ اخوت پیدا کرتا ہے جس سے زیادہ مستحکم اجتماعی رابطہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نماز با جماعت کی طرح رمضان کے اجتماعی روزے مسلمانوں میں اسی نوع کی برادری پیدا کرتے ہیں تمام لوگوں کا مل کر ایک خدا کی رضا چاہنا، اسی کی رضا کے لئے بھوک پیاس کی تکلیف

اٹھانا، اسی کے خوف سے برائیوں کو چھوڑنا اور ایک دوسرے کو برائیوں سے روکنا اسی کی محبت میں بھلائیوں کی طرف دوڑنا اور ایک دوسرے کو بھلائی پر اکسانا، یہ چیز اُن میں بہترین قسم کی وحدت، صحیح ترین فطری ذہنیت، پاکیزہ ترین اجتماعی ذہنیت، اور ایسی ہمدردی و رفاقت پیدا کرتی ہے جو ہر کھوٹ سے خالی ہے۔

امداد باہمی کی روح | اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب، لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لئے امیر پر بھی وہ کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گذرتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت کو حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے اور خدا کی رضا چاہنے کا جذبہ اُسے اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرنے پر اکساتا ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر اس کے اخلاقی و تمدنی فوائد بے شمار ہیں۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکالیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو، اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں، نہ صرف یہ کہ اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے بلکہ غربت اور امارت میں حسد کے بجائے محبت کا، شکرگذاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور طبقاتی جنگ کبھی رونما نہیں ہوسکتی جو ان قوموں میں برپا ہوتی ہے، جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے، جو قحط کے زمانہ میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں انہیں روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

یہ اسلام کا دوسرا عملی رکن ہے جس کے ذریعہ سے اسلام اپنے افراد کو فرداً فرداً ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دے کر تیار کرتا ہے اور پھر انہیں جوڑ کر ایک خاص طرز کی جماعت بناتا ہے۔ اسلام کا آخری مقصد جس مدنیت صالحہ اور حکومت الٰہیہ کو وجود میں لانا ہے اس کے اجزائے ترکیبی اس طرح نماز اور روزے کے ذریعہ سے چھیل بنا کر تیار کئے جاتے ہیں، اس کے سپاہی اور جنرل اس کے اہل کار، عہدہ دار اور وزراء، اُس کے معلم اور پروفیسر اور اس کے قاضی اور مفتی اُس کے تاجر، مزدور، کارخانہ دار اور کسان، اس کے رائے دہندے، نمائندے اور شہری سب اس تربیت کے بعد کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے اجتماع سے وہ صالح تمدنی و سیاسی نظام بن سکے جسے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے محض اَن گھڑ افراد کو لیکر خلافت الٰہیہ قائم کرنے کے لئے دوڑ جانا ایسی خام خیالی و خام کاری ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول بَری ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات

رسالہ دینیات: یہ چھوٹی سی کتاب دینِ مقدس کی حقیقت سمجھنے اور اس کی سچائی معلوم کرنے کیلئے بہت مفید اور کارآمد ہے اور ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جو مغرب زدہ نوجوان دین اسلام کی صحیح معرفت نہ ہونے ہی کے باعث مغربی الحاد کا شکار ہو جاتے ہیں اس کتاب کا مطالعہ انشاء اللہ ان کے ایمان کی حفاظت کر سکیگا۔ پنجاب کے تمام اسلامیہ سکول اسے بطورِ نصابِ دینیات کے پڑھا رہے ہیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

تنقیحات: اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم سے جو نئے نئے مسائل اور شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں ان کے متعلق مولانا مودودی کے بیس نہایت بلند پایہ علمی تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے ہر تعلیم یافتہ مسلمان سے ہماری پرزور سفارش ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرے اس میں مغربیت کے زہر کا بہترین تریاق مہیا کیا گیا ہے قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

خطبات: یہ مولانا مودودی کے ۲۶ خطبات یا مواعظ کا مجموعہ ہے ان کی زبان بہت سہل اور طرز بیان بڑا دلکش ہے عام مسلمان ان کو پڑھ کر دین اسلام کی حقیقت اور فی زمانہ اس کے تقاضوں کو سمجھ سکتے ہیں اور اہل علم ان کے مطالعہ سے دین کو پیش کرنے اور سمجھنے کا مؤثر اور کامیاب طریقہ معلوم کر سکتے ہیں ان خطبات کے عنوانات یہ ہیں:۔

[1] مسلم اور کافر کا اصلی فرق۔ [2] مسلمان ہونے کے لئے علم دین کی ضرورت۔ [3] سوچنے کی باتیں۔ [4] کلمہ طیبہ کے معنی۔ [5] کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ۔ [6] کلمہ طیبہ پر ایمان لانے کا مقصد۔ [7] مسلمان کسے کہتے ہیں۔ [8] ایمان کی کسوٹی۔ خدا کی اطاعت کس لئے۔ [9] دین اور شریعت۔ [10] عبادت۔ [11] نماز۔ [12] نماز میں آپ کیا پڑھتے ہیں۔ [13] نماز باجماعت۔ [14] نمازیں بے اثر کیوں ہو گئیں۔ [15] روزہ اور [16] روزے کا اصل مقصد۔ [17] زکوٰۃ۔ [18] زکوٰۃ کی حقیقت۔ [19] اجتماعی زندگی میں زکوٰۃ کا مقام۔ [20] انفاق فی سبیل اللہ کے عام احکام۔ [21] زکوٰۃ کے احکام۔ [22] حج۔ [23] حج کی تاریخ۔ [24] حج کے فائدے۔ [25] حج کا عالمگیر اجتماع۔ [26] جہاد کی اہمیت۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

پردہ: اسلامی نظامِ معاشرت، اصول تمدن اور زن و مرد کے صنفی تعلقات کے متعلق اسلام نے جو حدود بندیاں کی ہیں اور جو پروگرام دیا ہے اس پر آج تک مولانا مودودی کی کتاب "پردہ" سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ہمارا کتب خانہ

حقوق الزوجین:۔ زن و مرد کے ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں۔ اسلام کا ان سے کیا مطالبہ ہے۔ اور اسلامی زندگی میں مرد و عورت کس طرح پورے اُتر سکتے ہیں یہ سب تفاصیل آپ کو اس کتاب میں ملینگی۔ اپنی نوعیت کی یہ بھی ایک پہلی تصنیف ہے اور بے حد ضروری قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

قولِ فیصل:۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا تاریخی مقدمہ جو کلکتہ میں ہوا تھا اُسمیں مولانا کا بیان و روداد (قیمت عہ)

حقیقتِ نفاق، جس طرح ایمان اور کفر کی حقیقت کا معلوم کرنا، ورلسے سمجھنا ضروری ہے اسی طرح نفاق، اس کی حقیقت، اس کی اقسام اور اس کے مضرات سے بھی واقف ہونے کی بے حد ضرورت ہے بڑی مفید اور ضروری کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ:۔ یہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ۵ ابواب کا خلاصہ ہے اگر کوئی صاحب یہ دیکھنا چاہیں کہ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں کیا لکھا ہے تو انہیں اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ قیمت عہ

شرح اسرارِ خودی۔ علامہ اقبال کی مشہور مثنوی اسرارِ خودی کے مطالب کا آسان ترجمہ اور مفید شرح ہے۔ جو حضرات علامہ اقبال کا مطالعہ کرنا چاہیں انہیں شرح اسرارِ خودی کو ضرور پڑھنا چاہیے قیمت عہ

ذہنی زلزلے۔ جناب ابو السلام نعیم صدیقی کی یہ تصنیف بڑی مقبول ہے اور پاکیزہ ادبی ذوق کا بہترین نمونہ ہے۔ قیمت دو روپے چار آنے۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب بھی ہم نے طبع کی ہیں۔ دربارِ رسول کے فیصلے قیمت للعہ اقبال پر ایک نظر ۱۲ ۔ ہندوستانی مسلمان ۱۲ ۔ محمد عبدہٗ عہ ۔ اسلامی پارٹی کا آئین عہ المنبہات عربی ایک آنہ

پتہ: اقبال اکیڈمی ۵۴ (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور

علمائے کرام کا مستقبل۔ علما کو کیا کرنا چاہئے اور وہ کیا کر رہے ہیں ۸ر
از
مولانا محمد مظہر الدین صدیقی بی اے

اشتراکیت اور اسلام۔ (ایک دلنشین موازنہ) " " " ۔ ۸ر

انتخاب غالب۔ غالب مرحوم کا اپنا انتخاب۔ ۶ر

باغی مسلمان یا ہمارے ہندستانی مسلمان (سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے بالکل صحیح اور سبق آموز حالات انگریزی سے اردو ترجمہ از ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ایل ایل ڈی آئی سی ایس بنگال) ۱۲ر

المنبھات (عربی کی مشہور کتاب جو نصائح و حکم کا ایک نادر مجموعہ ہے اور عربی پڑھنے والے بچوں کیلئے بالخصوص طبع کی گئی ہے شیخ ابن الحجر عسقلانی شارح بخاری شریف) ۵ر

اسلامی پارٹی کا آئین (مسلمانوں کی تنظیم کن خطوط پر ہونی چاہیئے۔ از مولانا عزیز ہندی) ۶ر

ہیگل کا فلسفہ (فلسفہ اضداد کی تشریح)۔ از مولانا عزیز ہندی۔ ۱۴ر

ہندوستان کے مسلمان کا نصب کیا ہے۔ " " " ۔ ۱۴ر

القول الجمیل (عربی) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۔ ۵ر

تقویۃ الایمان (اردو) حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ۔ ۸ر

جعفر منصور (خلیفہ جعفر منصور عباسی کے حالات) ابوالقاسم رفیق دلاوری۔ ۸ر

سلسلہ مطبوعات اقبال اکیڈمی

شرح اسرار خودی

پروفیسر محمد یوسف خان سلیم چشتی' بی اے کی
یہ تصنیف بے حد مقبول ہوئی ہے' اس کا دوسرا ایڈ
و اضافہ کے بعد نہایت خوبصورت اور عمدہ شکل
گیا ہے'

تعلیمات اقبال

پروفیسر محمد یوسف خان سلیم چشتی' بی
ڈاکٹر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کی پیش کردہ تعلیما
کلام سے اخذ کرکے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے' درحقی
علامہ کی تمام تصانیف کا نچوڑ ہے

اقبال پر ایک نظر

علامہ اقبال کی شاعری اور ان کی شخصیت پر
علم نے تنقید کی ہے' ہم نے اس میں سے چند
کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے' اس میں مولا
جناب سالک اور مولانا عبد السلام ندوی ایسے
ہیں'
قیمت

اقبال کے چند جواہر ریزے

خواجہ عبدالمجید صاحب' ایم اے' پروفیسر
گورنمنٹ کالج' لاہور نے
علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی صحبت میں بیٹھکر
سنا انہیں وہ گاہ بگاہ اپنی بیاض میں نوٹ فرمائے
انہی ذخائر بے بہا کا مجموعہ ہے۔
قیمت

ہمارے ہندوستانی مسلمان

ولیم ہنٹر' آئی سی ایس نے

ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے عہد میں مسلمانوں کی حالت کا جو
نقشہ کھینچا ہے اور مسلمانوں کی اسلامی ذہنیت اور اس کے
تبدیل کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ پڑھنے اور غور
کرنے کے قابل ہیں' یہ تاریخی کتاب مسلمانوں کی دماغی
کیفیت اور ان کی تحریک ہائے آزادی کا ایک مرقع ہے'
ضمناً وہابی تحریک' سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ اور
جماعت مجاہدین سرحد کی مساعی کا مختصر مگر قابل وثوق
اور نہایت سبق آموز ذکر آگیا ہے' قیمت مجلد ۲ روپے ۱۲ آنے

[illegible] پریس [illegible] روڈ لاہور میں طبع ہوا

Registered No. L. 4584

[illegible] برائے گورنمنٹ [illegible] منظور شدہ ریاست بہاولپور و ریاست بھوپال

نومبر [illegible] جلد ۹ — عدد ۵

اشاعت خاص

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم ۔ اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ ۸؍

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

اقبال پر ایک نظر - چند بلند پایہ تنقیدی اور تشریحی مضامین کا مجموعہ - چہ؍

شرحِ اسرارِ خودی - پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی اے - عہ؍

تعلیماتِ اقبال - 〃 〃 〃 - عہ؍

اقبال اور پیامِ حریت - 〃 〃 〃 - ۸؍

اقبال کا تصورِ زمان و مکان - ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی - ۱۰؍

موت و حیات اقبال کے کلام میں 〃 〃 〃 -

تعلیم کا مسئلہ - 〃 〃 〃 - عہ؍

اقبال کے چند جواہر ریزے - پروفیسر خواجہ عبد الحمید ایم اے - ۱۰؍

یادِ اقبال - مرتبہ چودھری غلام سرور فگار - عہ؍

حقیقتِ نفاق - مرتبہ مولانا صدر الدین اصلاحی - عہ؍

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی - 〃 〃 〃 - عہ؍

اسلام اور وطنیت - 〃 〃 〃 - عہ؍

معرکۂ اسلام و جاہلیت - 〃 〃 〃 - عہ؍

محمد عبدہٗ - مفتی محمد عبدہٗ مصری کے سبق آموز حالات - عہ

ماہنامہ

پیغام حق

ظفر منزل ، تاج پورہ ، لاہور

جلد ۹	نومبر ۴۴ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ	عدد ۵

سید محمد شاہ ایم۔اے پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس بیرون اکبری دروازہ لاہور میں باہتمام ملک محمد عارف خاں چھپوا کر دفتر رسالہ پیغام حق ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع کیا

قیمت سالانہ صہ روپے　　　قیمت فی پرچہ ۸ر

سخنہائے گفتنی

اکتوبر کے مہینہ میں حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا مضمون "اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر" مکمل طبع ہُوا تھا۔ اور اس مہینہ یہ دوسرا نہایت ہی اہم مضمون ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ اِن دونوں مضامین کی جو افادی حیثیت ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اگر کاغذ کی تنگی نہ ہوتی اور دوسرے ذرائع کتابت وطباعت حسبِ معمول ہوتے تو یہ مضامین ادارہ ترجمان القرآن کی طرف سے بہت پہلے کے شائع ہو چکے ہوتے۔ مگر کاغذ کی کمیابی بلکہ نایابی نے کارکنانِ ادارہ کو اس طرف توجہ دینے سے روکے رکھا ہو گا۔

میں نے دو سال تک اِن مضامین کی اشاعت کا بے چینی سے انتظار کیا مگر اب مزید انتظار نہ کر سکا اور یہ سمجھ کر کہ میری طرح ہزاروں لوگ مولانا کے اِن شاہکاروں کو حرزِ جان بنانے کے لئے بے چین ہونگے آخر اِن کو طبع کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر افسوس ہے کہ بجائے اس کے کہ لوگ میرے اِس اقدام پر میری حوصلہ افزائی کرتے، بعض حضرات نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے ادارہ ترجمان القرآن کو یہ مضامین شائع کر کے

مالی نقصان پہنچایا ہے۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ اگر ادارہ اِن مضامین کو خود شائع کرتا تو مالی فائدہ اُٹھاتا، جو اس صورت میں اُس کو نہیں پہنچ رہا۔ حالانکہ میں نے یہ سمجھ کر اِن مضامین کو شائع کیا ہے کہ میں ادارۂ ترجمان القرآن اور جماعت اسلامی ہی کا کام کر رہا ہوں جس کام کو ادارہ تین سال میں نہیں کر سکا اُس کو میں نے سرانجام دے کر جماعت کے کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اور مولانا کے ان مفید خیالات کو اپنے حلقہ میں بھی پہنچانے کے لئے سعی کی ہے۔ رہا مالی فائدہ کا سوال۔ تو اِس بارے میں میں نے مکتبۂ جماعت اسلامی کو ایک معقول کمیشن پر یہ کتابیں مہیا کرنے کی پیشکش کر دی ہے۔ اور ادارہ نے مجھ سے کافی مقدار میں یہ کتابیں طلب بھی کی ہیں۔

جہاں تک حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات کا تعلق ہے وہ یقیناً خوش ہونگے کہ اُن کی آواز کو جو بامرِ مجبوری عوام تک نہیں پہنچ رہی تھی میں نے حتی الامکان پہنچانے میں کوشش کی ہے۔ اسی طرح دوسرے مضامین مثلاً "حقیقت نفاق"، "افادات حضرت شاہ ولی اللہ" اور "معرکۂ اسلام و جاہلیت" کی اشاعت بھی میں نے مولانا کے نظریات کو پھیلانے اور جماعتِ اسلامی کا کام آگے بڑھانے کے لئے شائع کی تھیں۔ ورنہ اگر مجھے صرف دوکانداری ہی کرنی ہوتی تو کیا مجھے ایسا لٹریچر مہیا نہیں ہوتا جو ہاتھوں ہاتھ بک سکے اور مالی فائدہ کے لحاظ سے بھی بہت مفید ہو؟ ایسا لٹریچر میرے پیشِ نظر یقیناً ہے مگر جماعت اور اُس کے نظریات کو اُس کی اشاعت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اِس لئے میں نے اُسے شائع نہیں کیا۔

افسوس ہے معترضین حضرات کی ذہنیت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ نہ تو خود کوئی کام کرنے کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہیں۔ نہ دوسروں کو کچھ کرنے دیتے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ان معترضین کی اکثریت ایسی ہے کہ جن کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ مولانا کے یہ دو مضمون جو میں نے شائع کئے ہیں کوئی افادی حیثیت رکھتے ہیں، لوگوں کو اُن کی مانگ ہے اُن کے شائع کرنے سے مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور جو کوئی اِن کو آنکھیں کھول کر پڑھ لے گا اور جس کا قلبِ سلیم ان خیالات کو قبول کرلے گا۔ وہ اسلام کے مزاج

سے واقف ہو کر یقیناً بہتر مسلمان بن جائیگا۔ مگر جب میں نے ان کو شائع کر دیا ہے تو اب جماعت
اسلامی کے ملی مفاد کا درد اٹھنے لگا ہے۔ اِس لئے نہیں کہ ان کو واقعی جماعت کے مصالح سے کوئی ہمدردی
ہے بلکہ اس لئے کہ بغض و حسد سے وہ یہ نہیں دیکھ سکے کہ میں باوجود اِس کے کہ اب جماعت سے علیحدہ ہوں۔ جماعت
کا اتنا کام کر رہا ہوں کہ جو جماعت کے اندر شامل ہیں۔ اور بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں وہ بھی نہیں کر سکے۔ خداوند
کریم سے دعا ہے کہ وہ ہمارے دلوں کی تنگی کو دور کرے۔ ہماری نظروں میں وسعت دے اور ہمارے اعمال میں خلوص و
محبت پیدا کرے اور بغض و حسد سے ہمارے ذہنوں کو پاک کر دے !

"قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" مولانا کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ شرک کے ردّ اور توحید کی تائید میں
حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان سے زیادہ سائنٹفک اور بہتر کتاب اب تک میرے
دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے شرک کے استیصال اور توحید کی حمایت و توضیح میں یہ
کتاب لکھ کر اسلامی دنیا پر ایک عظیم الشان احسان کیا ہے جس چیز کو مولانا شاہ اسمٰعیل شہید نے ایک طرح بیان
کیا تھا اُسی کو مولانا نے اپنے مخصوص انداز اور بالکل انوکھے انداز سے بیان کر کے مبلّغین اسلام کی صف میں
اپنے لئے ایک ممتاز مقام بنا لیا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم مولانا کے اِس شاہکار کو مسلمانوں تک پہنچائیں
اور اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کر کے لوگوں کے غلط نظریات پر ایک کاری ضرب لگانے کی کوشش کریں۔

وما توفیقنا الّا باللہ العلی العظیم

یہ رسالہ کتابی شکل میں بھی طبع کیا گیا ہے۔ اور علاوہ دفتر اقبال اکیڈمی کے مکتبۂ جماعتِ اسلامی
دارالاسلام پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور سے بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

مقدمہ

الٰہ، ربّ، دینؔ اور عبادتؔ، یہ چار لفظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن کی ساری دعوت یہی ہے کہ اللہ تعالےٰ ہی اکیلا ربّ اور الٰہ ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی الٰہ ہے نہ ربّ، اور نہ الوہیت و ربوبیت میں کوئی اس کا شریک ہے، لہٰذا اُسی کو اپنا الٰہ اور ربّ تسلیم کرو۔ اور اُس کے سوا ہر ایک کی الٰہیت و ربوبیت سے انکار کر دو، اس کی عبادت اختیار کرو اور اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اس کے لئے اپنے دین کو خالص کر لو اور ہر دوسرے دین کو رد کر دو۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء - ۲)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے، اس کی طرف یہی وحی کی ہے کہ "میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، لہٰذا میری عبادت کرو"۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (التوبہ - ۵)

اور ان کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اسکے کہ ایک ہی الٰہ کی عبادت کریں۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ پاک ہے اُس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ڮ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء - ۶)

یقیناً تمہارا (یعنی تمام انبیاء کا) یہ گروہ ایک ہی گروہ ہے، اور میں تمہارا ربّ ہوں لہٰذا میری عبادت کرو۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (انعام - ۲۰)

کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور ربّ تلاش کروں؟ حالانکہ وہی ہر چیز کا ربّ ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (کہف-۱۲)

تو جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو، اُسے چاہیئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کی عبادت شریک نہ کرے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (نحل-۵)

ہم نے ہر قوم میں ایک رسول اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے پرہیز کرو۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (آل عمران-۹)

توکیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب چار و ناچار اسی کی مطیع ہیں اور اسی کی طرف انہیں پلٹ کر جانا چاہیئے

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ (الزمر-۲)

اے نبی کہو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں، اپنے دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ (آل عمران-۵)

اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تم سب کا رب بھی، لہذا اُسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

یہ چند آیات محض نمونہ کے طور پر ہیں، ورنہ جو شخص قرآن کو پڑھے گا وہ اوّل نظر میں محسوس کریگا کہ قرآن کا سارا بیان انہی چار اصطلاحوں کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی خیال Central idea یہی ہے کہ اللہ رب اور الٰہ ہے۔ اور ربوبیت و الٰہیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہے۔ لہذا عبادت اسی کی ہونی چاہیئے۔ اور دین خالصتہً اسی کے لئے ہونا چاہیئے۔

اصطلاحات اربعہ کی اہمیت | اب یہ ظاہر بات ہے کہ قرآن کی تعلیم کو سمجھنے کے لئے ان چاروں اصطلاحوں کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھنا بالکل ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص نہ جانتا ہو کہ الٰہ اور رب کا مطلب کیا ہے، عبادت کی کیا تعریف ہے، اور دین کسے کہتے ہیں، تو در اصل اس کے لئے پورا قرآن بے معنی

ہو جائے گا۔ وہ نہ توحید کو جان سکے گا، نہ شرک کو سمجھ سکے گا، نہ عبادت کو اللہ کے لئے مخصوص کر سکے گا، اور نہ دین ہی کو اللہ کے لئے خالص کر سکے گا۔ اسی طرح اگر کسی کے ذہن میں ان اصطلاحوں کا مفہوم غیر واضح اور نامکمل ہو تو اس کے لئے قرآن کی پوری تعلیم غیر واضح ہو گی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کا عقیدہ اور عمل دونوں نامکمل رہ جائیں گے۔ وہ لا الٰہ الا اللہ کہتا رہیگا۔ اور اس کے باوجود بتوں کو الٰہ بنا تا رہے گا۔ وہ اللہ کے سوا کسی کے رب نہ ہونے کا اعلان کرتا رہے گا۔ اور اس کے باوجود بہت سے اربابٌ من دون اللہ اس کے رب بنے رہینگے۔ وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ کہیگا کہ میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ اور پھر بھی بہت سے معبودوں کی عبادت میں مشغول رہیگا وہ پورے زور کے ساتھ کہیگا کہ میں اللہ کے دین میں ہوں، اور اگر کسی دوسرے دین کی طرف اسے منسوب کیا جائے تو لڑنے پر آمادہ ہو جائے گا، مگر اس کے باوجود بہت سے دینوں کا قلادہ اس کی گردن میں پڑا رہے گا۔ اس کی زبان سے کسی غیر اللہ کے لئے "الٰہ" اور "رب" کے الفاظ تو کبھی نکلینگے مگر یہ الفاظ جن معانی کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ اُن کے لحاظ سے اس کے بہت سے الٰہ اور ارباب ہونگے۔ اور اس بے چارے کو خبر تک نہ ہو گی کہ میں نے واقعی اللہ کے سوا دوسرے ارباب و الٰہ بنا رکھے ہیں۔ اس کے سامنے اگر آپ کہدیں کہ تو دوسروں کی "عبادت" کر رہا ہے۔ اور "دین" میں شرک کا مرتکب ہو رہا ہے تو وہ پتھر مارنے اور منہ نوچنے کے لئے دوڑیگا مگر عبادت اور دین کی جو حقیقت ہے اس کے لحاظ سے واقعی وہ دوسروں کا عابد اور دوسروں کے دین میں داخل ہو گا۔ اور نہ جانیگا کہ جو کچھ کر رہا ہوں یہ حقیقت میں دوسروں کی عبادت ہے اور یہ حالت جس میں مبتلا ہوں یہ حقیقت میں غیر اللہ کا دین ہے۔

غلط فہمی کا اصل سبب | عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا اُس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ الٰہ کے کیا معنی ہیں۔ اور رب کسے کہتے ہیں کیونکہ یہ دونوں لفظ ان کی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے،

انہیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے۔ اس لئے جب ان سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا الٰہ اور رب ہے اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں، تو وہ پوری بات کو پا گئے۔ انہیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم ہو گیا۔ کہ دوسروں کے لئے کس چیز کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ کے لئے کس چیز کو خاص کیا جا رہا ہے۔ جنہوں نے مخالفت کی یہ جان کر کی کہ غیر اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے انکار سے کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے، اور جو ایمان لائے وہ یہ سمجھ کر ایمان لائے کہ اس عقیدہ کو قبول کر کے ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہو گا۔ اسی طرح عبادت اور دین کے الفاظ بھی ان کی بولی میں پہلے سے رائج تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ عبد کسے کہتے ہیں۔ عبودیت کس حالت کا نام ہے۔ عبادت سے کونسا رویہ مراد ہے، اور دین کا کیا مفہوم ہے، اس لئے جب ان سے کہا گیا کہ سب کی عبادت چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت کرو۔ اور ہر دین سے الگ ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہو، تو انہیں قرآن کی دعوت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش نہ آئی۔ وہ سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے نظام میں کس نوعیت کے تغیر کی طالب ہے۔

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کے لئے الٰہ اور رب اور دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے۔ انہی دونوں وجوہ سے دورِ اخیر کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے۔ مثلاً لفظ الٰہ کو قریب قریب بتوں اور دیوتاؤں کا ہم معنی بنا دیا گیا، ربّ کو پالنے

پوجنے والے یا پروردگار کا مترادف ٹھیرایا گیا۔ عبادت کے معنی پوجا اور پرستش کے کیئے گئے دین کو دھرم اور مذہب اور Religion کے مقابلہ کا لفظ قرار دیا گیا، طاغوت کا ترجمہ بُت یا شیطان کیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ بناؤ، لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بتوں اور دیوتاؤں کو چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا قرآن کا منشا پورا کر دیا۔ حالانکہ الٰہ کا مفہوم اور جن چیزوں پر عائد ہوتا ہے اِن سب کو وہ اچھی طرح پکڑے ہوئے ہیں۔ اور انہیں خبر نہیں کہ یہ ہم غیر اللہ کو الٰہ بنا رہے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو رب تسلیم نہ کرو، لوگ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ کے سوا کسی کو پروردگار نہیں مانتے، لہٰذا ہماری توحید مکمل ہو گئی۔ حالانکہ رب کا اطلاق اور جن مفہومات پر ہوتا ہے اِن کے لحاظ سے اکثر لوگوں نے خدا کے بجائے دوسروں کی ربوبیت تسلیم کر رکھی ہے

قرآن کہتا ہے کہ طاغوت کی عبادت چھوڑ دو اور صرف اللہ کی عبادت کرو، لوگ کہتے ہیں کہ ہم بتوں کو نہیں پوجتے، شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں، اور صرف اللہ کو سجدہ کرتے ہیں لہٰذا ہم نے قرآن کی یہ بات بھی پوری کر دی۔ حالانکہ پتھر کے بتوں کے سوا دوسرے طاغوتوں سے وہ چمٹے ہوئے ہیں۔ اور پرستش کے سوا دوسری قسم کی تمام عبادتیں انہوں نے اللہ کے بجائے غیر اللہ کے لئے خاص کر رکھی ہیں۔ یہی حال دین کا ہے کہ اللہ کے لئے دین کو خالص کرنے کا مطلب صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی "مذہب اسلام" قبول کرے اور ہندو یا عیسائی یا یہودی نہ رہے۔ اس بنا پر ہر وہ شخص جو "مذہب اسلام" میں ہے یہ سمجھ رہا ہے کہ میں نے اللہ کے لئے دین کو خالص کر رکھا ہے۔ حالانکہ دین کے وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کا دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہے۔

غلط فہمی کے نتائج | پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ

پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم، بلکہ اسکی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آ رہے ہیں ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔ لہذا قرآن مجید کی مرکزی تعلیم اور اس کے حقیقی مدعا کو واضح کرنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان اصطلاحوں کی پوری پوری تشریح کی جائے۔

اگرچہ میں اس سے پہلے اپنے متعدد مضامین میں ان کے مفہوم پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر چکا ہوں لیکن جو کچھ اب تک میں نے بیان کیا ہے۔ وہ نہ تو بجائے خود تمام غلط فہمیوں کو صاف کرنے کے لئے کافی ہے، اور نہ اس سے لوگوں کو پوری طرح اطمینان حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ لغت اور آیات قرآنی سے استشہاد کے بغیر لوگ میری ہر تشریح کو میری ذاتی رائے سمجھتے ہیں اور میری رائے کم از کم ان لوگوں کے لئے تو اطمینان کی موجب نہیں ہو سکتی جو مجھ سے اختلاف رائے رکھتے ہوں۔ اس مضمون میں میں کوشش کرونگا کہ ان چاروں اصطلاحوں کا مکمل مفہوم واضح کروں، اور کوئی ایسی بات بیان نہ کروں جس کا ثبوت لغت اور قرآن سے نہ ملتا ہو۔

ابوالاعلیٰ مودودی

اِلٰہ

ترتیب کے لحاظ سے ہم سب سے پہلے لفظ اِلٰہ کو لینگے۔ پھر رب، پھر عبادت، پھر دین۔

لغوی تحقیق | اس لفظ کا مادّہ ا ل ہ ہے۔ اس مادّہ سے جو الفاظ لغت میں آئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:-

اَلِہَ اِذَا تحیّر، یعنی حیران و سرگشتہ ہُوا۔

اَلِھتُ الیٰ فلانٍ ای سکنتُ الیہ، یعنی اس کی پناہ میں جا کر یا اس سے تعلق پیدا کر کے میں نے سکون و اطمینان حاصل کیا۔

اَلِہَ الرجل یأْلہ اذا فزع من امر نزل بہ فآلھہٗ غیرہ ای اجارہ۔ یعنی آدمی کسی مصیبت یا تکلیف کے نزول سے خوف زدہ ہوا اور دوسرے نے اس کو پناہ دی۔

الہ الرجلِ الی الرجلِ اِتجہ الیہ لشدۃ شوقہٖ الیہ آدمی نے دوسرے کی طرف شدت شوق کی وجہ سے توجہ کی۔

الِہ الفصیل اذا ولع بامہ۔ اونٹنی کا بچہ جو اس سے بچھڑ گیا تھا ماں کو پاتے ہی اس سے چمٹ گیا۔

لاہ یلیہ لیھا ولاھا اذا احتجب یعنی پوشیدہ و مستور ہوا۔ نیز ارتفع یعنی بلند ہُوا۔

اَلَہَ اِلٰھَۃً واُلُوھۃً والوھیۃً عَبَدَ یعنی عبادت کی۔

ان تمام معانی مصدریہ پر غور کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اَلَہَ یَأْلَہُ اِلٰھَۃً کے معنی عبادت (پرستش) اور الٰہ کے معنی معبود کس مناسبت سے پیدا ہوئے۔

انسان کے ذہن میں عبادت کے لئے اوّلین تحریک اپنی حاجتمندی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی

کی حاجت کا خیال تک نہیں کرسکتا جب تک اسے یہ گمان نہ ہو کہ وہ میری حاجتیں پوری کرسکتا ہے، خطرات اور مصائب میں مجھے پناہ دے سکتا ہے۔ اضطراب کی حالت میں مجھے سکون بخش سکتا ہے۔

پھر یہ بات کہ آدمی کسی کو حاجت روا سمجھے اس تصور کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتی ہے کہ وہ اسے اپنے سے بالاتر سمجھے اور نہ صرف مرتبہ کے اعتبار سے اس کی برتری تسلیم کرے بلکہ طاقت اور زور کے اعتبار سے بھی اس کی بالادستی کا قائل ہو۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سلسلۂ اسباب و علل کے تحت جن چیزوں سے بالعموم انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور جن کی حاجت روائی کا سارا عمل انسان کی آنکھوں کے سامنے یا اسکے حدودِ علم کے اندر واقع ہوتا ہے ان کے متعلق پرستش کا کوئی جذبہ اس میں پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً مجھے خرچ کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی ہے، میں جاکر ایک شخص سے نوکری یا مزدوری کی درخواست کرتا ہوں، وہ میری درخواست کو قبول کرکے مجھے کوئی کام دیتا ہے۔ اور اس کام کا معاوضہ مجھے دے دیتا ہے، یہ سارا عمل چونکہ میرے حواس اور علم کے دائرے کے اندر پیش آیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس نے میری یہ حاجت کس طرح پوری کی ہے اس لئے میرے ذہن میں اس کے لائق پرستش ہونے کا وہم تک نہیں گذرتا۔ پرستش کا تصور میرے ذہن میں صرف اسی حالت میں پیدا ہوسکتا ہے جبکہ کسی کی شخصیت یا اس کی طاقت یا اس کی حاجت روائی و اثر اندازی کی کیفیت پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اسی لئے معبود کے معنی میں وہ لفظ اختیار کیا گیا جس کے اندر رفعت کے ساتھ پوشیدگی اور حیرانی و سرگشتگی کا مفہوم بھی شامل ہے۔

پھر جس کے متعلق بھی انسان یہ گمان رکھتا ہو کہ وہ احتیاج کی حالت میں حاجت روائی کرسکتا ہے، خطرات میں پناہ دے سکتا ہے، اضطراب میں سکون بخش سکتا ہے، اس کی طرف انسان کا اشتیاق کے

ساتھ توجہ کرنا ایک امر ناگزیر ہے۔

پس معلوم ہوا کہ معبود کیلئے الٰہ کا لفظ جن تصورات کی بنا پر بولا گیا وہ یہ ہیں۔ حاجت روائی، پناہ دہندگی، سکون بخشی، بالاتری و بالادستی۔ ان اختیارات اور ان طاقتوں کا مالک ہونا جن کی وجہ سے یہ توقع کی جائے کہ معبود قاضی الحاجات اور پناہ دہندہ ہو سکتا ہے۔ اس کی شخصیت کا پُراسرار ہونا یا منظرِ عام پر نہ ہونا۔ انسان کا اس کی طرف مشتاق ہونا۔

اہلِ جاہلیت کا تصورِ الٰہ | اس لغوی تحقیق کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ الوہیت کے متعلق اہلِ عرب و امم قدیمہ کے وہ کیا تصورات تھے جن کی تردید قرآن کرنا چاہتا ہے :

(۱) وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا (مریم-۵)

اور انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا رکھے ہیں تاکہ وہ انکے لئے ذریعہ قوت ہوں (یا انکی حمایت میں آکر وہ محفوظ ہیں)

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُونَ (یٰس-۵)

اور انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا لئے ہیں اس امید پر کہ ان کی مدد کی جائیگی۔ (یعنی وہ الٰہ ان کی مدد کرینگے)

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جاہلیت جنکو الٰہ کہتے تھے انکے متعلق وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کے پشتیبان ہیں، مشکلات اور مصائب میں انکی حفاظت کرتے ہیں۔ اور ان کی حمایت میں وہ خوف اور نقصان سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

(۲) فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ (ہود-۹)

پھر جب تیرے رب کے فیصلہ کا وقت آگیا تو انکے وہ الٰہ جنہیں وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ بھی کام نہ آسکے اور وہ انکے لئے تباہی و ہلاکت کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ کا سبب نہ بنے۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ

اور اللہ کے بجائے جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں

لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ وَّمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ (النحل-۳)	وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں ہیں۔ بلکہ خود مخلوق ہیں مُردہ ہیں نہ کہ زندہ، اور انہیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ انہیں کب دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائیگا۔ تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے
لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ، لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (قصص-۹)	اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہ پکار، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔
وَمَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ شُرَکَآءَ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ (یونس-۷)	جو لوگ اللہ کے بجائے دوسرے شریکوں کو پکارتے ہیں وہ محض وہم پر چلتے ہیں اور نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

ان آیات سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ اہل جاہلیت جن کو الٰہ کہتے تھے، انہیں مشکل کشائی و حاجت روائی کے لئے پکارتے یا بالفاظِ دیگر ان سے دعا مانگتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کے یہ الٰہ صرف جن یا فرشتے یا دیوتا ہی نہ تھے بلکہ وفات یافتہ انسان بھی تھے، جیسا کہ اموات غیر احیاءٍ وما یشعرون ایان یبعثون سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان الٰہوں کے متعلق وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ان کی دعاؤں کو سنتے ہیں۔ اور ان کی مدد کو پہنچنے پر قادر ہیں۔

یہاں دعا کے مفہوم اور اس کی نوعیت کو ذہن نشین کرلینا ضروری ہے جس کی الٰہ سے توقع کی جاتی ہے۔ اگر مجھے پیاس لگتی ہے اور میں اپنے خادم کو پانی لانے کے لئے پکارتا ہوں یا اگر میں بیمار ہوتا ہوں اور علاج کے لئے ڈاکٹر کو بلاتا ہوں تو اس پر نہ دعا کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ اسکے معنی خادم یا ڈاکٹر کو الٰہ بنانے کے ہیں کیونکہ یہ سب کچھ سلسلہ اسباب کے تحت ہے نہ کہ اس سے مافوق۔ لیکن اگر میں پیاس کی حالت میں یا بیماری میں خادم یا ڈاکٹر کو پکارنے کے بجائے کسی ولی یا کسی دیوتا کو پکارتا

ہوں، تو یہ ضرور اس کو الٰہ بنانا اور اس سے دعا مانگنا ہے۔ کیونکہ جو ولی صاحب مجھ سے سینکڑوں میل دور کسی قبر میں آرام فرما رہے ہیں ان کو پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ میں ان کو سمیع و بصیر سمجھتا ہوں اور یہ خیال رکھتا ہوں کہ عالم اسباب پر انکی فرمانروائی قائم ہے جسکی وجہ سے وہ مجھ تک پانی پہنچانے یا میری بیماری دور کر دینے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ایسی حالت میں کسی دیوتا کو پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ پانی یا صحت و مرض پر اس کی حکومت ہے۔ اور وہ فوق الطبیعی طور پر میری حاجت پوری کرنے کے لئے اسباب کو حرکت دے سکتا ہے پس الٰہ کا وہ تصور جس کی بنا پر اس سے دعا مانگی جاتی ہے لامحالہ ایک فوق الطبیعی اقتدار اور اس کے ساتھ ہی فوق الطبیعی قوتوں کے مالک ہونے کا تصور ہے۔

(۳) وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۔ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (احقاف - ۴)

تمہارے اردگرد جن بستیوں کے آثار ہیں انکو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ انہیں ہم نے بار بار بدل بدل کر اپنی نشانیاں دکھائی تھیں تاکہ وہ رجوع کریں۔ تو جنکو انہوں نے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اللہ کے سوا اپنا الٰہ بنایا تھا انہوں نے نزول عذاب کے وقت کیوں نہ انکی مدد کی؟ مدد تو درکنار وہ تو انہیں چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ یہ تھی حقیقت ان کے جھوٹ اور ان کی من گھڑت باتوں کی۔

وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ (۳۶-۲)

کیوں نہ میں اسکی عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جسکی طرف تم سب کو پلٹنا ہے؟ کیا اسکے سوا میں انکو الٰہ بناؤں جن کا حال یہ ہے کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو انکی سفارش میرے کچھ کام نہیں آسکتی اور وہ مجھے چھڑا نہیں سکتے؟

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ، مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی، اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ فِیْمَا ھُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ (الزمر - ۱)

اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے حامی یا کارساز ٹھیرا رکھے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو انکی عبادت اسلئے کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے قریب کردیں، اللہ انکے درمیان اس معاملہ کا فیصلہ (قیامت کے روز) کریگا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ (یونس - ۲)

وہ اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچانے پر قادر ہیں نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

ان آیات سے چند مزید باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جاہلیت اپنے الٰہوں کے متعلق یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ساری خدائی انہی کے درمیان تقسیم ہوگئی ہے۔ اور ان کے اوپر کوئی خداوند اعلےٰ نہیں ہے۔ وہ واضح طور پر ایک خداوند اعلےٰ کا تصوّر رکھتے تھے جس کے لئے ان کی زبان میں اللہ کا لفظ تھا۔ اور دوسرے الٰہوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس خداوند اعلےٰ کی خدائی میں ان الٰہوں کا کچھ دخل اور اثر ہے۔ ان کی بات مانی جاتی ہے۔ ان کے ذریعہ سے ہمارے کام بن سکتے ہیں، ان کی سفارش سے ہم نفع حاصل کرسکتے ہیں۔ اور نقصانات سے بچ سکتے ہیں۔ انہی خیالات کی بنا پر وہ اللہ کے ساتھ اُن کو بھی الٰہ قرار دیتے تھے۔ لہذا اُن کی اصطلاح کے لحاظ سے جس کے متعلق بھی یہ خیالات رکھے جائیں وہ الٰہ ہے۔ یا بالفاظ دیگر کسی کے متعلق یہ خیالات رکھنا اُسے الٰہ بنانا ہے۔

(۴) وَقَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـھَیْنِ اثْنَیْنِ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنَ (النحل - ۷)

اللہ فرماتا ہے کہ دو الٰہ نہ بناؤ، الٰہ تو ایک ہی ہے۔ لہذا تم مجھی سے ڈرو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کی ناراضی سے خوف کیا جائے اور جس کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ اگر ہم اس کی توجہ اور عنایت سے محروم ہوگئے تو نقصان اٹھائیں گے وہ الٰہ ہے۔ دوسرے لفاظ میں الٰہ کے تصور میں اس کے لائق خوف وحذر ہونے کا تصور بھی شامل ہے۔

(۵) اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (التوبہ - ۵)

انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی رب ٹھیرایا حالانکہ انہیں صرف ایک الٰہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (الفرقان - ۴)

تیرا کیا خیال ہے اس شخص کے متعلق جس نے اپنی خواہش نفس کو الٰہ بنا لیا ہے؟ کیا تو اسکی ذمہ داری لے سکتا ہے؟

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ (انعام - ۱۶)

اس طرح بہت سے مشرکوں کیلئے انکے ٹھیرائے ہوئے شرکاء (یعنی شرکاء فی الالوہیت) نے اپنی اولاد کو قتل کرنیکا فعل خوشنما بنا دیا

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (الشوریٰ - ۳)

یا وہ ایسے شرکاء (یعنی شرکاء فی الالوہیت) رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لئے از قسم دین ایسی شریعت مقرر کی ہے جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی؟

ان آیات میں الٰہ کا ایک اور مفہوم ملتا ہے جو پہلے مفہومات سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں فوق الطبیعی اقتدار کا کوئی تصور نہیں ہے جس کو الٰہ بنایا گیا ہے وہ یا تو کوئی انسان ہے یا انسان کا اپنا نفس ہے۔ اور الٰہ اس کو اس معنی میں نہیں بنایا گیا ہے، کہ اس سے دعا مانگی جاتی ہو یا اسے نفع و نقصان کا مالک سمجھا جاتا ہو۔ اور اس کی پناہ ڈھونڈی جاتی ہو، بلکہ وہ الٰہ اس معنی میں بنایا گیا ہے کہ اس کے حکم کو قانون تسلیم کیا گیا، اس کے امرونہی کی اطاعت کی گئی، اس کے حلال کو حلال اور اسکے حرام کو

حرام مان لیا گیا، اور یہ خیال کر لیا گیا کہ اس کو بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ کوئی اور اقتدار اس سے بالاتر نہیں ہے جس کی سند لینے اور جس سے رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔ پہلی آیت میں علماء اور راہبوں کو الٰہ بنانے کا ذکر ہے۔ اس کی واضح تشریح ہم کو حدیث میں ملتی ہے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کے متعلق نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ جس چیز کو تمہارے علماء اور راہبوں نے حلال کیا اسے تم لوگ حلال مان لیتے تھے اور جسے انہوں نے حرام قرار دیا اُسے تم حرام تسلیم کر لیتے تھے۔ اور اس بات کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے کہ اللہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے۔ رہی دوسری آیت تو اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جو شخص اپنی خواہش نفس کی اطاعت کرتا ہو اور اسی کے حکم کو بالاتر رکھتا ہو وہ دراصل اپنے نفس ہی کو اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہے۔ اس کے بعد والی دونوں آیتوں میں اگرچہ الٰہ کے بجائے شریک کا لفظ آیا ہے، مگر جیسا کہ ہم نے ترجمہ میں واضح کیا ہے، شریک سے مراد الٰہیت میں شریک ٹھیرانا ہے، اور یہ دونوں آیتیں صاف فیصلہ کرتی ہیں کہ جو لوگ اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے مقرر کئے ہوئے رواج یا ضابطہ یا طریقہ کو جائز قانون سمجھتے ہیں وہ اُس قانون ساز کو الٰہیت میں خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں۔

الوہیت کے باب میں ملاک امر | الٰہ کے یہ جتنے مفہومات اوپر بیان ہوئے ہیں ان سب کے درمیان ایک منطقی ربط ہے۔ جو شخص فوق الطبیعی معنی میں کسی کو اپنا حامی و مددگار، مشکل کشا اور حاجت روا، دعاؤں کا سننے والا اور نفع یا نقصان پہنچانے والا سمجھتا ہے اس کے ایسا سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک وہ ہستی نظام کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت کا اقتدار رکھتی ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی سے تقوے اور خوف کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کی ناراضی میرے لئے نقصان کی اور رضامندی میرے لئے فائدے کی موجب ہے اُس کے اس اعتقاد اور اس عمل کی وجہ بھی

اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے ذہن میں اس ہستی کے متعلق ایک طرح کے اقتدار کا تصور رکھتا ہے پھر جو شخص خداوند اعلیٰ کو ماننے کے باوجود اس کے سوا دوسروں کی طرف اپنی حاجات کے لئے رجوع کرتا ہے۔ اس کے اس فعل کی علت بھی صرف یہی ہے کہ خداوندی کے اقتدار میں وہ انکو کسی نہ کسی طرح کا حصہ دار سمجھ رہا ہے۔ اور علیٰ ہذا القیاس وہ شخص جو کسی کے حکم کو قانون اور کسی کے امرونہی کو اپنے لئے واجب الاطاعت قرار دیتا ہے۔ وہ بھی اس کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتا ہے۔ پس الوہیت کی اصل روح اقتدار ہے، خواہ وہ اقتدار اس معنی میں سمجھا جائے کہ نظام کائنات پر اس کی فرمانروائی فوق الطبیعی نوعیت کی ہے یا وہ اس معنی میں تسلیم کیا جائے کہ دنیوی زندگی میں انسان اس کے تحت امر ہے اور اس کا حکم بذات خود واجب الاطاعت ہے۔

قرآن کا استدلال یہی اقتدار کا تصور ہے جس کی بنیاد پر قرآن اپنا سارا زور غیر اللہ کی الٰہیت کے انکار اور صرف اللہ کی الٰہیت کے اثبات پر صرف کرتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ زمین اور آسمان میں صرف ایک ہی ہستی تمام اختیارات و اقتدارات کی مالک ہے خلق اسی کی ہے، نعمت اسی کی ہے، امر اسی کا ہے، قوت اور زور بالکل اس کے ہاتھ میں ہے، ہر چیز چاروناچار اسی کی اطاعت کر رہی ہے، اس کے سوا نہ کسی کے پاس کوئی اقتدار ہے، نہ کسی کا حکم چلتا ہے، نہ کوئی خلق اور تدبیر اور انتظام کے رازوں سے واقف ہے۔ اور نہ کوئی اختیارات حکومت میں ذرہ برابر شریک و حصہ دار ہے، لہٰذا اس کے سوا حقیقت میں کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اور جب حقیقت میں کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے تو تمہارا ہر وہ فعل جو تم دوسروں کو الٰہ سمجھتے ہوئے کرتے ہو اصلاً غلط ہے۔ خواہ وہ دعا مانگنے یا پناہ ڈھونڈنے کا فعل ہو، یا خوف و رجا کا فعل ہو، یا سفارشی بنانے کا فعل ہو، یا حکم ماننے اور اطاعت کرنے کا فعل ہو۔ یہ تمام تعلقات جو تم نے دوسروں سے قائم کر رکھے ہیں، صرف اللہ کے لئے مخصوص ہونے چاہئیں کیونکہ وہی اکیلا صاحب اقتدار ہے۔

اس باب میں قرآن جس طریقے سے استدلال کرتا ہے وہ اسی کی زبان سے سنیئے:۔

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (الزخرف - ۷)	وہی ہے جو آسمان میں بھی اکیلا الٰہ ہے اور زمین میں بھی وہی الٰہ ہے۔ اور وہی حکیم اور علیم ہے (یعنی آسمان و زمین میں حکومت کرنے کے لیے جس علم اور حکمت کی ضرورت ہے وہ اسی کے پاس ہے)
أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ .... وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ .... إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (النحل ۲-۳)	تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور جو پیدا نہیں کرتا، دونو یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی؟ ..... خدا کو چھوڑ کر یہ جن دوسروں کو پکارتے ہیں وہ تو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں .... تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (فاطر - ۱)	لوگو! تم پر اللہ کا جو احسان ہے اس کا دھیان کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے پھر تم کدھر بھٹکائے جا رہے ہو؟
قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ (انعام - ۵)	کہو تم نے کبھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری سننے اور دیکھنے کی قوتیں سلب کر لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے (یعنی عقل چھین لے) تو اللہ کے سوا اور کونسا الٰہ ہے جو یہ چیزیں تمہیں لا دے گا۔
وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ وَلَهُ	وہی اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ اسی کے لیے تعریف ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ. قُلْ أَرَأَيْتُمْ
إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ
بِضِيَاءٍ أَفَلَا تَسْمَعُونَ. قُلْ أَرَأَيْتُمْ
إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ
بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ أَفَلَا تُبْصِرُونَ
(قصص - ۷)

وہی اکیلا صاحب حکم و اقتدار ہے۔ اور اسی کیطرف
تم پلٹائے جانے والے ہو۔ کہو تم نے کبھی غور کیا
کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیئے رات طاری کردے تو
اسکے سوا کونسا دوسرا الٰہ ہے جو تمہیں روشنی لادیگا؟
کیا تم سنتے نہیں ہو؟ کہو تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا
کہ اگر اللہ تمہارے اوپر ہمیشہ کے لئے دن طاری کردے
تو اسکے سوا اور کونسا الٰہ ہے جو تمہیں رات لادیگا۔
کہ اس میں تم سکون حاصل کرو؟ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ
دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ
فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا
لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ
مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ
عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ (السبا - ۳)

کہو کہ اللہ کے سوا جن کو تم نے الٰہ سمجھ رکھا ہے انہیں
پکار دیکھو، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کسی چیز کے
مالک ہیں اور نہ زمین میں، نہ آسمان و زمین کے انتظام
میں ان کی کوئی شرکت ہے، نہ ان میں سے کوئی
اللہ کا مددگار ہے، اور نہ اللہ کے ہاں کوئی سفارش
کام آتی ہے، بجز اس کے جس کے حق میں اللہ خود
ہی سفارش کی اجازت دے۔

خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ
يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ
النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى....

اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کیساتھ پیدا کیا ہے
وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر چڑھا کر لاتا ہے۔
اس نے سورج اور چاند کو تابع کر رکھا ہے اور ہر ایک
اپنی مدت مقررۃ تک چل رہا ہے ....

.....خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْأَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ أَزْوَاجٍ يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُوْنِ أُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (الزمر - ۱)

.....اُس نے ایک نفس سے تمہاری پیدائش کی ابتدا کی (یعنی نسلِ انسانی کا آغاز کیا) پھر اسی نفس سے اس کا جوڑا بنایا اور تمہارے لیے مویشیوں کے آٹھ جوڑے اتارے۔ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ میں اس طرح پیدا کرتا ہے کہ تین پردوں[۱] کے اندر تمہاری تخلیق کے یکے بعد دیگرے کئی مدارج طے ہوتے ہیں۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے، اقتدارِ حکومت اسی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، پھر تم کدھر پھیرے جا رہے ہو؟

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا، ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ۔ أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَا أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا، ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْأَرْضِ، ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، قَلِيْلًا

کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر وہ خوش منظر باغ اگائے جنکے درخت اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں شریک ہے؟ مگر یہ لوگ حقیقت سے منہ موڑتے ہیں۔ پھر وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس میں دریا جاری کئے اور اس کے لئے پہاڑوں کو لنگر بنایا اور دو سمندروں کے درمیان پردہ حائل کیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ مگر اکثر مشرکین بے علم ہیں پھر وہ کون ہے جو اضطرار کی حالت میں آدمی کی

[۱] تین پردوں سے مراد پیٹ، رحم اور مشیمہ ہے۔

مَّا تَذَكَّرُونَ ۔ أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي	سنتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے۔ اور وہ کون
ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ	ہے جو تم کو زمین میں خلیفہ بناتا ہے (یعنی تصرف کے
الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ءَاِلٰهٌ	اختیارات دیتا ہے) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور
مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔	الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ مگر تم کم ہی
أَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ	دھیان کرتے ہو۔ پھر وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور تری
وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ	کے اندھیاروں میں راستہ دکھاتا ہے۔ اور کون اپنی
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ	رحمت (یعنی بارش) سے پہلے خوشخبری لانیوالی
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (النمل-۵)	ہوائیں بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان

کاموں میں بھی شریک ہے؟ اللہ بالاتر ہے ان کے اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔ پھر وہ کون ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا اور اس کا اعادہ کرتا ہے۔ اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے۔ کہو اگر تم اپنے شرک میں سچے ہو تو اس پر دلیل[1] لاؤ۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ	وہ جو آسمانوں اور زمین کی حکومت کا مالک ہے
وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ	اور جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے۔ اور اقتدار حکومت
يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ	میں جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور جس نے ہر چیز کو پیدا
كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا وَاتَّخَذُوْا	کیا اور ہر چیز کیلئے پورا پورا اندازہ مقرر کیا ہے،
مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا	لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے الٰہ بنا لئے ہیں جو کسی چیز کو
وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ	پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں، جو خود اپنے

---

[1] یعنی اگر تم مانتے ہو کہ یہ سب کام اللہ ہی کے ہیں اور ان کاموں میں کوئی اسکا شریک نہیں ہے تو آخر کس دلیل سے تم الٰہیت میں اسکے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے ہو جبکہ اُن کے پاس اقتدار نہیں اور زمین و آسمان میں جنکا کوئی خود مختارانہ کام نہیں وہ الٰہ کیسے ہو گئے؟

لَا نَفْسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (الفرقان-۱)

ذات کے لیے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور جنکو موت اور زندگی اور دوبارہ پیدائش پر کسی قسم کا اقتدار حاصل نہیں ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَّخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ - (انعام-۱۲)

آسمان و زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا اسکا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اسکی کوئی بیوی نہیں ہے، اس نے تو ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب، کوئی اسکے سوا الٰہ نہیں ہے، ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو اور وہی ہر چیز کی حفاظت و خبرگیری کا کفیل ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (بقرہ-۲۰)

بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو خدائی میں اس کا شریک و مماثل قرار دیتے ہیں اور اللہ کی طرح ان کو بھی محبوب رکھتے ہیں۔ حالانکہ جو ایمان لانے والے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ کاش یہ ظالم اس حقیقت کو جسے نزول عذاب کے وقت محسوس کرینگے آج ہی محسوس کر لیتے کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے پاس ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (احقاف-۱)

کہو تم نے اپنے ان معبودوں کی حالت پر کبھی غور بھی کیا جنہیں تم خدا کے بجائے حاجت روائی کیلئے پکارتے ہو؟ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین کا کتنا حصہ ان کا بنایا ہوا ہے اور آسمانوں کی پیدائش میں ان کی کس قدر شرکت ہے؟ ..... اس سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر

کسی ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ، لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ (انبیاء - ۲)

اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور بھی الٰہ ہوتے تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا پس اللہ جو عرش (یعنی کائنات کے تخت سلطنت) کا مالک ہے اُن تمام باتوں سے پاک ہے جو یہ اسکی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ اپنے کسی فعل کے لئے جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (المومنون - ۵)

اللہ نے نہ کوئی بیٹا بنایا اور نہ اسکے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کو لے کر الگ ہو جاتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔

قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا، سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا (بنی اسرائیل - ۵)

اے نبی کہو کہ اگر اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ ہوتے جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے تو وہ مالک عرش کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لئے ضرور تدبیریں تلاش کرتے۔ پاک ہے وہ اور بہت بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ان تمام آیات میں اوّل سے آخر تک ایک ہی مرکزی خیال پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ الٰہیت اور اقتدار لازم و ملزوم ہیں۔ اور اپنی روح و معنی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ جو اقتدار نہیں رکھتا وہ الٰہ نہیں ہو سکتا اور اسے الٰہ نہ ہونا چاہیئے۔ اور جو اقتدار رکھتا ہے وہی الٰہ ہو سکتا ہے اور اسی کو الٰہ ہونا چاہیئے، کیونکہ الٰہ سے تمہاری جس قدر ضروریات متعلق ہیں، یا جن ضروریات کی خاطر تمہیں کسی کو الٰہ ماننے کی حاجت پیش آتی ہے ان میں سے کوئی ضرورت بھی اقتدار کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا غیر مقتدر کا الٰہ ہونا بے معنی ہے،

حقیقت کے خلاف ہے۔ اور اس کی طرف رجوع کرنا لاحاصل ہے۔

اس مرکزی خیال کو لے کر قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے اسکے مقدمات اور نتائج حسب ذیل ترتیب کے ساتھ اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں۔

(۱) حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی، امداد و اعانت، خبرگیری و حفاظت، و استجابت دعوات جن کو تم نے معمولی کام سمجھ رکھا ہے دراصل یہ معمولی کام نہیں ہیں بلکہ ان کا سررشتہ پورے نظام کائنات کی تخلیقی اور انتظامی قوتوں سے جاملتا ہے۔ تمہاری ذرا ذرا سی ضروریات جس طرح پوری ہوتی ہیں اس پر غور کرو تو تم کو معلوم ہو کہ زمین و آسمان کے عظیم الشان کارخانہ میں بیشمار اسباب کی مجموعی حرکت کے بغیر ان کا پورا ہونا محال ہے۔ پانی کا ایک گلاس جو تم پیتے ہو اور گیہوں کا ایک دانہ جو تم کھاتے ہو، اس کو مہیا کرنے کے لئے سورج اور زمین اور ہواؤں اور سمندروں کو خدا جانے کتنا کام کرنا پڑتا ہے، تب کہیں یہ چیزیں تم کو بہم پہنچتی ہیں۔ پس تمہاری دعائیں سننے اور تمہاری حاجتیں رفع کرنے کے لئے کوئی معمولی اقتدار نہیں بلکہ وہ اقتدار درکار ہے، جو زمین و آسمان کو پیدا کرنے کے لئے، سیاروں کو حرکت دینے کے لئے، ہواؤں کو گردش دینے اور بارش برسانے کے لئے، غرض پوری کائنات کا انتظام کرنے کے لئے درکار ہے۔

(۲) یہ اقتدار ناقابل تقسیم ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خلق کا اقتدار کسی کے پاس ہو، اور رزق کا کسی اور کے پاس، سورج کسی کے قبضہ میں ہو اور زمین کسی اور کے قبضہ میں، پیدا کرنا کسی کے اختیار میں ہو، بیماری و صحت کسی اور کے اختیار میں، اور موت اور زندگی کسی تیسرے کے اختیار میں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ نظام کائنات کبھی چل ہی نہ سکتا۔ لہٰذا تمام اقتدارات و اختیارات کا ایک ہی مرکزی فرمانروا کے قبضہ میں ہونا ضروری ہے، کائنات کا انتظام چاہتا ہے کہ ایسا ہو، اور فی الواقع ایسا ہی ہے۔

(۳) جب تمام اقتدار ایک ہی فرمانروا کے ہاتھ میں ہے اور اقتدار میں کسی کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں ہے تو لامحالہ الوہیت بھی بالکلیہ اُسی فرمانروا کے لئے خاص ہے۔ اور اسمیں بھی کوئی حصہ دار نہیں ہے۔ کسی میں یہ طاقت نہیں کہ تمہاری فریادرسی کرسکے، دعائیں قبول کرسکے۔ پناہ دے سکے، حامی و ناصر اور ولی و کارساز بن سکے، نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ لہذا الٰہ کا جو مفہوم بھی تمہارے ذہن میں ہے اسکے لحاظ سے کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کوئی اس معنی میں بھی الٰہ نہیں کہ فرمانروائے کائنات کے ہاں مقرب بارگاہ ہونے کی حیثیت ہی سے اس کا کچھ زور چلتا ہو اور اس کی سفارش مانی جاتی ہو۔ اسکے انتظام سلطنت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، کوئی اسکے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا، اور سفارش قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اسی کے اختیار میں ہے، کوئی زور کسی کے پاس نہیں ہے کہ اُس کے بل پر وہ اپنی سفارش قبول کرا سکے۔

(۴) اقتدار اعلیٰ کی واحدانیت کا اقتضا یہ ہے کہ حاکمیت فرمانروائی کی جتنی قسمیں ہیں سب ایک ہی مقتدر اعلیٰ کی ذات میں مرکوز ہوں اور حاکمیت کا کوئی جز بھی کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو۔ جب خالق وہ ہے اور خلق میں کوئی اسکے ساتھ شریک نہیں، جب رازق وہ ہے اور رزق رسانی میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب پورے نظام کائنات کا مدبر و منتظم وہ ہے اور تدبیر و انتظام میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، تو یقیناً حاکم اور آمر اور شارع بھی اسی کو ہونا چاہیئے۔ اور اقتدار کی اس شق میں بھی کسی کے شریک ہونے کی کوئی وجہ نہیں جس طرح اسکی سلطنت کے دائرے میں اُس کے سوا کسی دوسرے کا فریادرس اور حاجت روا اور پناہ دہندہ ہونا غلط ہے اُسی طرح کسی دوسرے کا مستقل بالذات حاکم اور خودمختار فرمانروا اور آزاد قانون ساز ہونا بھی غلط ہے۔ تخلیق اور رزق رسانی، احیاء اور اماتت، تسخیر شمس و قمر اور تکویر لیل و نہار قضاء اور قدر، حکم اور بادشاہی، امر اور تشریع سب ایک ہی کلّی اقتدار و حاکمیت کے مختلف پہلو

ہیں اور یہ اقتدار و حاکمیت ناقابل تقسیم ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھتا ہے تو وہ ویسا ہی شرک کرتا ہے جیسا ایک غیر اللہ سے دعا مانگنے والا شرک کرتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص سیاسی معنی میں مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہونے کا دعوے کرتا ہے تو اُس کا یہ دعوے بالکل اسی طرح خدائی کا دعویٰ ہے جس طرح فوق الطبیعی معنی میں کسی کا یہ کہنا کہ میں تمہارا ولی و کارساز اور مددگار و محافظ ہوں۔ اسی لئے جہاں خلق اور تقدیر اشیاء اور تدبیر کائنات میں اللہ کے لاشریک ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہیں لَہُ الحُکمُ اور لَہُ المُلکُ اور لَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ بھی کہا گیا ہے۔ جو اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ الوہیت کے مفہوم میں پادشاہی و حکمرانی کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اور توحید الٰہ کے لئے لازم ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے بھی اللہ کے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کی جائے۔ اس کو اور زیادہ کھول کر حسب ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے:۔

قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ (آل عمران - ۳)	کہو یا اللہ تو جو ملک کا مالک ہے، تجھے اختیار ہے جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسکو چاہے ذلیل کردے۔
فَتَعٰلَی اللّٰہُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِیْمِ (المومنون)	پس بالا و برتر ہے اللہ حقیقی پادشاہ ہے، اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ عرش بزرگ کا مالک ہے۔
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰہِ النَّاسِ (الناس)	کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب سے، انسانوں کے پادشاہ سے، انسانوں کے الٰہ سے۔

اور اس سے زیادہ تصریح سورہ مومن میں ہے۔ جہاں فرمایا۔

يَوْمَ هُم بَارِزُونَ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ، لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ

یعنی جس روز سب لوگ بے نقاب ہوں گے کسی کا کوئی راز اللہ سے چھپا نہ ہوگا، اس وقت پکارا جائے گا کہ آج پادشاہی کس کی ہے؟ اور جواب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ اس اکیلے اللہ کی جس کا اقتدار سب پر غالب ہے۔

اس آیت کی بہترین تفسیر وہ حدیث ہے جو امام احمد نے حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

اِنَّهُ تعالیٰ یطوی السّمٰوٰت والارض بیدہٖ ثم یقول انا الملک انا الجبار انا المتکبر، این ملوک الارض؟ این الجبارون - این المتکبرون؟

اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو اپنی مٹھی میں لے کر پکاریگا میں ہوں پادشاہ، میں ہوں جبار، میں ہوں متکبر، کہاں ہیں وہ جو زمین میں بادشاہ بنتے تھے۔ کہاں ہیں جبار؟ کہاں ہیں متکبر؟

عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ جس وقت حضور خطبہ میں یہ الفاظ فرمارہے تھے اس وقت آپؐ پر ایسا لرزہ طاری تھا کہ ہم ڈر رہے تھے کہ کہیں آپ منبر سے گر نہ پڑیں۔

ربّ

لغوی تحقیق | اس لفظ کا مادہ ر ب ب ہے جس کا ابتدائی و اساسی مفہوم پرورش ہے۔ پھر اسی سے تصرف، خبرگیری، اصلاح حال اور اتمام و تکمیل کا مفہوم پیدا ہوا۔ پھر اسی بنیاد پر فوقیت، سیادت مالکیت اور آقائی کے مفہومات اس میں پیدا ہو گئے۔ لغت میں اسکے استعمالات کی چند مثالیں یہ ہیں۔

(۱) پرورش کرنا، نشوونما دینا، بڑھانا۔ مثلاً ربیب اور ربیبہ پروردہ لڑکے اور لڑکی کو کہتے ہیں، نیز اس بچے کو جو سوتیلے باپ کے گھر پرورش پائے۔ پالنے والی دائی کو بھی ربیبہ کہتے ہیں۔ رابّہ سوتیلی ماں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ماں تو نہیں ہوتی مگر بچے کو پرورش کرتی ہے اسی مناسبت سے رابّ سوتیلے باپ کو کہتے ہیں۔ مُرَبَّبْ یا مُرَبّیٰ اس دوا کو کہتے ہیں جو محفوظ کر رکھی جائے۔ رَبَّ یَرُبُّ رَبًّا کے معنی اضافہ کرنے، بڑھانے اور تکمیل کو پہنچانے کے ہیں، جیسے رَبَّ النعمة، یعنی احسان میں اضافہ کیا یا احسان کی حد کر دی۔

(۲) سمیٹنا، جمع کرنا، فراہم کرنا۔ مثلاً کہیں گے فلان یرب الناس، یعنی فلاں شخص لوگوں کو جمع کرتا ہے۔ یا سب لوگ اس شخص پر مجتمع ہوتے ہیں۔ جمع ہونے کی جگہ کو مَرَبّ کہینگے۔ سمٹنے اور فراہم ہو جانے کو تربّب کہیں گے۔

(۳) خبرگیری کرنا، اصلاح حال کرنا، دیکھ بھال اور کفالت کرنا۔ مثلاً ربّ ضیعته کے معنی ہوں گے فلاں شخص نے اپنی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کی۔ ابوسفیان نے صفوان سے کہا تھا۔ لان یربّنی رجل من قریش احب الی من ان یربّنی رجل من هوازن یعنی قریش میں سے کوئی شخص مجھے اپنی ربوبیت میں لے لے یہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہوازن کا کوئی

آدمی ایسا کرے۔ علقمہ بن عبید کا شعر ہے:

فکنت امرأ افضت الیک ربابتی   وقبلک ربتنی فضعت ربوب

یعنی تجھ سے پہلے جو رئیس میرے مربی تھے انہوں نے میری خبرگیری واصلاح نہ کی، آخرکار اب میری کفالت وربابت تیرے ہاتھ آئی ہے۔ فرزوق کہتا ہے۔

کانوا کسالئة حمقاء اذحقنت   سلاءها فی ادیم غیر مربوب

اس شعر میں ادیم غیر مربوب سے مراد وہ چمڑا ہے جو کمایا نہ گیا ہو جیسے دباغت دیکر درست نہ کیا گیا ہو۔ فلان یرب صنعتہ کے، فلان کے معنی ہونگے فلاں شخص فلاں کے پاس اپنے پیشہ کا کام کرتا ہے۔ یا اس سے کاریگری کی تربیت حاصل کرتا ہے۔

(۴) فوقیت، بالادستی، سرداری، حکم چلانا، تصرف کرنا مثلاً قد ربّ فلان قومہ یعنی فلاں شخص نے اپنی قوم کو اپنا تابع کرلیا۔ ربَبتُ القوم یعنی میں نے قوم پر حکم چلایا اور بالادست ہوگیا۔ لبید بن ربیعہ کہتا ہے:

واهلکن یوماً رب کندة وابنه   ورب معد بین خبت وعرعر

یہاں رب کندہ سے مراد کندہ کا سردار ہے جس کا حکم اس قبیلہ میں چلتا تھا۔ اس معنی میں نابغہ ذبیانی کا شعر ہے۔

تخب الی النعمان حتی تنا لہ   فدی لک من رب تلیدی وطاری

(۵) مالک ہونا۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ارب غنم ام رب ابل؟ تو بکریوں کا مالک ہے یا اونٹوں کا؟ اس معنی میں گھر کے مالک کو رب الدار، اونٹنی کے مالک کو رب الناقہ، جائداد کے مالک کو رب الضیعہ کہتے ہیں۔ آقا کے معنی میں بھی رب کا لفظ آتا ہے۔ اور عبد یعنی غلام کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔

غلطی سے رب کے لفظ کو محض پروردگار کے مفہوم تک محدود کر کے رکھ دیا گیا ہے اور ربوبیت کی تعریف میں یہ فقرہ چل پڑا ہے کہ ھو انشاء الشئ حالاً فحالاً الی حد التمام (یعنی ایک چیز کو درجہ بدرجہ ترقی دیکر پایۂ کمال کو پہنچانا) حالانکہ یہ اس لفظ کے وسیع معانی میں سے صرف ایک معنی ہے اسکی پوری وسعتوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ حسب ذیل مفہومات پر حاوی ہے۔

۱۔ پرورش کرنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا، تربیت اور نشو و نما دینے والا۔

۲۔ کفیل، خبرگیراں، دیکھ بھال اور اصلاح حال کا ذمہ دار۔

۳۔ وہ جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو، جس پر متفرق اشخاص مجتمع ہوتے ہیں۔

۴۔ سید مطاع، سردار ذی اقتدار جس کا حکم چلے جس کی فوقیت و بالادستی تسلیم کیجائے جس کو تصرف کے اختیارات ہوں۔

۵۔ مالک و آقا۔

قرآن میں لفظ رب کے استعمالات | قرآن مجید میں یہ لفظ ان سب معانی میں آیا ہے کہیں ان میں سے کوئی ایک یا دو معنی مراد ہیں کہیں اس سے زائد، اور کہیں پانچوں معنی اسکے اندر جمع ہو گئے ہیں۔ اس بات کو ہم آیاتِ قرآنی سے مختلف مثالیں دے کر واضح کریں گے۔

پہلے معنی میں؛

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ (یوسف۔ ۳) اس نے کہا کہ پناہ بخدا، وہ تو میرا رب ہے جس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔

دوسرے معنی میں جس کے ساتھ پہلے معنی کا تصور بھی کم و بیش شامل ہے؛

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ الَّذِیْ تمہارے یہ معبود تو میرے دشمن ہیں، بجز رب کائنات کے جس نے

---

[1] کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ حضرت یوسف عزیز مصر کو اپنا رب فرما رہے ہیں، جیسا کہ بعض مفسرین کو شبہ ہوا ہے۔ بلکہ دراصل "وہ" اشارہ خدا کی طرف ہے جس کی پناہ انہوں نے مانگی ہے مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْ جب مشارٌ الیہ قریب ہی میں مذکور ہے تو کوئی غیر مذکور مشارٌ الیہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت۔

خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ (الشعراء)

مجھے پیدا کیا ہے، جو میری رہنمائی کرتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔

وَمَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْئَرُوْنَ ثُمَّ اِذَا کَشَفَ الضُّرَّ عَنْکُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْکُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِکُوْنَ (النحل-۷)

تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی سے حاصل ہوئی ہے پھر جب تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اسی کی طرف تم گھبرا کر رجوع کرتے ہو، مگر جب وہ تم پر سے مصیبت ٹال دیتا ہے تو کچھ لوگ تم میں ایسے ہیں جو اپنے رب کے ساتھ (اس نعمت کی بخشش اور اس مشکل کشائی میں) دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتے ہیں

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ (انعام-۲۰)

کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ ہر چیز کا رب وہی ہے؟

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَکِیْلًا (المزمل-۱)

وہ مغرب و مشرق کا رب ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے لہٰذا تو اسی کو اپنا وکیل (اپنے سارے معاملات کا کفیل و ذمہ دار) بنالے

تیسرے معنی میں :-

هُوَ رَبُّکُمْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (ہود-۳)

وہ تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم پلٹا کر لیجائے جاؤ گے

ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ مَّرْجِعُکُمْ (الزمر-۱)

پھر تمہارے رب کی طرف تمہاری واپسی ہے۔

قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا (سبا-۳)

کہو کہ ہم دونوں فریقوں کو ہمارا رب جمع کرے گا۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ (انعام-۴)

زمین میں چلنے والا کوئی جاندار اور ہوا میں اڑنے والا کوئی پرند ایسا نہیں ہے جو تمہاری ہی طرح کی ایک امت نہ ہو اور ہم نے اپنے نوشتہ میں کسی کے اندراج سے کوتاہی نہیں کی ہے پھر وہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جائینگے

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ (یٰس-۴)

اور جونہی کہ صور پھونکا گیا وہ سب اپنے ٹھکانوں سے اپنے رب کی طرف نکل پڑینگے۔

چوتھے معنی میں جس کے ساتھ کم و بیش تیسرے معنی کا تصور بھی موجود ہے:۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ-۵)
انہوں نے اللہ کے بجائے اپنے علماء اور درویشوں کو اپنا رب بنالیا۔

وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران-۷)
اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔

دونوں آیتوں میں ارباب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو قوموں اور گروہوں نے مطلقاً اپنا رہنما و پیشوا مان لیا ہو جن کے امر و نہی، ضابطہ و قانون، اور تحلیل و تحریم کو بلا کسی بالاتر سند کے تسلیم کیا جاتا ہو جنھیں بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا حقدار سمجھا جاتا ہو۔

اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا... وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (یوسف-۵)
یوسف نے کہا کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب کو شراب پلائے گا .... اور ان دونوں میں سے جس کے متعلق یوسف کا خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائیگا اس سے یوسف نے کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کرنا مگر شیطان نے اسے بھلاوے میں ڈال دیا اور اس کو اپنے رب سے یوسف کا ذکر کرنے کا خیال نہ رہا۔

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَاسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ (یوسف-۷)
جب پیغام لانے والا یوسف کے پاس آیا تو یوسف نے اس سے کہا کہ اپنے رب کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے میرا رب تو ان کی چال سے باخبر ہے ہی۔

ان آیات میں حضرت یوسف نے مصریوں سے خطاب کرتے ہوئے بار بار فرعون مصر کو ان کا رب قرار دیا ہے، اسلئے کہ جب وہ اس کی مرکزیت اور اسکا اقتدار اعلیٰ اور اس کو امر و نہی کا مالک تسلیم کرتے تھے تو

وہی ان کا رب تھا۔ برعکس اس کے خود حضرت یوسف اپنا رب اللہ کو قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ فرعون کو نہیں، صرف اللہ کو مقتدر اعلےٰ اور صاحب امر ونہی مانتے تھے۔

پانچویں معنی ہیں۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِیْ أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوْعٍ وَّآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ۔ (قریش)	لہذا انہیں اس گھر کے مالک کی عبادت کرنی چاہیے جس نے ان کی رزق رسانی کا انتظام کیا ہے اور انہیں بد امنی سے محفوظ رکھا ہے
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (الصفت - ۵)	تیرا رب جو عزت واقتدار کا مالک ہے ان تمام صفات عیب سے پاک ہے جو یہ لوگ اسکی طرف منسوب کرتے ہیں۔
فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (انبیاء - ۲)	اللہ جو عرش کا مالک ہے ان تمام صفات عیب سے پاک ہے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔
قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (المومنون - ۵)	پوچھو کہ ساتوں آسمانوں کا اور عرش بزرگ کا مالک کون ہے؟
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (الصفت - ۱)	وہ جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو آسمان وزمین کے درمیان ہیں اور ان سب چیزوں کا جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔
وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی (النجم - ۳)	اور یہ کہ شعریٰ کا مالک بھی وہی ہے۔

ربوبیت کے باب میں گمراہ قوموں کے تخیلات

ان شواہد سے لفظ رب کے معانی بالکل غیر مشتبہ طور پر معین ہو جاتے ہیں اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ربوبیت کے متعلق گمراہ قوموں کے وہ کیا تخیلات تھے۔ جن کی تردید کرنے کیلئے قرآن آیا اور وہ کیا چیز ہے جسکی طرف قرآن بلاتا ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن گمراہ قوموں کا ذکر قرآن نے کیا ہے ان کو الگ الگ لیکر ان کے خیالات سے بحث کی جائے تا کہ بات بالکل منقح ہو جائے۔

قوم نوحؑ سب سے پہلی قوم جس کا ذکر قرآن کرتا ہے، حضرت نوحؑ کی قوم ہے۔ قرآن کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ حضرت نوحؑ کی دعوت کے جواب میں انکا یہ قول خود قرآن نے نقل کیا ہے۔

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (المومنون - ۲)

یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر تم جیسا ایک انسان۔ یہ اصل تم پر اپنی فضیلت جمانا چاہتا ہے، ورنہ اگر اللہ کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔

انہیں اللہ کے خالق ہونے اور پہلے اور دوسرے معنی میں انکے رب ہونے سے بھی انکار نہ تھا۔ چنانچہ حضرت نوحؑ جب ان سے کہتے ہیں کہ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ[1] (ہود - ۳) اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا[2] (نوح - ۱) اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا[3] (نوح - ۱) تو ان میں سے کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ اللہ ہمارا رب نہیں ہے، یا زمین و آسمان کو اور ہم کو اس نے پیدا نہیں کیا ہے، یا زمین و آسمان کا یہ سارا انتظام وہ نہیں کر رہا ہے۔

پھر ان کو اس بات سے بھی انکار نہ تھا کہ اللہ ان کا الٰہ ہے، اسی لئے تو حضرت نوحؑ نے انکے سامنے اپنی دعوت ان الفاظ میں پیش کی کہ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (اسکے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے) ورنہ اگر وہ اللہ کے الٰہ ہونے سے منکر ہوتے تو دعوت کے الفاظ یہ ہوتے کہ اِتَّخِذُوا اللّٰهَ اِلٰهًا (اللہ کو اپنا الٰہ بناؤ)

اب سوال یہ ہے کہ ان کے اور حضرت نوحؑ کے درمیان نزاع کس بات پر تھی؟ آیات قرآنی کے تتبع

---

[1] وہ تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔

[2] اپنے رب سے معافی چاہو کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔

[3] دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کیسے ہفت آسمان تہ بر تہ بنائے اور چاند کو ان کے درمیان نور اور سورج کو چراغ بنایا اور تم کو زمین سے پیدا کیا۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ بنائے نزاع دو باتیں تھیں۔

ایک یہ کہ حضرت نوح کی تعلیم یہ تھی کہ جو رب العالمین ہے، جسے تم بھی مانتے ہو کہ تمہیں اور تمام کائنات کو اسی نے وجود بخشا ہے اور وہی تمہاری ضروریات کا کفیل ہے دراصل وہی اکیلا تمہارا الٰہ ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ کوئی اور ایسی ہستی نہیں ہے جو تمہاری حاجتیں پوری کرنے والی، مشکلیں آسان کرنے والی، دعائیں سننے اور مدد کو پہنچنے والی ہو، لہٰذا تم اسی کے آگے سرِ نیاز جھکاؤ۔

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ...... وَلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ (اعراف-۸)	اے برادرانِ قوم! اللہ کی عبادت کرو، اسکے سوا کوئی تمہارا الٰہ نہیں ہے..... مگر میں رب العالمین کی طرف سے پیغامبر ہوں، تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں۔

برعکس اس کے وہ لوگ اس بات پر مُصر تھے کہ رب العالمین تو اللہ ضرور ہے مگر دوسرے بھی خدائی کے انتظام میں تھوڑا یا بہت دخل رکھتے ہیں۔ اور ان سے بھی ہماری حاجتیں وابستہ ہیں۔ لہٰذا اللہ کے ساتھ ہم دوسروں کو بھی الٰہ مانیں گے۔

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا (نوح-۲)	ان کے سرداروں اور پیشواؤں نے کہا کہ لوگو اپنے الٰہوں کو نہ چھوڑو، وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگ صرف اس معنی میں اللہ کو رب مانتے تھے کہ وہ ان کا خالق، زمین آسمان کا مالک، اور کائنات کا مدبرِ اعلٰے ہے لیکن اس بات کے قائل نہ تھے کہ اخلاق، معاشرت، تمدن، سیاست اور تمام معاملاتِ زندگی میں بھی حاکمیت و اقتدارِ اعلٰے اسی کا حق ہے، وہی رہنما، وہی قانون ساز، وہی صاحبِ امر و نہی بھی ہے اور اسی کی اطاعت بھی ہونی چاہیئے۔ ان سب معاملات میں انہوں نے اپنے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں کو رب بنا رکھا تھا۔ برعکس اسکے حضرت نوح کا مطالبہ یہ تھا کہ ربوبیت کے

ٹکڑے نہ کرو، تمام مفہومات کے اعتبار سے صرف اللہ ہی کو رب تسلیم کرو، اور اس کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے جو قوانین اور جو احکام میں تمہیں پہنچاتا ہوں ان کی پیروی کرو۔

اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْنِ (الشعراء - ۶) — میں تمہارے لئے خدا کا معتبر رسول ہوں لہذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

قوم عاد قوم نوح کے بعد قرآن عاد کا ذکر کرتا ہے۔ یہ قوم بھی اللہ کی ہستی سے منکر نہ تھی۔ اس کے الٰہ ہونے سے بھی اس کو انکار نہ تھا، اور جس معنی میں حضرت نوح کی قوم اللہ کو رب تسلیم کرتی تھی اسی معنی میں وہ بھی اللہ کو رب مان رہی تھی۔ البتہ بنائے نزاع وہی دو امور تھے جو اوپر قوم نوح کے سلسلے میں بیان ہو چکے ہیں۔ چنانچہ قرآن کی حسب ذیل تصریحات اس پر صاف دلالت کرتی ہیں:۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ۭ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ..... — عاد کی طرف ہم نے انکے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا اے برادران قوم! اللہ کی عبادت کرو، اسکے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰہَ وَحْدَہٗ وَنَذَرَ مَا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا (اعراف - ۹) — انہوں نے جواب دیا کیا تو اسلئے آیا ہے کہ ہم بس اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنکی عبادت باپ دادا کے وقتوں سے ہوتی آرہی ہے

قَالُوْا لَوْ شَاۗءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕکَۃً (السجدہ) — انہوں نے کہا اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیج سکتا تھا

وَتِلْکَ عَادٌ ڀ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمْ وَعَصَوْا رُسُلَہٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ (ہود - ۵) — اور یہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اسکے رسولوں کی اطاعت قبول نہ کی، اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی اختیار کر لی۔

ثمود اب ثمود کو لیجئے جو عاد کے بعد سب سے بڑی سرکش قوم تھی۔ اصولاً اس کی گمراہی بھی اسی قسم کی تھی جو قوم نوح اور قوم عاد کی بیان ہوئی ہے۔ ان لوگوں کو اللہ کے وجود اور اسکے الٰہ اور رب ہونے سے انکار نہ تھا۔ اسکی عبادت سے بھی انکار نہ تھا۔ بلکہ انکار اس بات سے تھا کہ اللہ ہی الٰہ واحد ہے۔ صرف وہی عبادت کا مستحق ہے

اور ربوبیت اپنے تمام معانی کے ساتھ اکیلے اللہ ہی کے لئے خاص ہے وہ اللہ کے سوا دوسروں کو بھی فریاد رس، مشکل کشا اور حاجت روا ماننے پر اصرار کرتے تھے، اور اپنی اخلاقی و تمدنی زندگی میں اللہ کے بجائے اپنے سرداروں اور پیشواؤں کی اطاعت کرنے اور ان سے اپنی زندگی کا قانون لینے پر مُصر تھے۔ یہی چیز بالآخر ان کے ایک فسادی قوم بن جانے اور مبتلائے عذاب ہونے کی موجب ہوئی، جس کی توضیح حسب ذیل آیات سے ہوتی ہے

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (السجدہ-۲)

اے محمد! اگر یہ لوگ تمہاری پیروی سے منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ عاد اور ثمود کو جو سزا ملی تھی ویسی ہی ایک ہولناک سزا سے میں تم کو ڈراتا ہوں۔ جب ان قوموں کے پاس ان کے پیغمبر آگے پیچھے سے آئے اور کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انہوں نے کہا کہ اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا۔ لہٰذا تم جو کچھ لے کر آئے ہو اسے ہم نہیں مانتے۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ..... قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (ہود-۶)

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا اے برادرانِ قوم! اللہ کی پرستش و بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے..... انہوں نے کہا صالح! اس سے پہلے تو ہماری بڑی امیدیں تم سے وابستہ تھیں، کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے؟

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ..... وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ

جب ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا کیا تمہیں اپنے بچاؤ کی کوئی فکر نہیں ہے؟ دیکھو میں تمہارے لئے اللہ کا معتبر رسول ہوں، لہٰذا اللہ کی ناراضی سے بچو اور میری اطاعت قبول کرو..... اور ان حد سے گزرنے والوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد

وَلَا يُصْلِحُوْنَ (الشعراء - ۸) برپا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

قوم ابراہیم اور نمرود اسکے بعد حضرت ابراہیم کی قوم کا نمبر آتا ہے۔ اس قوم کا معاملہ خاص طور پر اسلئے اہم ہے کہ اس کے بادشاہ نمرود کے متعلق یہ عام غلط فہمی ہے کہ وہ اللہ کا منکر اور خود خدا ہونے کا مدعی تھا، حالانکہ وہ اللہ کی ہستی کا قائل تھا اس کے خالق و مدبر کائنات ہونے کا معتقد تھا۔ اور صرف تیسرے چوتھے اور پانچویں معنی کے اعتبار سے اپنی ربوبیت کا دعویٰ کرتا تھا نیز یہ بھی عام غلط فہمی ہے کہ یہ قوم اللہ سے بالکل ناواقف تھی اور اسکے الٰہ اور رب ہونے کی سرے سے قائل ہی نہ تھی۔ حالانکہ فی الواقع اس قوم کا معاملہ قوم نوح اور عاد اور ثمود سے قطعاً کچھ بھی مختلف نہ تھا۔ وہ اللہ کے وجود کو بھی مانتی تھی، اسکا رب ہونا اور خالق ارض و سما اور مدبر کائنات ہونا بھی اسے معلوم تھا، اسکی عبادت سے بھی وہ منکر نہ تھی، البتہ اسکی گمراہی یہ تھی کہ وہ ربوبیت بمعنی اول و دوم میں اجرام فلکی کو حصہ دار سمجھتی تھی اور اس بنا پر اللہ کے ساتھ انکو بھی معبود قرار دیتی تھی، اور ربوبیت بمعنی سوم و چہارم و پنجم کے اعتبار سے اس نے اپنے بادشاہوں کو رب بنا رکھا تھا قرآن کی تصریحات اس بارے میں اتنی واضح ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کس طرح لوگ اصل معاملہ کو سمجھنے سے قاصر رہ گئے سب سے پہلے حضرت ابراہیم کے آغاز ہوش کا واقعہ لیجیے جس میں انکی تلاش حق کا نقشہ کھینچا گیا ہے :-

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ	جب اس پر رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا، کہنے لگا
هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ	یہ میرا رب ہے مگر جب وہ تارا ڈوب گیا تو اس نے کہا ڈوبنے والوں کو تو
فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ	میں پسند نہیں کرتا۔ پھر جب چاند چمکتا ہوا دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے
اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ	مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی
مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ	تو خطرہ ہے کہ کہیں میں بھی ان گمراہ لوگوں میں شامل نہ ہو جاؤں
بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ	پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے کیونکہ یہ تو سب سے بڑا ہے
فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا	مگر جب وہ بھی چھپ گیا تو وہ پکار اٹھا کہ اے برادران قوم جو شرک

تُشْرِکُوْنَ ۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (انعام-۹)

کرتے ہو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے میں نے تو سب طرف سے منہ موڑ کر اپنا رخ اس کی طرف پھیر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

خط کشیدہ فقروں پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس سوسائٹی میں حضرت ابراہیم نے آنکھ کھولی تھی اس میں آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے کا تصور اور اس ذات کے رب ہونے کا تصور ان سیاروں کی ربوبیت کے تصور سے الگ موجود تھا، اور آخر کیوں نہ موجود ہوتا جبکہ لوگ ان مسلمانوں کی نسل سے تھے جو حضرت نوح پر ایمان لائے تھے اور ان کی قریبی رشتہ دار ہمسایہ اقوام (عاد و ثمود) میں پے در پے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے دین اسلام کی تجدید بھی ہوتی رہی تھی وَجَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ۔ پس حضرت ابراہیم کو اللہ کے فاطر السموات والارض اور رب ہونے کا تصور تو اپنے ماحول سے مل چکا تھا، البتہ جو سوالات ان کے دل میں کھٹکتے تھے وہ یہ تھے کہ نظام ربوبیت میں اللہ کیساتھ چاند، سورج اور سیاروں کے شریک ہونے کا جو تخیل ان کی قوم میں پایا جاتا ہے اور جس کی بنا پر یہ عبادت میں بھی اللہ کے ساتھ ان کو شریک ٹھیرا رہے ہیں، یہ کہاں تک مبنی بر حقیقت ہے۔ چنانچہ نبوت سے پہلے اسی کی جستجو انہوں نے کی اور طلوع و غروب کا انتظام ان کے لئے اس امر واقعی تک پہنچنے میں دلیل راہ بن گیا کہ فاطر السموات والارض کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ اسی بنا پر چاند کو غروب ہوتے دیکھ کر وہ فرماتے ہیں کہ "اگر میرے رب (یعنی اللہ) نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو خوف ہے کہ کہیں میں بھی حقیقت تک رسائی پانے سے رہ جاؤں اور ان مظاہر

ـــــــــــ

۱؎ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت ابراہیم کے وطن ار کے متعلق آثار قدیمہ کی کھدائیوں میں جو انکشافات ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں چندر دیوتا کی پرستش ہوتی تھی جسے ان کی زبان میں "ننار" کہا جاتا تھا، اور اس کے ہمسایہ علاقہ میں جس کا مرکز لرسہ تھا، سورج دیوتا کی عبادت ہوتی تھی جس کا نام ان کی زبان میں شماش تھا۔ اس ملک کے فرماں روا خاندان کا بانی ارمّو تھا جو عرب میں جا کر نمرود ہو گیا، اور اسی کے نام پر وہاں کے فرمانرواؤں کا لقب ہی نمرود قرار پا گیا جیسے نظام الملک کے جانشین نظام کہلاتے ہیں۔

سے دھوکا نہ کھا جاؤں جس سے میرے گردوپیش لاکھوں انسان دھوکا کھا رہے ہیں۔

پھر جب حضرت ابراہیم نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے اور انہوں نے دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا تو جن الفاظ میں وہ اپنی دعوت پیش فرماتے تھے ان پر غور کرنے سے وہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا۔ (انعام۔۹۰)

اور آخر میں ان کو کس طرح ڈر سکتا ہوں جنھیں تم اللہ کا شریک ٹھیراتے ہو، جبکہ تم اللہ کے ساتھ ان کو شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے الٰہیت و ربوبیت میں شریک ہونے پر اللہ نے تمہارے پاس کوئی سند نہیں بھیجی۔

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ (مریم۔۳۰)

تم اللہ کے سوا اور جن جن سے دعائیں مانگتے ہو ان سے میں دست کش ہوتا ہوں۔

قَالَ بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ ... قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ (انبیاء۔۵)

کہا تمہارا رب تو صرف آسمانوں اور زمین کا رب ہی ہے جس نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہے۔۔۔ کہا پھر کیا تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نفع و نقصان پہنچانے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے؟

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ أَئِفْكًا آلِهَةً دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ، فَمَا ظَنُّكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ (صفّٰت۔۳۰)

جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ تم کن کی عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کے سوا اپنے خود ساختہ الٰہوں کی بندگی کا ارادہ ہے؟ پھر رب العالمین کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا

ابراہیم اور اسکے ساتھی مسلمانوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے صاف کہہ دیا کہ ہمارا تم سے اور اللہ کے سوا جن جن کی تم عبادت کرتے ہو ان سب سے

بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (الممتحنہ - ۱)

کوئی تعلق نہیں، ہم تمہارے طریقے کو ماننے سے انکار کر چکے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کیلئے بغض و عداوت کی بنا پڑ گئی ہے جب تک کہ تم اکیلے اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔

حضرت ابراہیم کے ان تمام ارشادات کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انکے مخاطب وہ لوگ نہ تھے جو اللہ سے بالکل ناواقف اور اسکے رب العالمین اور معبود ہونے سے منکر یا خالی الذہن ہوتے، بلکہ وہ لوگ تھے جو اللہ کے ساتھ ربوبیت (بمعنی اول ودوم) اور الٰہیت میں دوسروں کو شریک قرار دیتے تھے۔ اسی لئے تمام قرآن میں کسی ایک جگہ بھی حضرت ابراہیم کا کوئی ایسا قول موجود نہیں ہے جس میں انہوں نے اپنی قوم کو اللہ کی ہستی اور اس کے الٰہ اور رب ہونے کا قائل کرنے کی کوشش کی ہو، بلکہ ہر جگہ وہ دعوت اس چیز کی دیتے ہیں کہ اللہ ہی رب اور الٰہ ہے۔

اب نمرود کے معاملہ کو لیجیے۔ اس سے حضرت ابراہیم کی جو گفتگو ہوئی اسے قرآن اس طرح نقل کرتا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ۔ (بقرہ - ۳۵)

تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے ابراہیم سے اسکے رب کے بارے میں بحث کی، اس بنا پر کہ اللہ نے اسے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی و موت ہے تو اس نے کہا زندگی و موت تو میرے اختیار میں ہے، ابراہیم نے کہا، اچھا تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اب تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ کافر مبہوت ہو گیا۔

اس گفتگو سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ جھگڑا اللہ کے ہونے یا نہ ہونے پر نہ تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ ابراہیم علیہ السلام رب کسے تسلیم کرتے ہیں۔ نمرود اوّل تو اس قوم سے تعلق رکھتا تھا جو اللہ کی ہستی کو مانتی تھی۔ دوسرے جب تک کہ وہ بالکل ہی پاگل نہ ہو جاتا وہ ایسی صریح احمقانہ بات کبھی نہ کہہ سکتا تھا

کہ زمین و آسمان کا خالق اور سورج اور چاند کو گردش دینے والا وہ خود ہے پس در اصل اسکا دعویٰ یہ نہ تھا کہ میں اللہ ہوں یا میں رب السموات والارض ہوں، بلکہ اسکا دعویٰ صرف یہ تھا کہ میں اس مملکت کا رب ہوں جس کی رعیت کا ایک فرد ابراہیم ہے اور یہ رب ہونے کا دعویٰ بھی اسے ربوبیت کے پہلے اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے نہ تھا، کیونکہ اس اعتبار سے تو وہ خود چاند اور سورج اور سیاروں کی ربوبیت کا قائل تھا، البتہ وہ تیسرے، چوتھے اور پانچویں مفہوم کے اعتبار سے اپنی مملکت کا رب بنتا تھا، یعنی اس کا دعویٰ یہ تھا کہ میں اس ملک کا مالک ہوں۔ اس کے سارے باشندے میرے بندے ہیں، میرا مرکزی اقتدار ان کے اجتماع کی بنیاد ہے اور میرا فرمان اس کیلئے قانون ہے (آنْ اٰتٰـهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ کے الفاظ صریحاً اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس کے دعوائے ربوبیت کی بنیاد بادشاہی کے زعم پر تھی)۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ اس کی رعیت میں سے ابراہیم نامی ایک شخص اٹھا ہے جو نہ چاند اور سورج اور سیاروں کی فوق الفطری ربوبیت کا قائل ہے اور نہ پادشاہِ وقت کی سیاسی و تمدنی ربوبیت تسلیم کرتا ہے تو اس کو تعجب ہوا اور حضرت ابراہیم کو بلا کر اس نے دریافت کیا کہ آخر تم کسے رب مانتے ہو؟ حضرت ابراہیم نے پہلے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی و موت کے اختیارات ہیں مگر اس جواب سے وہ بات کی تہ کو نہ پہنچ سکا اور یہ کہہ کر اس نے اپنی ربوبیت ثابت کرنی چاہی کہ زندگی اور موت کے اختیارات تو مجھے حاصل ہیں، جسے چاہوں قتل کرا دوں اور جس کی چاہوں جان بخشی کر دوں۔ تب حضرت ابراہیم نے اس کو بتایا کہ میں صرف اللہ کو رب مانتا ہوں، ربوبیت کے جملہ مفہومات کے اعتبار سے میرے نزدیک تنہا اللہ ہی رب ہے، اس نظامِ کائنات میں کسی دوسرے کی ربوبیت کیلئے گنجائش ہی کہاں ہو سکتی ہے جبکہ سورج کے طلوع و غروب پر وہ ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ نمرود آدمی ذی ہوش تھا اس دلیل کو سن کر اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ فی الواقع اللہ کی اس سلطنت میں اسکا دعوائے ربوبیت بجز ایک زعمِ باطل کے اور کچھ نہیں ہے، اسی لئے وہ دم بخود ہو کر رہ گیا، مگر نفس پرستی اور شخصی و خاندانی اغراض کی بندگی ایسی ہمہ گیر

ہوئی کہ ظہورِ حق کے باوجود وہ خود مختارانہ حکمرانی کے منصب سے اتر کر اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت پر آمادہ نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (مگر اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا) یعنی اس ظہورِ حق کے بعد جو رویہ اسے اختیار کرنا چاہیئے تھا اسے اختیار کرنے کیلئے جب وہ تیار نہ ہوا اور اس نے غاصبانہ فرمانروائی کرتے رہنا پر اور خود اپنے نفس پر ظلم کرنا ہی پسند کیا تو اللہ نے بھی اسے ہدایت کی روشنی عطا نہ کی کیونکہ اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جو خود ہدایت کا طالب نہ ہو اس پر زبردستی اپنی ہدایت مسلط کر دے۔

قوم لوط قوم ابراہیم کے بعد ہمارے سامنے وہ قوم آتی ہے جسکی اصلاح پر حضرت ابراہیم کے بھتیجے حضرت لوط مامور کیئے گئے تھے۔ اس قوم کے متعلق بھی قرآن سے ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کی منکر تھی، نہ اس بات کی منکر تھی کہ اللہ خالق اور رب بمعنی اول و دوم ہے، البتہ اسے انکار اس سے تھا کہ اللہ ہی کو تیسرے چوتھے اور پانچویں معنی میں بھی رب مانے اور اسکے معتمد علیہ نمائندے کی حیثیت سے رسول کی اقتدا کو تسلیم کرے۔ وہ مخلوق و مربوب ہونے کے باوجود اپنے لیئے یہ آزادی باقی رکھنا چاہتی تھی کہ اپنی خواہش کے مطابق خود جسطرح چاہے کام کرے۔ یہی اس کا اصلی جرم تھا اور اسی بنا پر وہ عذاب میں مبتلا ہوئی قرآن کی حسب ذیل تصریحات اس پر شاہد ہیں۔

اِذْ قَالَ لَھُمْ اَخُوْھُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۔ وَمَآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اَتَاْتُوْنَ الذُّکْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَکُمْ رَبُّکُمْ مِّنْ	جب ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا کیا تم ڈرتے نہ کرو گے؟ دیکھو میں تمہارے لیے امانتدار رسول ہوں لہذا اللہ کے غضب سے بچو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو صرف رب العالمین کے ذمہ ہے کیا دنیا کے لوگوں میں سے تم لڑکوں کی طرف جاتے ہو اور تمہارے رب نے تمہارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں

اَزْوَاجِکُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ (الشعراء ۹) چھوڑ دیتے ہو؟ تم بڑے ہی حد سے گذر نے والے لوگ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ خطاب ایسے ہی لوگوں سے ہو سکتا تھا جو اللہ کے وجود اور اسکے خالق اور پروردگار ہونے کے منکر نہ ہوں۔ چنانچہ جواب میں وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اللہ کیا چیز ہے۔ یا وہ پیدا کرنے والا کون ہوتا ہے، یا وہ کہاں سے ہمارا رب ہو گیا، بلکہ کہتے یہ ہیں کہ

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰلُوْطُ لَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِیْنَ (الشعراء - ۹) اے لوط! اگر تم اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو ملک سے نکال باہر کئے جاؤ گے۔

دوسری جگہ اس واقعہ کو یوں بیان فرمایا گیا ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَکُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۔ اَئِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ (عنکبوت ۳۰)

اور ہم نے لوط کو بھیجا جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم وہ فعل شنیع کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہ کیا تھا، کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو، راستوں پر ڈاکے مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں علانیا ایک دوسرے کے سامنے بدکاریاں کرتے ہو؟ تو اس کی قوم کا جواب اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو۔

کیا یہ جواب کسی منکر خدا قوم کا ہو سکتا تھا پس معلوم ہوا کہ ان کا اصلی جرم انکار الوہیت و ربوبیت نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ اگرچہ وہ فوق الفطری معنی میں اللہ کو الٰہ اور رب مانتے تھے لیکن اپنے اخلاق، تمدن اور معاشرت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرنے سے انکار کرتے تھے اور اسکے رسول کی ہدایت پر چلنے کے لئے تیار نہ تھے۔

قوم شعیب اس کے بعد اہل مدین اور اصحاب الایکہ کو لیجئے جن میں حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ یہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے تھے اسلئے یہ سوال ہی پیدا نہیں

ہ وہ اللہ کے وجود اور اس کے الٰہ اور رب ہونے کے قائل تھے یا نہ تھے انکی حیثیت دراصل ایک
قوم کی تھی جس کی ابتدا اسلام سے ہوئی اور بعد میں وہ عقائد و اعمال کی خرابیوں میں مبتلا ہو کر بگڑ تی
ی بلکہ قرآن سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ مومن ہونے کے مدعی تھے۔ چنانچہ بار بار حضرت شعیب
سے فرماتے ہیں کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں یہ کرنا چاہیئے۔ حضرت شعیب کی ساری تقریروں اور ان کے جوابات
یکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم تھی جو اللہ کو مانتی تھی۔ اُسے معبود اور پروردگار بھی
یم کرتی تھی مگر دو طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ایک یہ کہ وہ فوق الفطری معنی میں اللہ کے سوا
سروں کو بھی الٰہ اور رب سمجھنے لگی تھی اس لئے اس کی عبادت صرف اللہ کے لئے مختص نہ رہی تھی۔
سرے یہ کہ اس کے نزدیک اللہ کی ربوبیت کو انسان کے اخلاق، معاشرت، معیشت اور تمدن و سیا
ے کوئی سروکار نہ تھا، اسی بنا پر وہ کہتی تھی کہ اپنی تمدنی زندگی میں ہم مختار ہیں اپنے معاملات کو جس طرح
ہیں چلائیں۔

قرآن کی حسب ذیل آیات ہمارے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں۔

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا، قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ، قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا، ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ..... وَاِنْ کَانَ طَآئِفَۃٌ مِّنْکُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْٓ اُرْسِلْتُ بِہٖ وَطَآئِفَۃٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰی یَحْکُمَ اللّٰہُ بَیْنَنَا وَھُوَ

اور مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس روشن ہدایت آچکی ہے پھر تم ناپ تول ٹھیک کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح کی جاچکی تھی، اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم مومن ہو..... اور اگر تم میں سے ایک گروہ اس ہدایت پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں ایمان لاتا ہے اور دوسرا

خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۔

(اعراف - ۱۱)

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ، بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ، وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ، قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ، اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۔

ایمان نہیں لاتا تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے، وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور اے برادران قوم! پیمانے اور ترازو انصاف کے ساتھ پورے پورے ناپا اور تولو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو، اور زمین میں فساد نہ برپا کرتے پھرو۔ اللہ کی عنایت سے کاروبار میں جو بچت ہو وہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم مومن ہو، اور میں تمہارے اوپر کوئی نگہبان نہیں ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں؟ بس تم ہی تو ایک بردبار اور راستباز رہ گئے ہو!

آخری خط کشیدہ الفاظ خصوصیت کے ساتھ اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ ربوبیت و الوہیت کے بارے میں ان کی اصل گمراہی کیا تھی۔

فرعون و آلِ فرعون | اب ہمیں فرعون اور اس کی قوم کو دیکھنا چاہیئے جس کے باب میں نمرود اور اس کی قوم سے بھی زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ فرعون نہ صرف خدا کی ہستی کا منکر تھا بلکہ خود خدا ہونے کا مدعی تھا، یعنی اس کا دماغ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ وہ دنیا کے سامنے کھلم کھلا یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں خالق ارض و سماوات ہوں، اور اس کی قوم اتنی پاگل تھی کہ اس کے اس دعوے پر ایمان لاتی تھی۔ حالانکہ قرآن اور تاریخ کی شہادت سے اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ الوہیت و ربوبیت کے باب میں اس کی گمراہی نمرود کی گمراہی سے اور اس کی قوم کی گمراہی سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، فرق جو کچھ تھا وہ صرف اس بنا پر تھا کہ

ں سیاسی اسباب سے بنی اسرائیل کے ساتھ ایک قوم پرستانہ ضد اور متعصبانہ ہٹ دھرمی پیدا
ی تھی۔ اسی لئے محض عناد کی بنا پر اللہ کو الٰہ اور رب ماننے سے انکار کیا جاتا تھا اگرچہ ان میں اس کا
ن چھپا ہوا تھا۔ جیسا کہ آج کل بھی اکثر دہریوں کا حال ہے۔

صل واقعات یہ ہیں کہ حضرت یوسف کو جب مصر میں اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے اپنی پوری قوت
ی تعلیم کو پھیلانے میں صرف کر دی اور سرزمین مصر پر اتنا گہرا نقش مرتسم کیا کہ صدیوں تک کسی کے مٹ
ٹ سکا۔ اس وقت چاہے تمام اہل مصر نے دین حق قبول نہ کر لیا ہو، مگر یہ ناممکن تھا کہ مصر میں کوئی شخص
ے ناواقف رہ گیا ہو اور یہ نہ جان گیا ہو کہ وہی خالق ارض وسما ہے یہی نہیں بلکہ ان کی تعلیمات کا کم سے
م اتنا اثر ہر مصری پر ضرور ہو گیا تھا کہ وہ فوق الفطری معنوں میں اللہ کو الٰہ الالٰہ اور رب الارباب تسلیم کرتا تھ
ی کوئی مصری اللہ کی الوہیت و ربوبیت کا منکر نہ رہا تھا، البتہ جو ان میں کفر پر قائم رہ گئے تھے وہ الوہیت
ربوبیت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیراتے تھے یہ اثرات حضرت موسیٰ کی بعثت کے وقت تک باقی
ے۔ چنانچہ اس کا صریح ثبوت وہ تقریر ہے جو فرعونِ موسیٰ کے دربار میں ایک قبطی سردار نے کی تھی۔ جب
رعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کے دربار کا یہ امیر جو مسلمان ہو چکا تھا مگر اپنا اسلام
چھپائے ہوئے تھا، بے قرار ہو کر بول اٹھا:۔

أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ
قَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَإِنْ
يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ ۖ وَإِنْ يَكُ صَادِقًا
يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا
يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۔ يَا قَوْمِ لَكُمُ
الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا

کیا تم ایک شخص کو اس لئے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا
رب اللہ ہے حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے سامنے
کھلی کھلی نشانیاں لایا ہے؟ اگر وہ جھوٹا ہے تو اسکے جھوٹ
کا وبال اس پر ضرور پڑیگا۔ لیکن اگر وہ سچا ہے تو جس انجام سے
وہ تمہیں ڈرا رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تم پر نازل ہو کر رہیگا
یقین جانو کہ اللہ کسی حد سے بڑھے ہوئے جھوٹے آدمی کو فلاح

مِنْ بَأْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا؟..... يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ
اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ مِثْلَ
دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ..... وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ
مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ
مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ
يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا.....
وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ
اِلَى النَّارِ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ
بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ
اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ۔ (المومن ۴-۵)

کا راستہ نہیں دکھاتا۔ اے برادرانِ قوم! آج تمہارا تو
میں حکومت ہے زمین میں تم غالب ہو مگر کل اللہ کا عذاب
ہم پر آجائے تو کون ہماری مدد کرے گا؟......
اے برادرانِ قوم، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر وہ دن نہ آجائے
جو بڑی بڑی قوموں پر آچکا ہے، اور وہی انجام تمہارا
نہ ہو جو قوم نوح اور عاد اور ثمود اور بعد کی قوموں کا
ہوا..... اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس روشن
نشانیاں لے کر آئے تو تم اس چیز کے متعلق شک میں پڑے
رہے جسے وہ لائے تھے پھر جب ان کا انتقال ہو گیا
تو تم نے کہا کہ اللہ ان کے بعد کوئی رسول نہ بھیجے گا.....
اور اے برادرانِ قوم! یہ عجیب معاملہ ہے کہ میں تمہیں نجات
کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو۔ تم مجھے اس طرف بلاتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں
اور اسکے ساتھ ان کو شریک ٹھیراؤں جن کے شریک ہونے پر میرے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں ہے اور میں تمہیں
اس کی طرف بلاتا ہوں جو سب سے زبردست ہے اور بخشنے والا ہے۔

یہ پوری تقریر اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عظیم الشان شخصیت کا اثر کئی
صدیاں گزر جانے کے باوجود اس وقت تک باقی تھا اور اس جلیل القدر نبی کی تعلیم سے متاثر ہونے کے باعث
یہ قوم جہالت کے اس مرتبے پر نہ تھی کہ اللہ کی ہستی سے بالکل ہی ناواقف ہوتی یا یہ نہ جانتی کہ اللہ رب
اور الٰہ ہے اور قوائے فطرت پر اس کا غلبہ قہر قائم ہے اور اس کا غضب کوئی ڈرنے کی چیز ہے۔ نیز اس کے
آخری فقرے سے یہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اللہ کی الوہیت و ربوبیت کی قطعی منکر نہ تھی، بلکہ

اس کی گمراہی وہی تھی جو دوسری قوموں کی بیان ہو چکی ہے یعنی ان دونوں حیثیتوں میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانا۔

شبہ جس وجہ سے واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ فرعون حضرت موسیٰ کی زبان سے اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (ہم رب العالمین کے رسول ہیں) سن کر پوچھتا ہے وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (رب العالمین کیا چیز ہے؟) اپنے وزیر ہامان سے کہتا ہے کہ میرے لئے ایک اونچی عمارت بنا کہ میں موسیٰ کے الٰہ کو دیکھوں، حضرت موسیٰ کو دھمکی دیتا ہے کہ میرے سوا کسی اور کو تم نے الٰہ بنایا تو میں تمہیں قید کر دونگا، ملک مصر میں اعلان کرتا ہے کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں، اپنے درباریوں سے کہتا ہے کہ میں اپنے سوا تمہارے کسی الٰہ کو نہیں جانتا۔ اس قسم کے فقرات دیکھ کر لوگوں کو گمان ہوا ہے کہ شاید وہ اللہ کی ہستی ہی کا منکر تھا۔ رب العالمین کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھا، اور اپنے آپ ہی کو واحد معبود سمجھتا تھا۔ مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ اس کی یہ تمام باتیں قوم پرستانہ ضد کی وجہ سے تھیں حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں صرف یہی نہ ہوا تھا کہ آنجناب کی زبردست شخصیت کے اثر سے اسلام کی تعلیمات مصر میں پھیل گئی تھیں، بلکہ حکومت میں جو اقتدار ان کو حاصل ہوا تھا اس کی بدولت بنی اسرائیل مصر میں بہت با اثر ہو گئے تھے۔ تین چار سو سال تک یہ اسرائیلی اقتدار مصر پر چھایا رہا۔ پھر ملک میں اسرائیلیوں کے خلاف قوم پرستانہ جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کے اقتدار کو الٹ پھینکا گیا اور مصری قوم پرست خاندان یکے بعد دیگرے فرمانروا ہوتے چلے گئے۔ ان نئے فرمانرواؤں نے محض اسرائیلیوں کو دبانے اور کچلنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ دور یوسفی کے ایک ایک اثر کو مٹانے اور اپنے قدیم جاہلی مذہب کی روایات کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔ اس حالت میں جب حضرت موسیٰ تشریف لائے تو ان لوگوں کو خطرہ ہوا کہ کہیں اقتدار پھر ہمارے ہاتھ سے نکل کر اسرائیلیوں کے ہاتھ میں نہ چلا جائے۔ یہی عناد اور ہٹ دھرمی کا جذبہ تھا جس کی بنا پر فرعون چند بار حضرت موسیٰ سے پوچھتا تھا کہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟ میرے سوا اور الٰہ کون ہو سکتا ہے۔ ہو رہ

دراصل وہ رب العالمین سے بے خبر نہ تھا۔ اس کی اور اسکے اہل دربار کی جو گفتگوئیں اور حضرت موسٰی کی جو تقریریں قرآن میں آئی ہیں، ان سب سے یہ حقیقت بین طور پر ثابت ہوتی ہے مثلاً ایک موقع پر فرعون اپنی قوم کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ موسٰی خدا کے پیغمبر نہیں ہیں کہتا ہے۔

فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ (الزخرف-۵)

تو کیوں نہ اس کیلئے سونے کے کنگن اتارے گئے یا فرشتے صف بستہ ہو کر اس کے ساتھ کیوں نہ آئے؟

کیا یہ بات ایک ایسا شخص کہہ سکتا تھا۔ جو اللہ اور ملائکہ کے تصور سے خالی الذہن ہوتا؟ ایک اور موقع پر فرعون اور حضرت موسٰے کے درمیان یہ گفتگو ہوتی ہے۔

فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (بنی اسرائیل-۱۲)

فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسٰی میں تو سمجھتا ہوں کہ تیری عقل خبط ہو گئی ہے۔ موسٰی نے جواب دیا تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں رب زمین و آسمان کے سوا کسی اور کی نازل کی ہوئی نہیں ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ اے فرعون تیری شامت آ ہی گئی ہے

ایک مقام پر اللہ تعالےٰ فرعونیوں کی قلبی حالت اس طرح بیان فرماتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل-۱)

جب ہماری نشانیاں انکے سامنے علانیہ نمایاں ہو گئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے مگر انہوں نے محض شرارت اور تکبر و سرکشی کی بنا پر ماننے سے انکار کیا

ایک اور مجلس کا نقشہ قرآن یوں کھینچتا ہے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا

موسٰی نے ان سے کہا تم پر افسوس ہے، اللہ پر جھوٹ افترا نہ باندھو ورنہ وہ سخت عذاب سے تمہیں تباہ کر دیگا اور افترا جس نے بھی باندھا ہے وہ نامراد ہو کر ہی رہا ہے یہ سنکر وہ لوگ

النَّجْوَىٰ قَالُوا إِنْ هَٰذَانِ لَسَاحِرَانِ يُرِيدَانِ أَنْ يُخْرِجَاكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ (طٰہٰ - ۳)

آپس میں رد و کد کرنے لگے اور خفیہ مشورہ ہوا جس میں کہنے والوں نے کہا کہ یہ دونوں (موسیٰ و ہارون) تو جادوگر ہیں، چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہاری زمین سے بیدخل کر دیں اور تمہارے مثالی (آئیڈیل) طریق زندگی کو مٹا دیں۔

ظاہر ہے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور افترا کے انجام سے خبردار کرنے پر ان کے درمیان رد و کد اسی لئے شروع ہو گئی تھی کہ ان لوگوں کے دلوں میں کہیں تھوڑا بہت اثر خدا کی عظمت اور اسکے خوف کا موجود تھا، لیکن جب ان کے قوم پرست حکمران طبقہ نے سیاسی انقلاب کا خطرہ پیش کیا اور کہا کہ موسیٰ و ہارون کی بات ماننے کا انجام یہ ہوگا کہ مصر پھر اسرائیلیت سے مغلوب ہو جائیگی تو ان کے دل پھر سخت ہو گئے اور ان سب نے بالاتفاق رسولوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد ہم بآسانی یہ تحقیق کر سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان اصل جھگڑا کس بات پر تھا، فرعون اور اس کی قوم کی حقیقی گمراہی کس نوعیت کی تھی، اور فرعون کس معنی میں الوہیت و ربوبیت کا مدعی تھا۔ اس غرض کیلئے قرآن کی حسب ذیل آیات کو ترتیب وار ملاحظہ کیجئے۔

(۱) فرعون کے درباریوں میں سے جو لوگ حضرت موسیٰ کی دعوت کا استیصال کرنے پر زور دیتے تھے وہ ایک موقع پر فرعون کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔

أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ (اعراف - ۱۵۰)

کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دینگے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائے اور آپ کے الہوں کو چھوڑ دے ؟

دوسری طرف انہی درباریوں میں سے جو شخص حضرت موسیٰ پر ایمان لے آیا تھا وہ ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتا ہے۔ تَدْعُونَنِي لِأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَأُشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ (المومن - ۵۰)

تم مجھے اس طرف بلاتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اسکے ساتھ ان کو شریک کروں جن کے شریک ہونے کے لئے میرے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں۔

ان دونوں آیتوں کو جب ہم ان معلومات کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں جو تاریخ و آثار قدیمہ کے ذریعہ سے ہمیں اس زمانہ کے اہل مصر کے متعلق حاصل ہوئی ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فرعون خود بھی اور اسکی قوم کے لوگ بھی ربوبیت کے پہلے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے بعض دیوتاؤں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے تھے۔ اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر فرعون فوق الفطری معنوں میں خدائی کا مدعی ہوتا یعنی اگر اس کا دعویٰ یہی ہوتا کہ سلسلۂ اسباب پر وہ خود حکمراں ہے اور اسکے سوا کوئی زمین و آسمان کا الٰہ و رب نہیں ہے، تو وہ دوسرے الٰہوں کی پرستش نہ کرتا[1]۔

(۲) فرعون کے یہ الفاظ جو قرآن میں نقل کئے گئے ہیں کہ۔

يَآ اَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ (القصص ۴)	لوگو! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی الٰہ کو جانتا نہیں ہوں۔
لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (الشعراء - ۲)	اے موسیٰ اگر میرے سوا تو نے کسی کو الٰہ بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کر دوں گا۔

ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرعون اپنے سوا دوسرے تمام الٰہوں کی نفی کرتا تھا، بلکہ اسکی اصل غرض حضرت موسیٰ کی دعوت کو رد کرنا تھا۔ چونکہ حضرت موسیٰ ایک ایسے الٰہ کی طرف بلا رہے تھے جو صرف فوق الفطری معنی ہی میں معبود نہیں ہے، بلکہ سیاسی و تمدنی معنی میں امر و نہی کا مالک اور اقتدار اعلیٰ کا حامل بھی ہے اس لئے اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہارا ایسا الٰہ تو میرے سوا کوئی نہیں ہے، اور حضرت موسےٰ

---

[1] بعض مفسرین نے محض اس مفروضہ پر کہ فرعون خود الٰہ العالمین ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا، سورہ اعراف کی مذکورہ متن آیت میں اِلٰهَتَكَ کی قرأت اختیار کی ہے اور الٰهة کو بمعنی عبادت لیا ہے، یعنی ان کی قرأت کے مطابق آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ "آپ کو اور آپکی عبادت کو چھوڑ دے"۔ لیکن اول تو یہ قرأت شاذ ہے اور معروف قرأت کے خلاف ہے، دوسرے وہ مفروضہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے جس پر یہ قرأت اختیار کی گئی ہے تیسرے الٰهة کے معنی عبادت کے علاوہ معبودہ یا دیوی کے بھی ہو سکتے ہیں، سورج کیلئے عرب جاہلیت میں الٰهة ہی کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اور یہ معلوم ہے کہ بالعموم مصریوں کا صنم اکبر سورج ہی تھا۔

دھمکی دی کہ اس معنی میں میرے سوا کسی کو الٰہ بناؤ گے تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

نیز قرآن کی ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، اور تاریخ و آثار قدیمہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ فراعنہ مصر محض حاکمیت مطلقہ ہی کے مدعی نہ تھے بلکہ دیوتاؤں سے اپنا رشتہ جوڑ کر ایک طرح کی قدوسیت کا بھی دعوے رکھتے تھے تاکہ رعایا کے قلب و روح پر ان کی گرفت خوب مضبوط ہو جائے اس معاملہ میں تنہا فراعنہ ہی منفرد نہیں ہیں۔ دنیا کے اکثر ملکوں میں شاہی خاندانوں نے سیاسی حاکمیت کے علاوہ فوق الفطری الوہیت و ربوبیت میں بھی کم و بیش حصہ بٹانے کی کوشش کی ہے۔ اور رعیت کے لئے لازم کیا ہے کہ وہ ان کے آگے عبودیت کے کچھ نہ کچھ مراسم ادا کرے۔ لیکن دراصل یہ محض ایک ضمنی چیز ہے۔ اصل مقصد سیاسی حاکمیت کا استحکام ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے فوق الفطری الوہیت کا دعوے محض ایک تدبیر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لئے مصر میں اور دوسرے جاہلیت پرست ملکوں میں بھی ہمیشہ سیاسی زوال کے ساتھ ہی شاہی خاندانوں کی الوہیت بھی ختم ہوتی رہی ہے۔ اور تخت جس جس کے پاس گیا ہے الوہیت بھی اسی کی طرف منتقل ہوتی چلی گئی ہے۔

(۳) فرعون کا اصلی دعوے فوق الفطری خدائی کا نہیں بلکہ سیاسی خدائی کا تھا۔ وہ ربوبیت کے تیسرے چوتھے اور پانچویں معنی کے لحاظ سے کہتا تھا کہ میں سرزمین مصر اور اس کے باشندوں کا رب اعلیٰ ہوں، اس ملک اور اس کے تمام وسائل و ذرائع کا مالک میں ہوں، یہاں کی حاکمیت مطلقہ کا حق مجھ ہی کو پہنچتا ہے۔ یہاں کے تمدن و اجتماع کی اساس میری مرکزی شخصیت ہے، اور یہاں قانون میرے سوا کسی اور کا نہ چلے گا۔ قرآن کے الفاظ میں اس کے دعوے کی بنیاد یہ تھی۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الزخرف-۵۰)	اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کی کہ اے قوم! کیا میں ملک مصر کا مالک نہیں ہوں۔ اور یہ دریا میرے ماتحت نہیں بہتے ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟

یہ وہی بنیاد تھی جس پر نمرود کا دعوئے ربوبیت مبنی تھا (حَآجَّ اِبْرٰھِیْمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ) اور اسی بنیاد پر حضرت یوسف کا ہمعصر فرعون بھی اپنے اہل ملک کا رب بنا ہوا تھا۔

(۴) حضرت موسیٰ کی دعوت جس پر فرعون و آل فرعون سے ان کا جھگڑا تھا دراصل یہ تھی کہ اللہ رب العالمین کے سوا کسی معنی میں بھی کوئی دوسرا الٰہ اور رب نہیں ہے، وہی تنہا فوق الفطری معنی میں بھی الٰہ اور رب ہے اور سیاسی و اجتماعی معنی میں بھی پرستش بھی اُسی کی ہو۔ بندگی و اطاعت بھی اسی کی، اور شریعی قانون بھی اسی کی نیز یہ کہ صریح نشانیوں کے ساتھ اس نے مجھے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے میرے ذریعہ سے وہ اپنے امر و نہی کے احکام دیگا۔ لہٰذا اس کے بندوں کی عنانِ اقتدار تمہارے ہاتھ میں نہیں، میرے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ اسی بنا پر فرعون اور اسکے اعیانِ حکومت بار بار کہتے تھے کہ یہ دونوں بھائی ہمیں زمین سے بیدخل کرکے خود قابض ہونا چاہتے ہیں۔ اور ہمارے ملک کے نظامِ مذہب و تمدن کو مٹا کر اپنا نظام قائم کرنے کے درپے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (ہود۔ ۹)

ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور صریح نشان ماموریت کے ساتھ فرعون اور اسکے سرداران قوم کی طرف بھیجا تھا، مگر ان لوگوں نے فرعون کے امر کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا امر راستی پر نہ تھا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (الدخان-۱)

ہم نے ان سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمایش میں ڈالا تھا ایک معزز رسول ان کے پاس آیا اور اُس نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو، میں تمہارے لئے امانتدار رسول ہوں اور اللہ کے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو، میں تمہارے سامنے صریح نشان ماموریت پیش کرتا ہوں۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا

(اے اہل مکہ) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہی

عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا (المزمل-١)
قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰهٰ-٣)

دینے والا ہے اسی طرح جیسے ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا، پھر فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے سختی کیساتھ پکڑا
فرعون نے کہا اے موسیٰ اگر تم نہ دیوتاؤں کو رب مانتے ہو نہ شاہی خاندان کی تو آخر تمہارا رب ہے کون؟ موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو اس کی مخصوص ساخت عطا کی پھر اسے اس کے کام کرنے کا طریقہ بتایا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ؟ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ۔ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (الشعراء-١)

فرعون نے کہا اور یہ رب العالمین کیا ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا زمین و آسمان اور ہر اس چیز کا رب جو ان کے درمیان ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ فرعون اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے بولا سنتے ہو؟ موسیٰ نے کہا تمہارا رب بھی اور تمہارے گزشتہ آباؤ اجداد کا بھی۔ فرعون بولا تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں بالکل ہی پاگل ہیں موسیٰ نے کہا مشرق اور مغرب اور ہر اس چیز کا رب جو ان کے درمیان ہے، اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔ اس پر فرعون بول اٹھا کہ اگر میرے سوا تو نے کسی کو الٰہ بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کر دونگا۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى (طٰهٰ-٣)
وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ

فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ! کیا تو اس لئے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہماری زمین سے بیدخل کر دے؟
اور فرعون نے کہا چھوڑو مجھے کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ اپنے رب کو مدد کیلئے پکار دیکھے۔ مجھے خطرہ ہے کہ وہ تمہارے

دِیْنَکُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن ۳۰)	دین کو بدل ڈالیگا یا ملک میں فساد برپا کریگا۔
قَالُوْآ اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیْدٰنِ اَنْ یُّخْرِجٰکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ یَذْهَبَا بِطَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰی (طٰہٰ ۳)	انہوں نے کہا کہ یہ دونوں تو جادوگر ہیں، چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہاری زمین سے بیدخل کر دیں اور تمہارے مثالی طریق زندگی کو مٹا دیں۔

ان تمام آیات کو ترتیب وار دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ربوبیت کے باب میں وہی ایک گمراہی جو ابتدا سے دنیا کی مختلف قوموں میں چلی آرہی تھی، ارض نیل میں بھی ساری ظلمت اسی کی تھی، اور وہی ایک دعوت جو ابتدا سے تمام انبیاء دیتے چلے آرہے تھے۔ موسیٰ و ہارون علیہما السّلام بھی اسی کی طرف بلاتے تھے۔

یہود و نصاریٰ | قوم فرعون کے بعد ہمارے سامنے بنی اسرائیل اور وہ دوسری قومیں آتی ہیں۔ جنہوں نے یہودیت اور عیسائیت اختیار کی۔ انکے متعلق یہ تو گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لوگ اللہ کی ہستی کے منکر ہونگے، یا اس کو الٰہ اور رب نہ مانتے ہونگے، اس لئے کہ خود قرآن ان کے اہل کتاب ہونے کی تصدیق کرتا ہے پھر سوال یہ ہے کہ ربوبیت کے باب میں ان کے عقیدے اور طرز عمل کی وہ کونسی خاص غلطی ہے جس کی بناء پر قرآن نے اُن کو گمراہ قرار دیا ہے؟ اس کا مجمل جواب خود قرآن ہی سے ہمیں یہ ملتا ہے۔

قُلْ یٰٓاَهْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ (المائدہ ۱۰)	کہو، اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور اُن قوموں کے فاسد خیالات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے گمراہ ہو چکی ہیں جنہوں نے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کیا اور خود بھی راہ راست سے بھٹک گئیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہودی اور عیسائی قوموں کی گمراہی بھی اصلاً اسی نوعیت کی ہے۔ جس میں اُن سے پہلے کی قومیں ابتدا سے مبتلا ہوتی چلی آئی ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ یہ

گمراہی ان کے اندر غلو فی الدین[1] کے راستے سے آئی ہے۔ اب دیکھیے کہ اس اجمال کی تفصیل قرآن کس طرح کرتا ہے

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (التوبہ-۵)

یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ (المائدہ-۱۰)

کفر کیا ان عیسائیوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (المائدہ-۱۰)

کفر کیا ان عیسائیوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک الٰہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ ہے ہی نہیں۔

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ (المائدہ-۱۶)

اور جب اللہ پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی الٰہ بنا لو؟ تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ سبحان اللہ میری کیا مجال تھی کہ میں وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہ تھا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ وَلَا يَأْمُرَكُمْ

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کرے اور پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ ربانی (خدا پرست) بنو جس طرح تم خدا کی کتاب میں پڑھتے پڑھاتے ہو اور جیسے درس دیا کرتے ہو۔ کوئی نبی تم کو کبھی یہ حکم نہ

---

[1] غلو کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا۔ دین میں غلو کرنے کا مطلب ہے کہ دین میں کسی چیز کا جو مرتبہ، جو مقام اور جو حیثیت ہو اس کو اس سے بڑھا دیا جائے۔

اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران - ۸) دے گا کہ ملائکہ اور پیغمبروں کو رب بنا لو کیا وہ تمہیں کفر کی تعلیم دے گا جب کہ تم مسلم ہو چکے ہو۔

ان آیات کی رو سے اہل کتاب کی پہلی گمراہی یہ تھی کہ جو بزرگ ہستیاں ـــــ انبیاء، اولیاء، ملائکہ وغیرہ ـــــ دینی حیثیت سے قدر و منزلت کی مستحق تھیں، اُن کو انہوں نے انکے حقیقی مرتبہ سے بڑھا کر خدائی کے مرتبہ میں پہنچا دیا۔ کاروبار خداوندی میں اُنہیں دخیل و شریک ٹھیرایا، اُن کی پرستش کی، اُن سے دعائیں مانگیں، انہیں فوق الفطری ربوبیت والوہیت میں حصہ دار سمجھا اور یہ گمان کیا کہ وہ بخشش اور مدد اور نگہبانی کے اختیارات رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اُن کی دوسری گمراہی یہ تھی کہ:

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ - ۵) انہوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو بھی اپنا رب بنا لیا۔

یعنی نظامِ دینی میں جن لوگوں کی حیثیت صرف یہ تھی کہ خدا کی شریعت کے احکام بتائیں اور خدا کی مرضی کے مطابق اخلاق کی اصلاح کریں، انہیں رفتہ رفتہ یہ حیثیت دیدی کہ باختیار خود جس چیز کو چاہیں حرام اور جسے چاہیں حلال ٹھیرا دیں۔ اور کتاب الٰہی کی سند کے بغیر جو حکم چاہیں دیں، جس چیز سے چاہیں منع کر دیں اور جو سنت چاہیں جاری کریں۔ اس طرح یہ لوگ انہی دو عظیم الشان بنیادی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے جن میں قومِ نوح، قومِ ابراہیم، عاد، ثمود، اہل مدین اور دوسری قومیں مبتلا ہوئی تھیں، اُن کی طرح انہوں نے بھی فوق الطبعی ربوبیت میں فرشتوں اور بزرگوں کو اللہ کا شریک بنایا، اور اُنہی کی طرح انہوں نے تمدنی و سیاسی ربوبیت اللہ کے بجائے انسانوں کو دی اور اپنے تمدن، معاشرت، اخلاق اور سیاست کے اُصول و احکام اللہ کی سند سے بے نیاز ہو کر انسانوں سے لینے شروع کر دیئے حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ۔ (النساء - ۸) تم نے دیکھا اُن لوگوں کو جنہیں کتاب اللہ کا ایک حصہ ملا ہے اور اُن کی حالت یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مان رہے ہیں

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (المائدہ-۹)

کہو میں بتاؤں تمہیں اللہ کے نزدیک فاسقین سے بھی زیادہ بدتر انجام کن کا ہے؟ وہ جن پر اللہ نے لعنت کی جن پر اس کا غضب ٹوٹا جن میں بہت سے لوگ اس کے حکم سے بندر اور سور بنا دیے گئے اور جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ وہ سب سے بدتر درجہ کے لوگ ہیں اور راہ راست سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

"جبت" کا لفظ تمام اوہام و خرافات کے لئے جامع لفظ ہے جس میں جادو، ٹونے، ٹوٹکے، کہانت، فال گیری، سعد و نحس کے تصورات، غیر فطری تاثیرات، غرض جملہ اقسام کے توہمات شامل ہیں۔ اور "طاغوت" سے مراد ہر وہ شخص یا گروہ یا ادارہ ہے جس نے خدا کے مقابلہ میں بغاوت و سرکشی اختیار کی ہو اور بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خداوندی کا عَلَم بلند کیا ہو۔ پس یہود و نصاریٰ جب مذکورہ بالا دو قسم کی گمراہیوں میں پڑ گئے تو پہلی قسم کی گمراہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ہر قسم کے توہمات نے ان کے دلوں اور دماغوں پر قبضہ کر لیا، اور دوسری گمراہی نے ان کو علماء و مشائخ اور زہاد و صوفیہ کی بندگی سے بڑھا کر ان جباروں اور ظالموں کی بندگی و اطاعت تک پہنچا دیا جو کھلم کھلا خدا سے باغی تھے۔

مشرکین عرب

اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ عرب کے مشرکین جن کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اور جو قرآن کے اولین مخاطب تھے، اس باب میں ان کی گمراہی کس نوعیت کی تھی۔ کیا وہ اللہ سے ناواقف تھے یا اس کی ہستی کے منکر تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے بھیجے گئے تھے کہ انہیں وجود باری کا معترف بنائیں؟ کیا وہ اللہ کو الٰہ اور رب نہیں مانتے تھے اور قرآن اس لئے نازل ہوا تھا کہ انہیں حق جل شانہ کی الٰہیت و ربوبیت کا قائل کرے؟ کیا انہیں اللہ کی عبادت و پرستش سے انکار تھا؟ یا وہ اللہ کو دعائیں سننے والا اور حاجتیں پوری کرنے والا نہیں سمجھتے تھے؟ یا ان کا یہ خیال تھا کہ لات اور منات اور عزیٰ اور ہبل اور دوسرے معبود ہی اصل میں کائنات کے خالق، مالک، رازق، اور مدبر و منتظم ہیں؟ یا وہ اپنے ان معبودوں کو قانون کا منبع اور اخلاق و تمدن کے

مسائل میں ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ مانتے تھے؟ ان میں سے ایک ایک سوال کا جواب ہم کو قرآن سے نفی کی صورت میں ملتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ عرب کے مشرکین نہ صرف یہ کہ اللہ کی ہستی کے قائل تھے بلکہ اسے کائنات کا اور خود اپنے معبودوں تک کا خالق، مالک اور خداوند اعلیٰ مانتے تھے۔ اس کو رب اور الٰہ تسلیم کرتے تھے۔ مشکلات اور مصائب میں آخری اپیل وہ جس سرکار میں کرتے تھے وہ اللہ ہی کی سرکار تھی، انہیں اللہ کی عبادت و پرستش سے بھی انکار نہ تھا، اُن کا عقیدہ اپنے دیوتاؤں اور معبودوں کے بارے میں نہ تو یہ تھا کہ وہ ان کے اور کائنات کے خالق و رازق ہیں اور نہ یہ کہ یہ معبود زندگی کے تمدنی و اخلاقی مسائل میں ہدایت و رہنمائی کرتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کی آیات اس پر شاہد ہیں۔

قُلْ لِمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ، قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ، قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ، قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ، بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (المومنون-۵)

اے نبی ان سے کہو یہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کی ملک ہے، بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کی ملک ہے۔ کہو، پھر بھی تم نصیحت قبول نہیں کرتے؟ کہو ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟ وہ کہیں گے اللہ۔ کہو، پھر بھی تم نہیں ڈرتے؟ کہو، ہر چیز کے شاہانہ اختیارات کس کے ہاتھ میں ہیں اور وہ کون ہے جو پناہ دیتا ہے مگر اس کے مقابلہ میں پناہ دینے کی طاقت کسی میں نہیں، بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے یہ صفت اللہ ہی کی ہے۔ کہو پھر کہاں سے تم کو دھوکا لگتا ہے؟ حق یہ ہے کہ ہم نے صداقت ان کے سامنے پیش کر دی ہے اور یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ

وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے حتیٰ کہ جس وقت تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو، اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا

جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (یونس - ۳)

ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور تم سمجھتے ہو کہ طوفان میں گھر گئے ہو اس وقت سب اللہ ہی کو پکارتے ہیں اور اسی کے لئے اپنے دین کو خالص کر کے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے اس بلا سے ہم کو بچا لیا تو ہم تیرے شکر گزار بندے بنیں گے، مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (بنی اسرائیل ۷)

جب سمندر میں تم پر کوئی آفت آتی ہے تو اس ایک رب کے سوا اور جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں مگر جب وہ تمہیں بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے پھر جاتے ہو۔ سچ یہ ہے کہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔

اپنے معبودوں کے متعلق ان کے جو خیالات تھے وہ خود انہی کے الفاظ میں قرآن اس طرح نقل کرتا ہے

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر - ۱)
وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ

جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے ولی و کارساز ٹھیرا رکھے ہیں وہ، کہتے ہیں کہ ہم انکی عبادت اسلئے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ سے قریب کردیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے حضور میں ہمارے سفارشی ہیں۔

پھر وہ اپنے معبودوں کے بارے میں اس قسم کا بھی کوئی گمان نہ رکھتے تھے کہ وہ مسائل زندگی میں ہدایت بخشنے والے ہیں۔ چنانچہ سورہ یونس میں اللہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ:-

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِىْٓ اِلَى الْحَقِّ ؟

ان سے پوچھو، تمہارے ٹھیرائے ہوئے ان شریکوں میں سے کوئی حق کی طرف رہنمائی کرنے والا بھی ہے۔

لیکن یہ سوال سن کر ان پر سکوت چھا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی یہ جواب نہیں دیتا کہ ہاں لات یا منات

یا عزیٰ یا دوسرے معبود ہمیں فکر و عمل کی صحیح راہیں بتاتے ہیں۔ اور وہ دنیا کی زندگی میں عدل اور سلامتی اور امن کے اصول ہمیں سکھاتے ہیں، اور اُن کے سرچشمۂ علم سے ہم کو کائنات کے بنیادی حقائق کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ تب اللہ اپنے نبی سے فرماتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ، اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ

(یونس۔ ۳۵)

کہو، مگر اللہ حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے پھر بتاؤ کون اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، وہ جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے یا وہ جو رہنمائی نہیں کرتا الّا یہ کہ اسکی رہنمائی کی جائے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے فیصلے کر رہے ہو؟

ان تصریحات کے بعد اب یہ سوال طلب رہ جاتا ہے۔ کہ ربوبیت کے باب میں اُن کی وہ اصلی گمراہی کیا تھی جسکی اصلاح کرنے کیلئے اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا اور کتاب نازل کی؟ اس سوال کی تحقیق کیلئے جب ہم قرآن میں نظر کرتے ہیں تو ان کے عقائد و اعمال میں بھی ہم کو انہی دو بنیادی گمراہیوں کا سُراغ ملتا ہے جو قدیم سے تمام گمراہ قوموں میں پائی جاتی رہی ہیں یعنی ایک طرف فوق الطبعی ربوبیت و الٰہیت میں وہ اللہ کیساتھ دوسرے الٰہوں اور ارباب کو شریک ٹھیراتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ سلسلۂ اسباب پر جو حکومت کار فرما ہے اس کے اختیارات واقتدارات میں کسی نہ کسی طور پر ملائکہ اور بزرگ انسان، اور اجرام فلکی وغیرہ بھی دخل رکھتے ہیں، اور اسی بنا پر دعا اور استعانت اور مراسم عبودیت میں وہ صرف اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے بلکہ ان بناوٹی خداؤں کی طرف بھی رجوع کیا کرتے تھے۔ اور دوسری طرف تمدنی و سیاسی ربوبیت کے باب میں ان کا ذہن اس تصور سے بالکل خالی تھا۔ کہ اللہ اس معنی میں بھی رب ہے۔ اس معنی میں وہ اپنے مذہبی پیشواؤں اپنے سرداروں اور اپنے خاندان کے بزرگوں کو رب بنائے ہوئے تھے۔ اور انہی سے اپنی زندگی کے قوانین لیتے تھے۔ چنانچہ پہلی گمراہی کے متعلق قرآن یہ شہادت دیتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ

انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو خدا پرستی کی سرحد پر کھڑا ہو کر

فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ۔ يَدْعُو مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُ وَمَا لَا يَنْفَعُهُ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ۔ يَدْعُو لَمَنْ ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ ۚ لَبِئْسَ الْمَوْلَىٰ وَلَبِئْسَ الْعَشِيرُ۔

(الحج-۲)

اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی تکلیف پہنچ گئی تو الٹا پھر گیا۔ یہ شخص دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ اٹھانے والا ہے اور یہ صریح خسارہ ہے۔ وہ اللہ سے پھر کر ان کو پکارنے لگتا ہے جو نہ اُسے نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ فائدہ پہنچانے کی۔ یہی بڑی گمراہی ہے۔ وہ مدد کیلئے اُن کو پکارتا ہے جنہیں پکارنے کا نقصان بہ نسبت نفع کے زیادہ قریب ہے۔ کیسا برا مولیٰ ہے اور کیسا بُرا ساتھی۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ

(یونس-۲)

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کرتے ہیں جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، اور کہتے یہ ہیں کہ وہ اللہ کے حضور میں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہو کیا تم اللہ کو اُس بات کی خبر دیتے ہو جو اسکے علم میں نہ آسمانوں میں ہے نہ زمین میں؟[۱] اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَنْدَادًا

(حٰم السجدہ-۲)

اے نبی ان سے کہو! کیا واقعی تم اس خدا سے جس نے دو دن میں زمین کو پیدا کر دیا کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہو۔

۱؎ یعنی تم اس خیال خام میں مبتلا ہو کہ تمہارے ان معبودوں کا میرے ہاں ایسا زور چلتا ہے کہ جو سفارش یہ مجھ سے کر دیں وہ بس قبول ہو کر رہتی ہے اور اسی لئے تم ان کے آستانوں پر پیشانیاں رگڑتے اور نذریں چڑھاتے ہو۔ مگر میں تو آسمانوں اور زمین میں کسی ایسی ہستی کو نہیں جانتا جو میرے دربار میں اتنی زور آور ہو یا مجھے ایسی محبوب ہو کہ میں اس کی سفارش قبول کرنے پر مجبور ہو جاؤں، پھر کیا تم مجھے ان سفارشیوں کی خبر دے رہے ہو جنہیں میں خود نہیں جانتا؟ ظاہر ہے کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس چیز کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (المائدہ – ۱۰)

کہو! کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارے لئے نقصان کا کچھ اختیار رکھتے ہیں نہ فائدے کا، حالانکہ سننے اور جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ (الزمر – ۱)

اور جب انسان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو یکسو ہو کر اپنے رب ہی کو پکارتا ہے مگر جب وہ اپنی نعمت سے اس کو سرفراز کرتا ہے تو یہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس میں مدد کے لئے اس سے پہلے اللہ کو پکار رہا تھا اور اللہ کے ہمسر ٹھیرانے لگتا ہے[1] تاکہ یہ حرکت اسے اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ تَاللّٰهِ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ (النحل – ۷)

تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ کی بخشش سے حاصل ہے پھر جب تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اللہ ہی کی طرف فریاد لے کر تم جاتے ہو مگر جب وہ اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو اس مشکل کشائی میں اوروں کو شریک ٹھیرانے لگتے ہیں تاکہ ہمارے احسان کا جواب احسان فراموشی سے دیں۔ اچھا مزے کر لو عنقریب تمہیں اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔ یہ لوگ جن کو نہیں جانتے ان کے لئے ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے حصے مقرر کرتے ہیں[2]۔ خدا کی قسم جو افترا پردازیاں تم کرتے ہو ان کی باز پرس تم سے ہو کر رہے گی۔

---

[1] اللہ کے ہمسر ٹھیرانے لگتا ہے، یعنی پھر یہ کہنے لگتا ہے کہ یہ مصیبت فلاں بزرگ کی برکت سے ٹلی اور یہ نعمت فلاں حضرت کی عنایت سے نصیب ہوئی۔

[2] یعنی جن کے متعلق انہیں ہرگز کسی ذریعہ علم سے یہ تحقیق نہیں ہے کہ یہ مصیبت کے ٹالنے والے اور مشکل آسان کرنے والے تھے ان کے لئے شکرانے کے طور پر چڑھاوے اور نذریں اور نیازیں نکالتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے نکالتے ہیں

رہی دوسری گمراہی تو اُس کے متعلق قرآن کی شہادت یہ ہے۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ (الانعام ۔۱۲۰)

اور اسی طرح بہت سے مشرکین کیلئے اُن کے بنائے ہوئے شریکوں نے اپنی اولاد کا قتل پسندیدہ بنا دیا تاکہ انہیں ہلاکت میں مبتلا کریں اور اُنکے دین کو انکے لئے مشتبہ بنا دیں۔

ظاہر ہے کہ یہاں "شریکوں" سے مراد بُت اور دیوتا نہیں ہیں بلکہ وہ پیشوا اور رہنما ہیں جنہوں نے قتلِ اولاد کو اہل عرب کی نگاہ میں ایک بھلائی اور خوبی کا کام بنایا۔ اور حضرت ابراہیم و اسماعیل کے دین میں اس رسم قبیح کی آمیزش کر دی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ خدا کے "شریک" اس معنی میں قرار نہیں دیئے گئے تھے کہ اہل عرب ان کو سلسلۂ اسباب پر حکمران سمجھتے تھے، یا ان کی پرستش کرتے اور ان سے دعائیں مانگتے تھے بلکہ ان کو ربوبیت والٰہیت میں شریک اِس لحاظ سے ٹھیرایا گیا تھا کہ اہلِ عرب انکے اس حق کو تسلیم کرتے تھے کہ تمدنی و معاشرتی مسائل اور اخلاقی و مذہبی امور میں وہ جیسے چاہیں قوانین مقرر کر دیں۔

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ (الشوریٰ ۔۳)

کیا یہ ایسے شریک بنائے بیٹھے ہیں جنہوں نے ان کیلئے دین کی قسم سے وہ قانون بنا دیا جسکا اللہ نے کوئی اذن نہیں دیا ہے؟

لفظ "دین" کی تشریح آگے چل کر بیان ہوگی، اور وہیں اس آیت کے مفہوم کی وسعت بھی پوری طرح واضح ہو سکیگی لیکن یہاں کم ازکم یہ بات تو صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر اُن کے پیشواؤں اور سرداروں کا ایسے ضابطے اور قاعدے مقرر کرنا جو "دین" کی نوعیت رکھتے ہوں اور اہل عرب کا ان ضابطوں اور قاعدوں کو واجب التقلید مان لینا، یہی ربوبیت والٰہیت میں اُن کا خدا کے ساتھ شریک بننا اور یہی اہل عرب کا اُن کی شرکت کو تسلیم کر لینا تھا۔

قرآن کی دعوت گمراہ قوموں کے تخیلات کی یہ تحقیق جو پچھلے صفحات میں کی گئی ہے، اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیتی ہے کہ قدیم ترین زمانہ سے لے کر زمانۂ نزول قرآن تک جتنی قوموں کا ذکر قرآن نے ظالم

فاسد العقیدہ اور بدراہ ہونے کی حیثیت سے کیا ہے اُن میں کوئی بھی خدا کی ہستی کی منکر نہ تھی۔ نہ کسی کو اللہ کے مطلقاً رب اور الٰہ ہونے سے انکار تھا، البتہ ان سب کی اصل گمراہی اور مشترک گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے ربوبیت کے اُن پانچ مفہومات کو جو ہم ابتدا میں لغت اور قرآن کی شہادتوں سے متعین کر چکے ہیں، دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ رب کا یہ مفہوم کہ وہ فوق الفطری طور پر مخلوقات کی پرورش، خبرگیری، حاجت روائی اور نگہبانی کا کفیل ہوتا ہے۔ اُن کی نگاہ میں ایک الگ نوعیت رکھتا تھا اور اس مفہوم کے اعتبار سے وہ اگرچہ ربِ اعلیٰ تو اللہ ہی کو مانتے تھے مگر اس کے ساتھ فرشتوں اور دیوتاؤں کو، جنوں اور غیر مرئی قوتوں کو، ستاروں اور سیاروں کو، انبیاء، اولیاء، اور روحانی پیشواؤں کو بھی ربوبیت میں شریک ٹھیراتے تھے اور رب کا یہ مفہوم کہ وہ امر و نہی کا مختار، اقتدارِ اعلیٰ کا مالک، ہدایت و رہنمائی کا منبع، قانون کا ماخذ، مملکت کا رئیس اور اجتماع کا مرکز ہوتا ہے اُن کے نزدیک بالکل ہی ایک دوسری حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس مفہوم کے اعتبار سے وہ یا تو اللہ کے بجائے انسانوں ہی کو رب مانتے تھے، یا نظری طور پر اللہ کو رب ماننے کے باوجود عملاً انسانوں کی اخلاقی یا تمدنی اور سیاسی ربوبیت کے آگے سرِ اطاعت خم کئے رہتے تھے۔

اسی گمراہی کو دور کرنے کے لئے ابتدا سے انبیاء علیہم السّلام آتے رہے ہیں اور اسی کیلئے آخر کار محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اُن سب کی دعوت یہ تھی کہ ان تمام مفہومات کے اعتبار سے رب ایک ہی ہے اور وہ اللہ جل شانہٗ ہے۔ ربوبیت ناقابلِ تقسیم ہے، اُس کا کوئی جز کسی معنی میں بھی کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے۔ کائنات کا نظام ایک کامل مرکزی نظام ہے جس کو ایک ہی خدا نے پیدا کیا، جس پر ایک ہی خدا فرمانروائی کر رہا ہے جس کے سارے اختیارات و اقتدارات کا مالک ایک ہی خدا ہے۔ نہ اس نظام کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا کچھ دخل ہے، نہ اس کی تدبیر و انتظام میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کی فرمانروائی میں کوئی حصہ دار ہے۔ مرکزی اقتدار کا مالک ہونے کی حیثیت سے وہی اکیلا خدا تمہارا فوق الفطری رب بھی ہے۔ اور اخلاقی، تمدنی اور سیاسی رب بھی، وہی تمہارا معبود ہے۔ وہی تمہارے سجدوں اور رکوعوں کا مرجع ہے، وہی

تمہاری دعاؤں کا ملجأ و ماویٰ ہے، وہی تمہارے توکل و اعتماد کا سہارا ہے، وہی تمہاری ضرورتوں کا کفیل ہے، اور اسی طرح وہی بادشاہ، وہی مالک الملک، وہی شارع و قانون ساز، اور وہی امر و نہی کا مختار بھی ہے، ربوبیت کی یہ دونوں حیثیتیں جن کو جاہلیت کی وجہ سے تم نے ایک دوسرے سے الگ کیا ہے حقیقت میں خدائی کا لازمہ اور خدا کے خدا ہونے کا خاصہ ہیں۔ انہیں نہ تو ایک دوسرے سے منفک کیا جا سکتا ہے اور نہ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی مخلوقات کو خدا کا شریک ٹھیرانا درست ہے۔

اس دعوت کو قرآن جس طریقہ سے پیش کرتا ہے وہ خود اس کی زبان سے سنیئے:

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ (اعراف-۷)

حقیقت میں تمہارا رب تو اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہو گیا، جو دن کو رات کا لباس اڑھاتا ہے اور پھر رات کے تعاقب میں دن تیزی کے ساتھ دوڑا آتا ہے، سورج اور چاند اور تارے سب کے سب جس کے تابع فرمان ہیں۔ سنو! خلق اسی کی ہے اور فرمانروائی بھی اسی کی۔ بڑا با برکت ہے وہ کائنات کا رب۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللّٰهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلٰلُ فَأَنّٰى تُصْرَفُونَ (یونس)

ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے؟ کانوں کی شنوائی اور آنکھوں کی بینائی کس کے قبضہ و اختیار میں ہے؟ کون ہے جو بیجان کو جاندار میں سے اور جاندار کو بیجان میں سے نکالتا ہے؟ اور کون اس کارگاہِ عالم کا انتظام چلا رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے، اللہ۔ کہو، پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ جب یہ سارے کام اسی کے ہیں تو تمہارا حقیقی رب اللہ ہی ہے، حقیقت کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے؟ آخر کہاں سے تمہیں یہ ٹھوکر لگتی ہے کہ حقیقت سے پھرے جاتے ہو؟

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی..... ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ لَهُ الْمُلْکُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ (الزمر-۱)

اُس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے، رات کو دن پر اور دن کو رات پر وہی لپیٹتا ہے چاند اور سورج کو اسی نے ایسے ضابطہ کا پابند بنایا ہے کہ ہر ایک اپنے مقرر وقت تک چلے جا رہا ہے..... یہی اللہ تمہارا رب ہے بادشاہی اسی کی ہے، اسکے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں، آخر یہ تم کہاں سے ٹھوکر کھا کر پھرے جاتے ہو؟

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا..... ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ..... اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ، ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ، هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۔ (المومن-۷)

اللہ جس نے تمہارے لئے رات بنائی کہ اس میں تم سکون حاصل کرو اور دن کو روشن کیا..... وہی اللہ تمہارا رب ہے ہر چیز کا خالق، کوئی اور معبود اسکے سوا نہیں، پھر یہ کہاں سے دھوکا کھا کر تم بھٹکائے جاتے ہو؟..... اللہ جس نے تمہارے لئے زمین کو جائے قرار بنایا، آسمان کی چھت تم پر چھائی تمہاری صورتیں بنائیں اور خوب ہی صورتیں بنائیں اور تمہاری غذا کے لئے پاکیزہ چیزیں مہیا کیں وہی اللہ تمہارا رب ہے بڑا بابرکت ہے وہ کائنات کا رب، وہی زندہ ہے، کوئی اور معبود اسکے سوا نہیں، اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ..... یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ لَهُ الْمُلْکُ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ

اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا..... وہ رات کو دن میں پرو دیتا ہے اور دن کو رات میں، اس نے چاند اور سورج کو ایسے ضابطہ کا پابند بنایا ہے کہ ہر ایک اپنے مقرر وقت تک چلے جا رہا ہے یہی اللہ تمہارا رب ہے بادشاہی اسی کی ہے اسکے سوا جن دوسری

مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ (فاطر-۲)

ہستیوں کو تم پکارتے ہو انکے ہاتھ میں ایک تنکے کا اختیار بھی نہیں ہے اگر تم پکارو تو وہ تمہاری پکار سن نہیں سکتے اور سن بھی لیں تو تمہاری درخواست کا جواب دینا انکے بس میں نہیں۔ تم جو انہیں شریک خدا بناتے ہو اس کی تردید وہ خود قیامت کے دن کر دینگے۔

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ..... ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ..... فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم-۴)

آسمانوں کے رہنے والے ہوں یا زمین کے، سب اس کے غلام اور اسکے تابع فرمان ہیں..... اللہ خود تمہاری اپنی ذات سے ایک مثال تمہارے سامنے بیان کرتا ہے۔ کیا تمہارے غلاموں میں سے کوئی ان چیزوں کی ملکیت میں تمہارا شریک ہوتا ہے جو ہم نے تمہیں بخشی ہیں؟ کیا ان چیزوں کے اختیارات و تصرفات میں تم اور تمہارے غلام مساوی ہوتے ہو؟ کیا تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جسطرح اپنے برابر والوں سے ڈرا کرتے ہو؟ جو لوگ عقل سے کام لینے والے ہیں ان کیلئے تو ہم حقیقت کو پیش کرنے والی دلیلیں اسطرح کھول کر بیان کر دیتے ہیں مگر ظالم لوگ علم کے بغیر اپنے بے بنیاد خیالات کے پیچھے چلے جا رہے ہیں..... لہذا تم بالکل یکسو ہو کر حقیقی دین کے راستے پر اپنے آپ کو ثابت قدم کر دو، اللہ کی فطرت پر قائم ہو جاؤ جس پر اس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی خلقت کو بدلا نہ جائے یہی ٹھیک سیدھا طریقہ ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (الزمر-۷)

ان لوگوں نے اللہ کی عظمت و کبریائی کا اندازہ جیسا کہ کرنا چاہیے تھا نہیں کیا۔ قیامت کے روز یہ دیکھیں گے کہ زمین پوری کی پوری اس کی مٹھی میں ہے اور آسمان اسکے ہاتھ میں سمٹے ہوئے ہیں

اس کی ذات منزہ اور بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا شریک ہو، جیسا کہ یہ لوگ قرار دے رہے ہیں۔

فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَلَہُ الْکِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (جاثیہ-۴)

پس ساری تعریف اللہ ہی کیلئے ہے جو زمین اور آسمان اور تمام کائنات کا رب ہے، کبریائی اسی کی ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی، اور وہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا فَاعْبُدْہُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا (مریم-۴)

وہ زمین اور آسمانوں کا مالک اور ان ساری چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں، لہٰذا تو اسی کی بندگی کر اور اس کی بندگی پر ثابت قدم رہ۔ کیا اس جیسا اور کوئی تیرے علم میں ہے؟

وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اِلَیْہِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ فَاعْبُدْہُ وَ تَوَکَّلْ عَلَیْہِ (ہود-۱۰)

زمین اور آسمانوں کی ساری پوشیدہ حقیقتیں اللہ کے علم میں ہیں اور سارے معاملات اسی کی سرکار میں پیش ہوتے ہیں، لہٰذا تو اسی کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ کر۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا (المزمل-۱)

مشرق اور مغرب سب کا وہی مالک ہے، اسکے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تو اسی کو اپنا مختار بنالے۔

اِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْنِ، وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَھُمْ بَیْنَھُمْ کُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ (الانبیاء-۶)

حقیقت میں تمہاری یہ امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، لہٰذا تم میری بندگی کرو، لوگوں نے اس کا ربوبیت اور اس معاملۂ بندگی کو آپس میں خود ہی تقسیم کرلیا ہے۔ مگر ان سب کو بہرحال ہماری طرف ہی پلٹ کر آنا ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ (اعراف-۱)

پیروی کرو اس کتاب کی جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کی پیروی نہ کرو

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ

کہو اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے

بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ (آل عمران - ۷)

درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم نہ تو اللہ کے سوا کسی کی بندگی کریں نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیں، اور نہ ہم میں سے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اللہ کے سوا اپنا رب بنائے۔

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلٰهِ النَّاسِ (الناس)

کہو میں پناہ ڈھونڈتا ہوں اس کی جو انسانوں کا رب، انسانوں کا بادشاہ اور انسانوں کا معبود ہے

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (الکہف ۱۲)

پس جو اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیئے کہ نیک کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی اور کی بندگی شریک نہ کرے۔

ان آیات کو سلسلہ وار پڑھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن ربوبیت کو بالکل حاکمیت اور سلطانی کا ہم معنی قرار دیتا ہے اور رب کا یہ تصور ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ وہ کائنات کا سلطانِ مطلق اور لاشریک مالک و حاکم ہے۔ اسی حیثیت سے وہ ہمارا اور تمام جہان کا پروردگار، مربی اور حاجت روا ہے، اسی حیثیت سے وہ ہمارا کفیل، خبرگیراں، مختارِ کار اور معتمد علیہ ہے، اسی حیثیت سے اس کی وفاداری وہ قدرتی بنیاد ہے جس پر ہماری اجتماعی زندگی کی عمارت صحیح طور پر قائم ہوتی ہے اور اس کی مرکزی حیثیت سے وابستگی تمام متفرق افراد اور گروہوں کے درمیان ایک امت کا رشتہ پیدا کرتی ہے۔ اسی حیثیت سے وہ ہماری اور تمام مخلوقات کی بندگی، اطاعت اور پرستش کا مستحق ہے اور اسی حیثیت سے وہ ہمارا اور ہر چیز کا مالک، آقا اور فرمانروا ہے۔ اہل عرب اور دنیا کے تمام جاہل لوگ ہر زمانہ میں اس غلطی میں مبتلا تھے۔ اور اب تک ہیں۔ کہ ربوبیت کے اس جامع تصور کو انہوں نے پانچ مختلف النوع ربوبیتوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اپنے قیاس و گمان سے یہ رائے قائم کی کہ مختلف قسم کی ربوبیتیں مختلف ہستیوں سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ اور متعلق ہیں لیکن قرآن اپنے طاقتور استدلال سے یہ ثابت کرتا ہے کہ کائنات کے اس مکمل مرکزی نظام میں اس بات کی مطلق گنجایش نہیں ہے۔ کہ اقتدار اعلےٰ جس خدا کے ہاتھ میں ہے اس کے سوا ربوبیت کا کوئی کام کسی دوسری ہستی سے کسی درجہ میں بھی متعلق ہو۔ اس نظام کی مرکزیت خود گواہ ہے کہ ہر طرح کی ربوبیت اسی ایک خدا کیلئے مختص ہے جو اس نظام کو وجود میں لایا ہے لہٰذا جو شخص اس نظام کے اندر رہتے ہوئے ربوبیت کا کوئی جز کسی معنی میں بھی خدا کے سوا کسی اور سے متعلق سمجھتا ہے یا متعلق کرتا ہے وہ دراصل حقیقت سے لڑتا ہے، صداقت سے منہ موڑتا ہے، حق کے خلاف بغاوت کرتا ہے، اور امرِ واقعی کے خلاف کام کر کے اپنے آپ کو خود نقصان اور ہلاکت میں مبتلا کرتا ہے۔

عبادت

لغوی تحقیق | عربی زبان میں عبودۃ، عبودیۃ اور عبدیہ کے اصل معنی خضوع اور تذلل کے ہیں یعنی تابع ہو جانا، رام ہو جانا، کسی کے سامنے اس طرح سپر ڈال دینا کہ اس کے مقابلہ میں کوئی مزاحمت یا انحراف و سرتابی نہ ہو اور وہ اپنے منشاء کے مطابق جس طرح چاہے خدمت لے اسی اعتبار سے اہل عرب اس اونٹ کو بعیر معبّد کہتے ہیں جو سواری کیلئے پوری طرح رام ہو چکا ہو، اور اس راستے کو طریق معبّد کہتے ہیں جو کثرت سے پامال ہو کر ہموار بن گیا ہو، پھر اسی اصل سے اس مادہ میں غلامی، اطاعت، پوجا، ملازمت اور قید یا رکاوٹ کے مفہومات پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ عربی لغت کی سب سے بڑی کتاب "لسان العرب" میں اس کی جو تشریح کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) العبد المملوک خلاف الحر۔ "عبد وہ ہے جو کسی کی ملک ہو اور یہ لفظ حر (آزاد) کی ضد ہے" تعبّد الرجل۔ آدمی کو غلام بنا لیا یا اس کے ساتھ غلام جیسا معاملہ کیا۔ یہی معنی عبدہ، اعبدہ اور اعتبدہ کے ہیں حدیث میں آتا ہے ثلثۃ انا خصمھم، رجل اعتبد محررا (وفی روایۃ اعبد محررا) یعنی تین آدمی ہیں جن کے خلاف قیامت کے دن میں مستغیث بنونگا من جملہ ان کے ایک وہ شخص ہے جو کسی آزاد کو غلام بنائے یا غلام کو آزاد کرنے کے بعد پھر اس سے غلام کا سا معاملہ کرے حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا تھا وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَ بَنِي إِسْرَائِيلَ اور تیرا وہ احسان جس کا طعنہ تو مجھے دے رہا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا۔"

(۲) العبادۃ الطاعۃ مع الخضوع "عبادت اس اطاعت کو کہتے ہیں جو پوری فرمانبرداری کیساتھ ہو۔" عَبَدَ الطَّاغُوتَ اے اطاعہ، طاغوت کی عبادت کی یعنی اس کا فرمانبردار ہو گیا۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ ای نطیع الطاعة التی یخضع معها ہم تیری عبادت کرتے ہیں یعنی ہم تیری اطاعت پوری فرمانبرداری کے ساتھ کرتے ہیں۔" اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ای اطیعوا ربکم اپنے رب کی عبادت کرو یعنی اسکی اطاعت کرو۔" قَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ ای دائنون وکل من دان لملك فهو عابد له و قال ابن الانباری فلان عابد وھو الخاضع لربه المستسلم المنقاد لامره یعنی فرعون نے جو یہ کہا تھا کہ موسیٰ اور ہارون کی قوم ہماری عابد ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری تابع فرمان ہے جو شخص کسی بادشاہ کا مطیع ہے وہ اس کا عابد ہے اور ابن الانباری کہتا ہے کہ فلان عابد کے معنی ہیں" وہ اپنے مالک کا فرمانبردار اور اسکے حکم کا مطیع ہے۔"

(۳) عبدہ عبادۃً ومعبداً ومعبدۃ تألّہ لہ "اس کی عبادت کی یعنی اس کو پوجا، التعبد التنسك، تعبد سے مراد ہے کسی کا پرستار پجاری بن جانا" شاعر کہتا ہے اری المال عند الباخلین معبّداً "میں دیکھتا ہوں کہ بخیلوں کے ہاں روپیہ پُجتا ہے۔"

(۴) عبد بہ وعبد بہ لزمه فلم یفارقہ "عَبِدَہٗ اور عَبِدَ بہٖ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسکے ساتھ وابستہ ہو گیا اور جدا نہ ہُوا، اس کا دامن تھام لیا اور چھوڑا نہیں۔

(۵) ما عبدك عنی ای ما حبسك جب کوئی شخص کسی کے پاس آنے سے رُک جائے تو وہ یوں کہے گا کہ ماعبدک عنی، یعنی کس چیز نے تجھے میرے پاس آنے سے روک دیا۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادہ عبد کا اساسی مفہوم کسی کی بالادستی و برتری تسلیم کرکے اسکے مقابلہ میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جانا، سرتابی و مزاحمت چھوڑ دینا اور اسکے لئے رام ہو جانا ہے۔ یہی حقیقت بندگی و غلامی کی ہے لہذا اس لفظ سے اولین تصور جو ایک عرب کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ بندگی و غلامی ہی کا تصور ہے۔ پھر چونکہ غلام کا اصل کام اپنے آقا کی اطاعت فرمانبرداری ہے اس لئے لازماً اس کے ساتھ ہی اطاعت کا تصور پیدا ہوتا ہے اور جبکہ ایک غلام اپنے آقا کی بندگی

واطاعت ہیں محض اپنے آپ کو سپرد ہی نہ کر چکا ہو بلکہ اعتقاداً اسکی برتری کا قائل اور اسکی بزرگی کا معترف بھی ہو۔ اور اسکی مہربانیوں پر شکر و احسانمندی کے جذبہ سے بھی سرشار ہو تو وہ اسکی تعظیم و تکریم میں مبالغہ کرتا ہے مختلف طریقوں سے اعتراف نعمت کا اظہار کرتا ہے اور طرح طرح سے مراسم بندگی بجالاتا ہے اسی کا نام پرستش ہے اور یہ تصور عبدیت کے مفہوم میں صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جبکہ غلام کا محض سرہی آقا کے سامنے جھکا ہوا نہ ہو بلکہ اس کا دل بھی جھکا ہوا ہو رہے باقی دو تصورات تو وہ دراصل عبدیت کے ضمنی تصورات ہیں۔ اصلی اور بنیادی نہیں ہیں۔

لفظ عبادت کا استعمال قرآن میں

اس لغوی تحقیق کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب پاک میں یہ لفظ تمام تر پہلے تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں معنی اوّل و دوم ایک ساتھ مراد ہیں، کہیں صرف معنی دوم اور کہیں صرف معنی سوم مراد لئے گئے ہیں اور کہیں تینوں معنی بیک وقت مقصود ہیں۔ اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

عبادت بمعنی غلامی واطاعت

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ فَقَالُوْا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ (مومنون - ۳)

پھر ہم نے موسیٰ اور اسکے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور صریح دلیل ماموریت کے ساتھ فرعون اور اسکے اعیان سلطنت کی طرف بھیجا مگر وہ تکبر سے پیش آئے کیونکہ وہ با اقتدار لوگ تھے انہوں نے کہا کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان آئیں اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری عابد ہے

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الشعراء)

اور فرعون نے جب موسیٰ کو طعنہ دیا کہ ہم نے تجھے اپنے ہاں بچپن میں پالا ہے تو موسیٰ نے کہا اور تیرا وہ احسان جسکا تو مجھے طعنہ دے رہا ہے یہی تو ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عبد بنا لیا۔

دونوں آیتوں میں عبادت سے مراد غلامی اور اطاعت و فرمانبرداری ہے فرعون نے کہا کہ موسے اور

ہارون کی قوم ہماری عابد ہے یعنی ہماری غلام اور ہمارے فرمان کی تابع ہے اور حضرت موسیٰ نے کہا کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عبد بنا لیا ہے یعنی ان کو غلام بنا لیا ہے اور ان سے من مانی خدمت لیتا ہے

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (البقرہ ۲۱)	اے ایمان لانے والو! اگر تم ہماری عبادت کرتے ہو تو ہم نے جو پاک چیزیں تمہیں بخشی ہیں انہیں کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔

اس آیت کا موقع و محل یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اپنے مذہبی پیشواؤں کے احکام اور اپنے آباواجداد کے اوہام کی بیڑیوں میں کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق طرح طرح کی قیود کی پابندی کرتے تھے جب ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اگر تم ہماری عبادت کرتے ہو تو ان ساری پابندیوں کو ختم کر دو اور جو کچھ ہم نے حلال کیا ہے اسے حلال سمجھ کر بے تکلف کھاؤ پیو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے پنڈتوں اور بزرگوں کے نہیں بلکہ ہمارے بندے ہو، اور اگر تم نے واقعی انکی اطاعت و فرماں برداری چھوڑ کر ہماری اطاعت و فرمانبرداری قبول کی ہے تو اب تمہیں حلت اور حرمت اور جواز اور عدم جواز کے معاملہ میں ان کے بنائے ہوئے ضابطوں کے بجائے ہمارے ضابطہ کی پیروی کرنی ہوگی۔ لہٰذا یہاں بھی عبادت کا لفظ غلامی اور اطاعت ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ (المائدہ-۹)	کہو، میں بتاؤں تمہیں کہ اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا انجام کن لوگوں کا ہے؟ وہ جن پر اللہ کی پھٹکار ہوئی اور اسکا غضب ٹوٹا جن میں سے بہت سے لوگ بندر اور سور تک بنا دیئے گئے جنھوں نے طاغوت کی عبادت کی۔
وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۵)	ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر یہ تعلیم دینے کیلئے بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے باز رہو۔

وَالَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى (الزمر-۲)

اور خوشخبری ہے اُن لوگوں کے لئے جنھوں نے طاغوت کی عبادت چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کیا۔

تینوں آیتوں میں طاغوت کی عبادت سے مراد طاغوت کی غلامی اور اطاعت ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر اسی سلسلہ کے مضامین میں بہ تشریح بیان ہوگا، قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد ہر وہ ریاست و اقتدار اور ہر وہ رہنمائی و پیشوائی ہے جو خدا سے باغی ہو کر خدا کی زمین میں اپنا حکم چلائے اور اسکے بندوں کو زور و جبر سے یا تحریص و اطماع سے یا گمراہ کن تعلیمات سے اپنا تابع امر بنائے۔ ایسے ہر اقتدار اور ایسی ہر پیشوائی کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور اس کی بندگی اختیار کرکے اس کا حکم بجا لانا طاغوت کی عبادت ہے۔

عبادت بمعنی فرمانبرداری | اب اُن آیات کو لیجیے جن میں عبادت کا لفظ صرف معنی دوم میں استعمال ہوا ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (یٰسٓ)

اے بنی آدم کیا میں تم کو تاکید نہ کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے؟

ظاہر ہے کہ شیطان کی پرستش تو دنیا میں کوئی بھی نہیں کرتا، بلکہ ہر طرف سے اس پر لعنت اور پھٹکار ہی پڑتی ہے۔ لہٰذا بنی آدم پر جو فرد جرم اللہ تعالٰے کی طرف سے قیامت کے روز لگائی جائیگی وہ اس بات کی نہ ہوگی کہ انہوں نے شیطان کو پوجا، بلکہ اس بات کی ہوگی کہ وہ شیطان کے کہے پر چلے اور اسکے احکام کی اطاعت کی اور جس جس راستہ کی طرف وہ اشارہ کرتا گیا اُس پر دوڑے چلے گئے۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ... وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا

(جب قیامت برپا ہوگی تو اللہ فرمائیگا) تمام ظالموں اور انکے ساتھیوں کو اور اُن معبودان غیر اللہ کو جن کی عبادت کی جاتی تھی، جمع کرو اور انہیں جہنم کا راستہ دکھاؤ... پھر آپس میں ایک دوسرے سے رد و کد کرنے لگیں گے۔ عبادت کرنے والے کہیں گے کہ تم وہی لوگ تو ہو جو خیر کی راہ سے ہمارے

مُؤْمِنِيْنَ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ (الصّٰفّٰت - ۲)

پاس آتے تھے۔ ان کے معبود جواب دیں گے کہ اصل میں تو تم خود ایمان لانے پر تیار نہ تھے۔ ہمارا کوئی زور تم پر نہیں تھا، تم آپ ہی نافرمان لوگ تھے۔

اس آیت میں عابدوں اور معبودوں کے درمیان جو سوال و جواب نقل کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں معبودوں سے مراد بت اور دیوتا نہیں ہیں جن کی پوجا کی جاتی تھی، بلکہ وہ پیشوا اور رہنما ہیں جنہوں نے خیر طلب بن کر انسانوں کو گمراہ کیا۔ جو تقدس کے جامے پہن کر نمودار ہوئے، جنہوں نے سجادوں اور تسبیحوں اور جبوں اور گلیموں سے بندگان خدا کو دھوکا دیکر اپنا معتقد بنایا، جنہوں نے اصلاح اور خیر خواہی کے دعوے کر کے شر اور فساد پھیلائے۔ ایسے لوگوں کی اندھی تقلید اور ان کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کرنے کو یہاں عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ، (التوبہ - ۵)

انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا کے بجائے اپنا رب بنا لیا اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

یہاں علماء اور مشائخ کو رب بنا کر ان کی عبادت کرنے سے مراد ان کو امر و نہی کا مختار ماننا اور خدا و پیغمبر خدا کی سند کے بغیر ان کے احکام کی اطاعت بجا لانا ہے۔ اسی معنی کی تصریح روایات صحیحہ میں خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرما دی ہے۔ جب آپ سے عرض کیا گیا کہ ہم نے اپنے علماء اور مشائخ کی پرستش تو کبھی نہیں کی تو آپ نے جواب دیا کہ جس چیز کو انہوں نے حلال ٹھیرایا، کیا تم نے اسے حلال نہیں سمجھ لیا اور جسے انہوں نے حرام قرار دیا، کیا تم نے اسے حرام نہیں مان لیا؟

عبادت بمعنی پرستش اب تیسرے معنی کی آیات لیجیے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قرآن کی رو سے عبادت بمعنی پرستش میں دو چیزیں شامل ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کے لئے سجدہ و رکوع اور دست بستہ

قیام اور طواف اور آستانہ بوسی اور نذر ونیاز اور قربانی وغیرہ کے وہ مراسم ادا کئے جائیں جو بالعموم پرستش کی غرض سے ادا کئے جاتے ہیں قطع نظر اس سے کہ اسے مستقل بالذات معبود سمجھا جائے یا بڑے معبود کے ہاں تقرب اور سفارش کا ذریعہ سمجھ کر ایسا کیا جائے یا بڑے معبود کے ماتحت خدائی کے انتظام میں شریک سمجھتے ہوئے یہ حرکت کی جائے دوسرے یہ کہ کسی کو عالم اسباب پر ذی اقتدار خیال کر کے اپنی حاجتوں میں اس سے دعا مانگی جائے۔ اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں میں اس کو مدد کے لئے پکارا جائے۔ اور خطرات و نقصانات سے بچنے کے لئے اس سے پناہ مانگی جائے یہ دونوں قسم کے فعل قرآن کی رو سے یکساں پرستش کی تعریف میں آتے ہیں۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ (المؤمنین - ۷)

کہو، مجھے تو اس سے منع کر دیا گیا ہے کہ اپنے رب کی طرف سے صریح ہدایات پا لینے کے بعد میں ان کی پرستش کروں جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ .... فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ...

(ابراہیم نے کہا) میں تم کو اور اللہ کے ماسوا جنہیں تم پکارتے ہو ان سب کو چھوڑتا ہوں اور اپنے رب کو پکارتا ہوں... پس جب وہ ان سے اور اللہ کے سوا جن کی وہ عبادت کرتے تھے ان سب سے الگ ہو گیا تو ہم نے اسے اسحٰق جیسا بیٹا دیا....

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِیْنَ (احقاف - ۱)

اور اس سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر انہیں پکارے جو قیامت تک اسکی پکار کا جواب نہیں دے سکتے جنہیں خبر تک نہیں کہ ان کو پکارا جا رہا ہے اور جو روز حشر میں (جبکہ سب لوگ جمع کئے جائینگے) اپنے ان پکارنے والوں کے دشمن ہونگے اور ان کی عبادت

کا انکار کریں گے۔[1]

تینوں آیتوں میں قرآن نے خود ہی تصریح کر دی ہے کہ یہاں عبادت سے مراد دعا مانگنا اور مدد کے لئے پکارنا ہے۔

بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُونَ (سبا-۵)

بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے، اور ان میں سے اکثر ان پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

یہاں جنوں کی عبادت اور ان پر ایمان لانے سے جو کچھ مراد ہے۔ اس کی تشریح سورۂ جن کی یہ آیت کرتی ہے۔

وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (رکوع-۱)

اور یہ کہ انسانوں میں سے بعض اشخاص جنوں میں سے بعض اشخاص کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنوں کی عبادت سے مراد ان کی پناہ ڈھونڈنا اور خطرات و نقصانات کے مقابلہ میں ان سے حفاظت طلب کرنا ہے اور ان پر ایمان لانے سے مراد ان کے متعلق یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ وہ پناہ دینے اور حفاظت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَقُولُ أَأَنْتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ؟ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ (الفرقان-۲)

جس روز اللہ ان کو اور ان کے ان معبودوں کو جمع کرے گا جنکی یہ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں تو وہ ان سے پوچھے گا کہ میرے ان بندوں کو تم نے بہکایا تھا یا خود راہ راست سے بہک گئے؟ وہ عرض کرینگے کہ سبحان اللہ، ہم کو کب یہ زیبا تھا کہ حضور کو چھوڑ کر ہم کسی کو ولی و مددگار بنائیں۔

یہاں انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معبودوں سے مراد اولیاء، انبیاء، اور صلحاء ہیں اور

---

[1] یعنی صاف کہیں گے کہ نہ ہم نے ان سے کہا کہ ہماری عبادت کرو اور نہ ہمیں اس کی کبھی خبر ہوئی کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

ان کی عبادت سے مراد اُن کو بندگی کی صفات سے بالاتر اور خدا کی صفات سے متصف سمجھنا، ان کو غیبی امداد اور مشکل کشائی و فریاد رسی پر قادر خیال کرنا، اور ان کے لئے تعظیم کے وہ مراسم ادا کرنا ہے جو پرستش کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ أَهٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ (سبا۔۵)

جس روز اللہ ان سب کو اکٹھا کریگا پھر فرشتوں سے پوچھیگا کیا وہ تم ہو جنکی یہ لوگ عبادت کرتے تھے؟ تو وہ کہینگے سبحان اللہ! ہمیں ان سے کیا تعلق، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے

یہاں فرشتوں کی عبادت سے مراد ان کی پرستش ہے جو انکے استھان اور ہیکل اور خیالی مجسمے بنا کر کی جاتی تھی اور اس پوجا سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ ان کو خوش کر کے ان کی نظرِ عنایت اپنے حال پر مبذول کرائی جائے اور اپنے دنیوی معاملات میں ان سے مدد حاصل کی جائے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس۔۲)

وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهٖٓ أَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر۔۱)

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی بنا رکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔

یہاں بھی عبادت سے مراد پرستش ہے اور اُس غرض کی بھی تشریح کر دی گئی ہے جس کے لئے یہ پرستش کی جاتی تھی۔

عبادت بمعنی بندگی و اطاعت و پرستش ان مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں عبادت کا لفظ کہیں غلامی و اطاعت کے معنی میں استعمال ہُوا ہے کہیں مجرد اطاعت کے معنی میں اور کہیں پرستش کے معنی

ہیں۔ اب قبل اس کے کہ ہم وہ مثالیں پیش کریں جن میں لفظ عبادت ان تینوں مفہومات کا جامع ہے، ایک مقدمہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

اوپر جتنی مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سب میں اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کا ذکر ہے۔ جہاں عبادت سے مراد غلامی و اطاعت ہے وہاں معبود یا تو شیطان ہے، یا وہ باغی انسان ہیں جنہوں نے طاغوت بن کر خدا کے بندوں سے خدا کے بجائے اپنی بندگی و اطاعت کرائی، یا وہ رہنما و پیشوا ہیں جنہوں نے کتاب اللہ سے بے نیاز ہو کر اپنے خود ساختہ طریقوں پر لوگوں کو چلایا۔ اور جہاں عبادت سے مراد پرستش ہے وہاں معبود یا تو انبیاء اولیاء اور صلحاء ہیں جنہیں ان کی تعلیم و ہدایت کے خلاف معبود بنا لیا گیا، یا فرشتے اور جن ہیں جن کو محض غلط فہمی کی بنا پر فوق الطبعی ربوبیت میں شریک سمجھ لیا گیا، یا خیالی طاقتوں کے بت اور تماثیل ہیں جو محض شیطانی اغوا سے مرکز پرستش بن گئے، قرآن ان تمام اقسام کے معبودوں کو باطل اور انکی عبادت کو غلط ٹھیراتا ہے۔ خواہ ان کی غلامی کی گئی ہو یا اطاعت یا پرستش۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارے یہ سب معبود جن کی تم عبادت کر رہے ہو اللہ کے بندے اور غلام ہیں، نہ انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ان کی عبادت کی جائے اور نہ انکی عبادت سے بجز نامرادی اور ذلت و رسوائی کے تم کو کچھ حاصل ہو سکتا ہے، حقیقت میں ان کا اور ساری کائنات کا مالک اللہ ہی ہے اسکے ہاتھ میں تمام اختیارات ہیں، لہذا عبادت کا مستحق اکیلے اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ..... وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ (اعراف - ۲۴)	اللہ کو چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم خود بندے ہو انہیں پکار کر دیکھ لو، اگر تمہارا اعتقاد ان کے بارے میں صحیح ہے تو وہ تمہاری پکار کا جواب دیں..... اللہ کے ماسوا جنہیں تم پکارتے ہو وہ نہ تمہاری کوئی مدد کر سکتے ہیں نہ خود اپنی مدد پر قادر ہیں۔
وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ	یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، وہ بالاتر

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ‌، لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ‌، يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (انبیاء ۲۰)

ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ جنہیں یہ اس کی اولاد کہتے ہیں وہ دراصل اس کے بندے ہیں جن کو عزت دی گئی ہے ان کی اتنی مجال نہیں کہ خود سبقت کر کے اللہ کے حضور کچھ عرض کرسکیں بلکہ جیسا وہ حکم دیتا ہے اسی کے مطابق وہ عمل کرتے ہیں جو کچھ وہ جانتے ہیں اسے بھی اللہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے پوشیدہ ہے اس کی بھی اللہ کو خبر ہے وہ اللہ کے حضور کسی کی سفارش نہیں کرسکتے بجز اسکے جس کی سفارش خود اللہ ہی قبول کرنا چاہے اور انکا حال یہ ہے کہ اللہ کے خوف سے سہمے رہتے ہیں۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (زخرف ۲۰)

ان لوگوں نے فرشتوں کو جو دراصل رحمٰن کے بندے ہیں دیویاں بنا رکھا ہے۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ (صٰفٰت ۵)

انہوں نے جنوں کے اور خدا کے درمیان نسبی رشتہ فرض کرلیا ہے حالانکہ جن خود بھی جانتے ہیں کہ ایک روز انہیں حساب کے لئے اس کے حضور پیش ہونا ہے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (النساء ۲۴)

نہ مسیح نے کبھی اس کو اپنے لئے عار سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں نے۔ اور جو کوئی اسکی بندگی و غلامی میں عار سمجھے اور تکبر کرے (وہ بھاگ کر جا کہاں سکتا ہے) ایسے سب لوگوں کو اللہ اپنے حضور کھینچ بلائے گا۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ، وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (الرحمٰن ۱)

سورج اور چاند سب گردش میں لگے ہیں اور تارے اور درخت سب خدا کے آگے سر اطاعت جھکائے ہوئے ہیں۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ

ساتوں آسمان اور زمین اور جس قدر موجودات آسمان و زمین میں ہیں سب کے سب اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں، کوئی چیز ایسی نہیں

وَلٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ (بنی اسرائیل-۵) | جو حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔

وَلَهُ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ (الروم-۳) | آسمانوں اور زمین کی کُل موجودات اس کی ملک ہے اور ساری چیزیں اس کے فرمان کی تابع ہیں۔

مَا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا (ہود-۵) | کوئی جاندار ایسا نہیں جو اللہ کے قبضۂ قدرت میں جکڑا ہُوا نہ ہو۔

إِن كُلُّ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا لَقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا (مریم-۶) | زمین اور آسمانوں کے باشندوں میں سے کوئی ایسا نہیں جو رحمٰن کے سامنے غلام کی حیثیت سے پیش ہونے والا نہ ہو اس نے سب کا شمار کر رکھا ہے۔ اور قیامت کے روز سب اُس کے حضور فرداً فرداً پیش ہوں گے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آل عمران-۳) | کہو، خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اسطرح اُن سب کو جن کی عبادت کسی شکل میں کی گئی ہے، اللہ کا غلام اور بے اختیار ثابت کر دینے کے بعد قرآن تمام جن و انس سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہر مفہوم کے لحاظ سے عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیئے۔ غلامی ہو تو اسکی، اطاعت ہو تو اسکی، پرستش ہو تو اسکی، ان میں سے کسی نوع کی عبادت کا بھی شائبہ تک غیر اللہ کیلئے نہ ہو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (النحل-۵) | ہم نے ہر قوم میں ایک رسول یہی پیغام دیکر بھیجا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے پرہیز کرو۔

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى (الزمر-۲)

خوشخبری ہے انکے لئے جنہوں نے طاغوت کی عبادت سے پرہیز کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (یٰس-۴)

اے بنی آدم! کیا میں نے تم کو تاکید نہ کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور میری عبادت کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے۔

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا (التوبہ-۵)

انہوں نے اللہ کے بجائے اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیا..... حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ ایک الٰہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (البقرہ-۲۱)

اے ایمان لانے والو! اگر تم نے واقعی ہماری ہی عبادت اختیار کی ہے تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔

ان آیات میں اللہ کیلئے اُس عبادت کو مخصوص کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو بندگی و غلامی اور اطاعت و فرمانبرداری کے معنی میں ہے اور اس کے لئے صاف قرینہ موجود ہے کہ طاغوت اور شیطان اور احبار و رہبان اور آباؤ اجداد کی اطاعت و بندگی سے پرہیز کر کے اللہ کی اطاعت و بندگی اختیار کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (المومن-۷)

کہو مجھے اس سے منع کیا گیا ہے کہ میں اپنے رب کی طرف سے واضح ہدایات پالینے کے بعد ان کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ کے بجائے پکارتے ہو، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العٰلمین کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (المؤمن - ۶)

اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا، اور جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ یقیناً جہنم میں جھونکے جائیں گے۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ (فاطر - ۲)

وہی اللہ تمہارا رب ہے، پادشاہی اسی کی ہے اسکے سوا تم جن کو پکارتے ہو انکے اختیار میں ذرہ برابر کچھ نہیں، تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار سن نہیں سکتے اور سن بھی لیں تو جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے روز وہ تمہارے اس شرک کا انکار کرینگے۔

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (المائدہ - ۱۰)

کہو کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں نہ نفع پہنچانے کی؟ سب کچھ سننے اور جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔

ان آیات میں اس عبادت کو اللہ کے لئے مختص کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو پرستش کے معنی میں ہے، اور اس کے لئے بھی صاف قرینہ موجود ہے کہ عبادت کو دعا کے مترادف کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے۔ اور ماقبل ومابعد کی آیات میں ان معبودوں کا ذکر پایا جاتا ہے جنہیں فوق الطبعی ربوبیت میں اللہ کا شریک قرار دیا جاتا تھا۔

اب کسی صاحب بصیرت آدمی کے لئے یہ سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں کہ جہاں جہاں قرآن میں اللہ کی عبادت کا ذکر ہے اور آس پاس کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں ہے جو لفظ عبادت کو اسکے مختلف مفہومات میں سے کسی ایک مفہوم کیلئے خاص کرتا ہو، ایسے تمام مقامات میں عبادت سے مراد غلامی، اطاعت اور پرستش تینوں مفہوم ہوں گے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات کو دیکھیے۔

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي (طٰہٰ - ۱)

میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی الٰہ نہیں لہٰذا تو میری ہی عبادت کر۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ (الانعام - ۱۳)

وہی اللہ تمہارا رب ہے اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر شے کی خبر گیری کا متکفل ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (یونس - ۱۱)

کہو کہ لوگو! اگر تمہیں ابھی تک تحقیق معلوم نہیں ہے کہ میرا دین کیا ہے تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں شامل ہو جاؤں۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (یوسف - ۵)

اللہ کے ماسوا جن کی تم عبادت کرتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کے لئے کوئی دلیل معبودیت نازل نہیں کی ہے، "اقتدار صرف اللہ کے لئے خاص ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، یہی سیدھا طریقہ ہے۔

وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود - ۱۰)

آسمانوں اور زمین کی جسقدر حقیقتیں بندوں سے پوشیدہ ہیں ان کا علم اللہ ہی کو ہے اور سارے معاملات اسی کی سرکار میں پیش ہوتے ہیں، لہٰذا تو اسی کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ رکھ۔

لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ

جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہم سے پوشیدہ ہے

ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۚ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (مریم - ۴)

اور جو کچھ ان دونوں حالتوں کے درمیان ہے، سب کا مالک وہی ہے، اور تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے، وہ مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں۔ لہٰذا تو اسی کی عبادت پر ثابت قدم رہ۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (کہف - ۱۲)

پس جو اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کی عبادت شریک نہ کرے۔

کوئی وجہ نہیں کہ ان آیات اور ایسی ہی دوسری تمام آیات میں عبادت کے لفظ کو محض پرستش یا محض بندگی و اطاعت کیلئے مخصوص ٹھیرا لیا جائے۔ اس طرح کی آیات میں دراصل قرآن اپنی پوری دعوت کو پیش کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن کی دعوت یہی ہے کہ بندگی، اطاعت، پرستش جو کچھ بھی ہو اللہ کی ہو لہٰذا ان مقامات پر عبادت کے معنی کو کسی ایک مفہوم میں محدود کرنا حقیقت میں قرآن کی دعوت کو محدود کرنا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کی دعوت کا ایک محدود تصور لے کر ایمان لائیں گے وہ اس کی ناقص و ناتمام پیروی کریں گے۔

دِین

لغوی تحقیق | کلامِ عرب میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) غلبہ و اقتدار، حکمرانی و فرمانروائی، دوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اس پر اپنی قوت قاہرہ (Sovereignty) استعمال کرنا، اس کو اپنا غلام اور تابع امر بنانا مثلاً کہتے ہیں دان الناس، ای قھرھم علی الطاعۃ (یعنی لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا) دِنتھم فدانوا، ای قھرتھم فاطاعوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کیا اور وہ مطیع ہو گئے) دنتُ القوم، ای اذللتھم واستعبدتھم (یعنی میں نے اس قوم کو مسخر کیا اور غلام بنا لیا) دان الرجل اذا عزّ (فلاں شخص عزت اور طاقت والا ہو گیا) دنتُ الرجل حملتہ علی ما یکرہُ (میں نے اس کو ایسے کام پر مجبور کیا جس کے لئے وہ راضی نہ تھا) دین فلان، اذا حمل علی مکروہ (فلاں شخص اس کام کیلئے بزور مجبور کیا گیا) دنتہ، ای سُستُہٗ وملکتہ (یعنی میں نے اس پر حکم چلایا اور فرمانروائی کی) دیّنتہ القوم، ولیتہ سیاستھم (یعنی میں نے قوم کی سیاست وحکمرانی فلاں شخص کو دی) اسی معنی میں حطیئہ اپنی ماں کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

لقد دُیِّنتِ امرَ بنیکِ حتی ترکتِھم ادقّ من الطحین

(تو اپنے بچوں کے معاملات کی نگراں بنائی گئی تھی۔ آخر کار تو نے انہیں آٹے سے بھی زیادہ باریک کر کے چھوڑا)

حدیث میں آتا ہے الکیّس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت یعنی عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مغلوب کر لیا اور وہ کام کیا جو اس کی آخرت کیلئے نافع ہو۔ اسی معنی کے لحاظ سے دیّان اُس کو کہتے ہیں۔ جو کسی ملک یا قوم یا قبیلہ پر غالب و قاہر ہو اور اس پر فرمانروائی کرے، چنانچہ اعشیٰ الحرمازی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہتا ہے یا سید الناس ودیّان العرب اور اسی لحاظ سے مدین کے معنی غلام اور مدینہ کے

ابن الامۃ اور ابن مدینہ کے معنی لونڈی زادہ کے آتے ہیں جیسے اخطل کہتا ہے "ربت وربانی حجرھا ابن مدینۃ" اور قرآن میں ہے فَلَوْلَا اِنْ کُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ تَرْجِعُوْنَهَا اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ یعنی اگر تم کسی کے مملوک، تابع یا تحت نہیں ہو تو مرنے والے کو موت سے بچا کیوں نہیں لیتے۔ جان کو واپس کیوں نہیں پلٹا لاتے؟

(۲) اطاعت، بندگی، خدمت کسی کے لئے مسخر ہو جانا کسی کے تحت امر ہونا کسی کے غلبہ و قہر سے دب کر اسکے مقابلہ میں ذلت قبول کر لینا چنانچہ کہتے ہیں دنتھم فدانوا، ای قھرتھم فاطاعوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کر لیا اور وہ لوگ مطیع ہو گئے) دنت الرجل، ای خدمتہ (یعنی میں نے فلاں شخص کی خدمت کی) حدیث میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا ارید من قریش کلمۃ تدین لھم بھا العرب۔ ای تطیعھم وتخضع لھم (یعنی میں قریش کو ایک ایسے کلمہ کا پیرو بنانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اُسے مان لے تو تمام عرب اس کا تابع فرمان بن جائے اور اسکے آگے جھک جائے) اسی معنی کے لحاظ سے اطاعت شعار قوم کو قوم دین کہتے ہیں اور اسی معنی میں دین کا لفظ حدیث خوارج میں استعمال کیا گیا ہے یمرقون من الدین مروق السھم من الرمیۃ[1]

(۳) شریعت، قانون، طریقہ، کیش و ملت، رسم و عادت، مثلاً کہتے ہیں مازال ذالک دینی ودیدنی یعنی یہ ہمیشہ سے میرا طریقہ رہا ہے یقال دان اذا اعتاد خیراً او شراً یعنی آدمی خواہ برے طریقہ کا پابند ہو یا بھلے طریقہ کا، دونوں صورتوں میں اُس طریقہ کو جس کا وہ پابند ہے دین کہینگے۔ حدیث میں ہے کانت قریش ومن دان بدینھم "قریش اور وہ لوگ جو ان کے مسلک کے پیرو تھے" اور حدیث میں ہے انہ علیہ السلام کان علی

---

[1] اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خوارج دین یعنی ملت سے نکل جائیںگے کیونکہ حضرت علیؓ سے جب ان کے متعلق پوچھا گیا اکفار ھم کیا یہ لوگ کافر ہیں؟ تو آپ نے فرمایا من الکفر فروا (کفر ہی سے تو وہ بھاگے ہیں) پھر پوچھا گیا افمنافقون ھم کیا یہ منافق ہیں؟ آپ نے فرمایا منافق تو خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں اور ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ شب و روز اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں اسی بنا پر یہ متعین ہوتا ہے کہ اس حدیث میں دین سے مراد اطاعت امام ہے، چنانچہ ابن اثیر نے نہایہ میں اس کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔ اراد بالدین الطاعۃ، ای انھم یخرجون من طاعۃ الامام المفترض الطاعۃ وینسلخون منھا (جلد ۲، صفحہ ۱۴۲)

دین تو مطہ" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے اپنی قوم کے دین پر تھے" یعنی نکاح، طلاق، میراث، اور دوسرے تمدنی و معاشرتی امور میں انہی قاعدوں اور ضابطوں کے پابند تھے جو آپ کی قوم میں رائج تھے۔

(۴) جزائے عمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ، چنانچہ عربی میں مثل ہے کما تدین تدان، یعنی جیسا تو کرے گا ویسا بھرے گا۔ قرآن میں کفار کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہے ءَ اِنَّا لَمَدِیۡنُوۡنَ "کیا مرنے کے بعد ہم سے حساب لیا جانے والا ہے اور ہمیں بدلہ ملنے والا ہے" عبداللہ ابن عمرو کی حدیث میں آتا ہے لا تسبوا السلطان فان کان لابد فقولوا اللھم دنھم کما یدینونا "اپنے حکمرانوں کو برا نہ کہو اور اگر کہنا ناگزیر ہو تو یوں کہو کہ خدایا جیسا یہ ہمارے ساتھ کر رہے ہیں ویسا ہی تو اُن کے ساتھ کر" اسی معنی میں لفظ دیّان بمعنی قاضی و حاکم عدالت آتا ہے، چنانچہ کسی بزرگ سے جب حضرت علی کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کان دیان ھذہ الامۃ بعد نبیھا یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اس اُمت کے سب سے بڑے قاضی تھے۔

قرآن میں لفظ دین کا استعمال | ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظِ دین کی بنیاد میں چار تصورات ہیں، یا بالفاظ دیگر یہ لفظِ عربی ذہن میں چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے!

غلبہ و تسلط، کسی ذی اقتدار کی طرف سے،

اطاعت، تعبد اور بندگی صاحبِ اقتدار کے آگے جھک جانے والے کی طرف سے،

قاعدہ و ضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے۔

محاسبہ اور فیصلہ اور جزا و سزا۔

انہی تصورات میں سے کبھی ایک کے لئے اور کبھی دوسرے کے لئے اہل عرب مختلف طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے مگر چونکہ ان چاروں امور کے متعلق عرب کے تصورات پوری طرح صاف نہ تھے اور کچھ بہت بلند بھی نہ تھے اس لئے اس لفظ کے استعمال میں ابہام پایا جاتا تھا اور کسی باقاعدہ نظامِ فکر کا اصطلاحی لفظ نہ بن سکا تھا قرآن آیا تو اُس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے لئے مناسب پا کر بالکل واضح و متعین مفہومات کیلئے استعمال کیا اور

اسکو اپنی مخصوص اصطلاح بنالیا۔ قرآنی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے جسکی ترکیب چار
اجزا سے ہوتی ہے۔

حاکمیت و اقتدار اعلےٰ ،

حاکمیت کے مقابلہ میں تسلیم و اطاعت۔

وہ نظام فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیر اثر بنے۔

مکافات جو اقتدار اعلےٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری و اطاعت یا سرکشی و بغاوت کے صلہ میں دیجائے
قرآن کبھی لفظ دین کا اطلاق معنی اول و دوم پر کرتا ہے، کبھی معنی سوم پر کبھی معنی چہارم پر، اور کہیں الدین
بولکر یہ پورا نظام اپنے چاروں اجزا سمیت مراد لیتا ہے اس کی وضاحت کے لئے حسب ذیل آیات قرآنی ملاحظہ ہوں

دین بمعنی اول و دوم

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ
الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ
صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ
فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ (المومن - ۷)

وہ اللہ جس نے تمہارے لئے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس پر آسمان
کا قبہ چھایا جس نے تمہاری صورتیں بنائیں اور خوب ہی صورتیں بنائیں
جس نے پاکیزہ چیزوں سے تم کو رزق بہم پہنچایا، وہی اللہ تمہارا رب
ہے اور بڑی برکتوں والا ہے وہ رب العالمین۔ وہی زندہ ہے
اسکے سوا کوئی الہ نہیں، لہٰذا تم اسی کو پکارو دین کو اسی کے
لئے خالص کرکے۔ تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے۔

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ
الدِّيْنَ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ
.... قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ فَاعْبُدُوْا
مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ .... وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا
الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ

کہو مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کیلئے خالص کرکے اسی
کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود
سر اطاعت جھکاؤں ..... کہو میں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے
خالص کرکے صرف اسی کی بندگی کروں گا تم کو اختیار ہے اسکے
سوا جسکی چاہو بندگی اختیار کرتے پھرو..... اور جو لوگ طاغوت

الْبُشْرٰی (الزمر - ۲) کی بندگی کرنے سے پرہیز کریں اور اللہ ہی کی طرف رجوع کر لیا ان کے لئے خوشخبری ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ، اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ۔ (الزمر - ۱)

ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کر دی ہے لہٰذا تم دین کو اللہ کیلئے خالص کر کے صرف اسی کی بندگی کرو۔ خبردار رہو کہ دین خالصتہً اللہ ہی کے لئے ہے۔

وَلَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَہُ الدِّیْنُ وَاصِبًا، اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَتَّقُوْنَ ۔ النحل - ۷

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور دین خالصًا اسی کیلئے ہے۔ پھر کیا اللہ کے سوا تم کسی اور سے تقویٰ کرو گے؟ (یعنی کیا اللہ کے سوا کوئی اور ہے جسکے حکم کی خلاف ورزی سے تم بچو گے اور جسکی ناراضی سے تم ڈرو گے؟)

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ (آل عمران - ۹)

کیا یہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کا دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی مطیع فرمان ہیں اور اسی کی طرف ان کو پلٹ کر جانا ہے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ (البینہ)

اور ان کو اسکے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ یکسو ہو کر دین کو اللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے صرف اسکی بندگی کریں۔

ان تمام آیات میں دین کا لفظ اقتدار اعلیٰ اور اس اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت و بندگی قبول کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کیلئے دین کو خالص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حاکمیت، فرمانروائی، حکمرانی اللہ کے سوا کسی کی تسلیم نہ کرے اور اپنی اطاعت و بندگی کو اللہ کیلئے اس طرح خالص کر دے کہ کسی دوسرے کی مستقل بالذات بندگی و اطاعت اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک نہ کرے[1]۔

---

[1] یعنی اللہ کے سوا جس کی اطاعت بھی ہو اللہ کی اطاعت کے تحت اور اسکی مقررہ حدود کے اندر ہو۔ بیٹے کا باپ کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، غلام یا نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا اور اسی نوع کی دوسری تمام اطاعتیں اگر اللہ کے حکم سے ہوں اور ان حدود کے اندر ہوں جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں تو یہ عین اطاعت الٰہی ہیں اور اس سے باقی صلہ

دین بمعنی سوم

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ۚ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (یونس-۱۱)

کہو کہ اے لوگو! اگر تم کو میرے دین کے بارے میں کچھ شک ہے (یعنی اگر تم کو صاف معلوم نہیں ہے کہ میرا دین کیا ہے) تو لو سنو میں اُن کی بندگی و عبادت نہیں کرتا جن کی بندگی و عبادت تم اللہ کو چھوڑ کر کر رہے ہو بلکہ میں اس اللہ کی بندگی کرتا ہوں جو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اُن لوگوں میں شامل ہو جاؤں جو اسی اللہ کو ماننے والے ہیں اور یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ تو یکسو ہو کر اسی دین پر اپنے آپ کو قائم کر دے اور شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (یوسف-۵)

حکمرانی اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم اسکے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیک صحیح دین ہے۔

وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ..... ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِیْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِیْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ..... بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ..... فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے سب اسی کے مطیع فرمان ہیں..... وہ تمہیں سمجھانے کے لئے خود تمہارے اپنے معاملے سے ایک مثال پیش کرتا ہے۔ بتاؤ، یہ غلام جو تمہارے مملوک ہیں کیا ان میں سے کوئی اُن چیزوں میں جو ہم نے تمہیں دی ہیں۔ تمہارا شریک ہے؟ کیا تم انہیں اس مال کی ملکیت میں اپنے برابر کا حصہ دار بناتے ہو؟ کیا تم اُن سے اپنے ہم چشموں کی طرح ..... [illegible] سچی بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ علم کے بغیر محض اپنے تخیلات کے پیچھے چلے جا رہے ہیں... پس تم یکسو ہو کر اپنے آپ کو اس

آزاد ہوں، یا بالفاظ دیگر بجائے خود مستقل طاقتیں ہوں تو یہی عین بغاوت ہے۔ حکومت اگر اللہ کے قانون پر مبنی ہے اور اس کا حکم جاری کرتی ہے تو اس کی اطاعت فرض ہے۔ اور اگر ایسی نہیں ہے تو اس کی اطاعت حرام۔

لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم - ۴)

دین پر قائم کر دو۔ اللہ نے جس فطرت پر انسانوں کو پیدا کیا ہے اسی کو اختیار کرو۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت[1] کو بدلا نہ جائے، یہی ٹھیک ٹھیک صحیح دین ہے مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (النور - ۱)

زانی اور زانیہ دونوں کو سو سو کوڑے مارو اور اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو ان پر رحم نہ آنا چاہیئے۔

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (التوبہ - ۵)

اللہ کے فرشتے میں تو اس وقت سے مہینوں کی تعداد ۱۲ ہی چلی آتی ہے جب سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ ان بارہ مہینوں میں سے ۴ مہینے حرام ہیں۔ یہی ٹھیک ٹھیک صحیح دین ہے۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (یوسف - ۹)

اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر نکالی، اس کے لئے جائز نہ تھا کہ اس بادشاہ کے دین میں اپنے بھائی کو پکڑتا۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ (انعام - ۱۶)

اور اسی طرح بہت سے مشرکین کیلئے ان کے ٹھیرائے ہوئے شرکوں[2] نے اپنی اولاد کے قتل کو ایک خوش آئند فعل بنا دیا تاکہ انہیں ہلاکت میں ڈالیں اور ان کے لئے ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں[3]۔

---

[1] یعنی اللہ نے جس ساخت پر انسان کو پیدا کیا ہے وہ تو یہی ہے کہ انسان کی تخلیق میں، اس کی رزق رسانی میں، اس کی ربوبیت میں خود اللہ کے سوا کوئی دوسرا شریک نہیں ہے نہ اللہ کے سوا کوئی اس کا خدا ہے نہ مالک اور نہ مطاع حقیقی پس خالص فطری طریقہ یہی ہے کہ آدمی بس اللہ کا بندہ ہو اور کسی کا بندہ نہ ہو۔

[2] شریک سے مراد ہے خداوندی و فرمانروائی میں اور قانون بنانے میں خدا کا شریک (باقی اگلے صفحہ پر)

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ﴿الشوریٰ - ۳﴾	کیا انہوں نے کچھ شریک ٹھیرا رکھے ہیں جو انکے لئے دین کی قسم سے ایسے قوانین بناتے ہیں جنکا اللہ نے اذن نہیں دیا ہے
لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴿الکافرون﴾	تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین۔

ان سب آیات میں دین سے مراد قانون، ضابطہ، شریعت، طریقہ اور وہ نظام فکر و عمل ہے جس کی پابندی میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ اقتدار جس کی سند پر کسی ضابطہ و نظام کی پابندی کی جاتی ہے خدا کا اقتدار ہے تو آدمی دینِ خدا میں ہے اگر وہ کسی بادشاہ کا اقتدار ہے تو آدمی دینِ بادشاہ میں ہے، اگر وہ پنڈتوں اور پروہتوں کا اقتدار ہے تو آدمی انہی کے دین میں ہے اور وہ خاندان برادری یا جمہور قوم کا اقتدار ہے تو آدمی ان کے دین میں ہے۔ غرض جس کی سند کو آخری سند اور جسکے فیصلہ کو منتہائے کلام مان کر آدمی کسی طریقے پر چلتا ہے اسی کے دین کا وہ پیرو ہے۔

دین بمعنی چہارم

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ﴿الذاریات - ۱﴾	وہ خبر جس سے تمہیں آگاہ کیا جا رہا ہے (یعنی زندگی بعد موت) یقیناً سچی ہے اور دین یقیناً ہونے والا ہے۔
اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿الماعون﴾	تم نے دیکھا اس شخص کو جو دین کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکساتا۔
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ، يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَّالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿الانفطار﴾	تمہیں کیا خبر کہ یوم الدین کیا ہے ہاں تم کیا جانو کیا چیز ہے یوم الدین وہ دن وہ ہے جبکہ کسی متنفس کے اختیار میں کچھ نہ ہوگا کہ دوسرے کے کام آسکے اس روز سب اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہوگا

(حاشیہ صفحہ سابق) ؎ دین کو مشتبہ بنانے سے مطلب یہ ہے کہ یہ جھوٹے شریعت ساز اس گناہ کو ایسا خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں جس سے عرب کے لوگ اس شبہ میں پڑ گئے کہ شاید یہ فعل بھی اسی دین کا ایک جزو ہے جو انکو ابتداءً حضرت ابراہیم و اسمٰعیل سے ملا تھا

ان آیات میں دین بمعنی محاسبہ و فیصلہ و جزائے اعمال استعمال ہوا ہے۔

دین ایک جامع اصطلاح یہاں تک تو قرآن اس لفظ کو قریب قریب انہی مفہومات میں استعمال کرتا ہے جن میں یہ اہل عرب کی بول چال میں مستعمل تھا لیکن اسکے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس لفظ کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے مراد ایک ایسا نظام زندگی لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اسکی اطاعت و فرمانبرداری قبول کرے، اسکے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے اس کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو، اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے لیکن ابھی اس کو "دین" کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لئے مزید وسعت درکار ہے۔

حسب ذیل آیات میں "دین" اسی اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (توبہ - ۴)

اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ اللہ کو مانتے ہیں (یعنی اس کو واحد مقتدر اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے) نہ یوم آخر (یعنی یوم الحساب یا یوم الجزاء) کو مانتے ہیں، نہ ان چیزوں کو حرام مانتے ہیں جنہیں اللہ اور اسکے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے، ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔ اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت میں "دین حق" اصطلاحی لفظ ہے جس کے مفہوم کی تشریح [illegible] ابتدائی فقروں میں خود ہی کر دی ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَ

فرعون نے کہا چھوڑو مجھے میں اس موسیٰ کو قتل ہی کئے دیتا

لِيَدْعُ رَبَّهُ ۚ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ (المؤمن-۳)

اور اب پکارے وہ اپنے رب کو، مجھے خوف ہے کہ وہ کہیں تمہارا دین نہ بدل دے یا زمین میں فساد کھڑا کردے۔

قرآن میں قصۂ فرعون و موسیٰ کی جتنی تفصیلات آئی ہیں ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین محض "مذہب" کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ "اسٹیٹ" کا ہم معنی ہے۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر موسیٰ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا، جو نظامِ زندگی اس وقت فراعنہ کی حاکمیت اور رائج الوقت قوانین و رسوم کی بنیادوں پر چل رہا ہے وہ جڑ سے اکھڑ جائیگا اور اس کی جگہ یا تو دوسرا نظام بالکل دوسری ہی بنیادوں پر قائم ہوگا یا نہیں تو سرے سے کوئی نظام قائم ہی نہ ہو سکے گا بلکہ تمام ملک میں بدنظمی پھیل جائے گی۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران-۲)

اللہ کے نزدیک دین تو دراصل "اسلام" ہی ہے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران-۹)

اور جو "اسلام" کے سوا کوئی اور دین تلاش کریگا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (التوبہ-۵)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو صحیح رہنمائی اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کردے اگرچہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (الانفال-۵)

اور تم ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (النصر)

جب اللہ کی نصرت آگئی اور فتح نصیب ہو چکی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اب اپنے رب کی حمد و ثنا اور اسکی تسبیح کرو اور اس سے درگزر کی

درخواست کرو، وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔

ان سب آیات میں دین سے پورا نظامِ زندگی اپنے تمام اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مراد ہے۔ پہلی دو آیتوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کیلئے صحیح نظامِ زندگی صرف وہ ہے جو خود اللہ ہی کی اطاعت و بندگی (اسلام) پر مبنی ہو۔ اسکے سوا کوئی دوسرا نظام جس کی بنیاد کسی دوسرے مفروضہ اقتدار کی اطاعت پر ہو مالک کائنات کے ہاں ہرگز مقبول نہیں ہے اور فطرۃً نہیں ہو سکتا اسلئے کہ انسان جسکا مخلوق مملوک اور پروردہ ہے اور جسکے ملک میں رعیت کی حیثیت سے رہتا ہے وہ تو کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ انسان خود اسکے سوا کسی دوسرے اقتدار کی بندگی و اطاعت میں زندگی گزارنے اور کسی دوسرے کی ہدایات پر چلنے کا حق رکھتا ہے۔ تیسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اسی صحیح و برحق نظامِ زندگی یعنی اسلام کے ساتھ بھیجا ہے اور اسکے مشن کی غایت یہ ہے کہ اس نظام کو تمام دوسرے نظاموں پر غالب کرکے رہے۔ چوتھی آیت میں دین اسلام کے پیروؤں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو اور اس وقت تک دم نہ لو جب تک کہ فتنہ یعنی اُن نظامات کا وجود دنیا سے مٹ نہ جائے جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے اور پورا نظامِ اطاعت و بندگی اللہ کیلئے خالص نہ ہو جائے۔ پانچویں آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقع پر خطاب کیا گیا ہے جبکہ ۲۳ سال کی مسلسل جدوجہد سے عرب میں انقلاب کی تکمیل ہو چکی تھی اسلام اپنی پوری تفصیلی صورت میں ایک اعتقادی و فکری، اخلاقی و تعلیمی، تمدنی و معاشرتی اور معاشی و سیاسی نظام کی حیثیت سے عملاً قائم ہو گیا تھا۔ اور عرب کے مختلف گوشوں سے فوج در فوج آ کر اس نظام کے دائرے میں داخل ہونے لگے تھے اسطرح جب وہ کام تکمیل کو پہنچ گیا جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مامور کیا گیا تھا تو آپ سے ارشاد ہوتا ہے کہ اس کارنامے کو اپنا کارنامہ سمجھ کر کہیں فخر نہ کرنے لگنا نقص سے پاک بے عیب ذات اور کامل ذات صرف تمہارے رب ہی کی ہے لہٰذا اس کارِ عظیم کی انجام دہی پر اسکی تسبیح اور حمد و ثنا کرو اور اس سے درخواست کرو کہ مالک! اس ۲۳ سال کے زمانۂ خدمت میں اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے میں جو خامیاں اور جو کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہو گئی ہوں۔ انہیں معاف فرما دے۔

علمائے کرام کا مستقبل — علما کو کیا کرنا چاہئے اور وہ کیا کر رہے ہیں ۸ر
از
مولانا محمد مظہر الدین صدیقی بی اے

اشتراکیت اور اسلام — (ایک نقشہ مومنانہ) ” ” ” — ۸ر

انتخاب غالب — غالب مرحوم کا اپنا انتخاب — ۶ر

باغی مسلمان یا ہمارے ہندوستانی مسلمان — (سید صاحب بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے بالکل صحیح اور سبق آموز حالات۔ انگریزی سے اردو ترجمہ از ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ایل ایل ڈی آئی سی ایس بنگال) ۱۲ر

المنبہات — (عربی کی مشہور کتاب جو نصائح و حکم کا ایک نادر مجموعہ ہے اور عربی پڑھنے والے بچوں کیلئے بالخصوص طبع کی گئی ہے۔ شیخ ابن الحجر عسقلانی شارح بخاری شریف) صہ

اسلامی پارٹی کا آئین — (مسلمانوں کی تنظیم نو کن خطوط پر ہونی چاہیئے۔ از مولانا عزیز ہندی) عہ

ہیگل کا فلسفہ (فلسفہ اضداد کی تشریح) از مولانا عزیز ہندی — ۴ر

ہندوستانی مسلمان کا نصب العین کیا ہے — ” ” ” — ۴ر

القول الجمیل (عربی) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی — صہ

تقویۃ الایمان (اردو) حضرت شاہ اسمٰعیل شہید — عہ

جعفر منصور (خلیفہ جعفر منصور عباسی کے حالات) ابو القاسم رفیق دلاوری — مہ

سلسلہ مطبوعات اقبال اکیڈمی

شرح اسرار خودی

پروفیسر محمد یوسف خان سلیم چشتی بی۔اے کی

یہ تصنیف بے حد مقبول ہوئی ہے' اس کا دوسرا ایڈیشن حذف و اضافہ کے بعد نہایت خوبصورت اور عمدہ شکل میں طبع کیا گیا ہے' قیمت 1/8/-

تعلیمات اقبال

پروفیسر محمد یوسف خان سلیم چشتی' بی۔اے نے

ڈاکٹر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کی پیش کردہ تعلیمات کو انہی کے کلام سے اخذ کرکے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے' درحقیقت یہ کتاب علامہ کی تمام تصانیف کا نچوڑ ہے۔ قیمت 1/8/-

اقبال پر ایک نظر

علامہ اقبال کی شاعری اور ان کی شخصیت پر مختلف اہل علم نے تنقید کی ہے' ہم نے اس میں سے چند بلند پایہ مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے' اس میں مولانا ظفر علی خاں' جناب سالک اور مولانا عبد السلام ندوی ایسے ادباء کے مضامین ہیں' قیمت دو روپیہ بارہ آنے

اقبال کے چند جواہر ریزے

خواجہ عبدالحمید صاحب' ایم۔اے' پروفیسر فلسفہ'
گورنمنٹ کالج' لاہور نے

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی صحبت میں بیٹھکر جن ملفوظات کو سنا انہیں وہ گاہ بگاہ اپنی بیاض میں نوٹ فرماتے رہے' یہ کتاب انہی ذخائر بے بہا کا مجموعہ ہے۔ قیمت ۱۰ آنے

ہمارے ہندوستانی مسلمان

ولیم ہنٹر آئی سی ایس نے

ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے عہد میں مسلمانوں کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اور مسلمانوں کی اسلامی ذہنیت اور اس کے تبدیل کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہیں' یہ تاریخی کتاب مسلمانوں کی سیاسی کیفیت اور ان کی تحریکہائے آزادی کا ایک مرقع ہے' ضمناً وہابی تحریک' سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ اور جماعت مجاہدین سرحد کی مساعی کا مختصر مگر قابل وثوق اور نہایت سبق آموز ذکر آگیا ہے' قیمت مجلد ۲ روپے ۱۲ آنے

Registered No. L. 4584

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحبان محکمہ تعلیم برائے گورنمنٹ سکولز صوبہ پنجاب ریاست بہاولپور و ریاست بھوپال

۱۹۳۱ء

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت فی پرچہ ۸ر

قیمت سالانہ پانچ روپے

ماہنامہ

پیغامِ حق

ظفر منزل تاجپورہ لاہور

جلد ۹	دسمبر ۴۴ء مطابق محرم ۱۳۶۴ھ	عدد ۶

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس بیرون اکبری دروازہ لاہور میں باہتمام ملک محمد عارف خاں

چھپوا کر دفتر رسالہ پیغامِ حق ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع کیا

قیمت فی پرچہ ۸ر

کاغذ کی کمیابی بلکہ نایابی اب اپنا اثر دکھانے لگی ہے جب سے جنگ شروع ہوئی ہے کاغذ کی مارکیٹ نے کئی پہلو بدلے ہیں۔ اس دوران میں وہ کاغذ جو قبل از جنگ ۴ آنے فی پونڈ کے حساب سے بکتا تھا اور جتنا کوئی چاہے حاصل کر سکتا تھا وہ ایک روپیہ آٹھ آنے پونڈ تک بکنے لگا اور وہ بھی بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا۔ اس کے بعد بھاؤ گرنے لگا۔ مال زیادہ آ گیا۔ گورنمنٹ نے بھی نرخ مقرر کر دیئے اور حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ تگ و دو کرنے اور روپیہ رکھنے والوں کو تو کاغذ کی کمی نہ تھی مگر جو زیادہ تگ و دو نہ کر سکتے تھے یا زیادہ روپیہ فراہم کر سکتے تھے۔ ان کے لئے بڑی مشکل ہو گئی۔ اب ہماری سرکار دولت مدار نے کاغذ پر پوری طرح قبضہ کر لیا ہے اور کسی کے لئے ممکن ہی نہیں رہا کہ وہ اپنی تگ و دو یا سرمایہ کے بل بوتے پر بھی کاغذ حاصل کر سکے۔ اب تمام پبلشر گورنمنٹ کے رحم پر ہیں۔ دیکھیں گورنمنٹ کیا کرتی ہے۔

مذہبی لٹریچر اور معلومات عامہ سے متعلق لٹریچر کو گورنمنٹ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہاں انہی کتابوں کو کاغذ ملنے کی امید ہے جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ یا لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔ ان حالات میں معلوم نہیں کہ اس لٹریچر کا کیا حال ہو۔ جو اس ادارہ سے طبع ہو رہا ہے۔ بہر حال رسائل کے لئے گورنمنٹ کاغذ دے رہی ہے۔ اگر آپ اس لٹریچر کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ تو پیغام حق کی خریداری کو بڑھانا آپ کا فرض ہے +

جنوری کا پرچہ بڑا ہی اہم ہے۔ اس میں جناب ذوقی شاہ صاحب کا مضمون کتب سماوی پر ایک نظر آ رہا ہے۔

محمد علی علیہ الرحمۃ

(قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام دکن)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

محمد علیؒ ——— خدا ان کی تربت پر اپنی رحمت کے پھول برسائے ——— صحیح معنوں میں مسلمانوں کے رہنما تھے۔ مسلمان کی محبت، مسلمان کا خلوص، مسلمان کی بے باکی، مسلمان کی بےغرضی اور مسلمان کی سادگی ——— وہ جوہر جو آج مسلمانوں میں نظر آتے ——— قدرت نے محمد علی کو نہایت فیاضی سے بخشے تھے۔

سچ پوچھئے تو محمد علی سے پہلے ہندستانی مسلمانوں کی کوئی قومی زندگی ہی نہ تھی۔ ہندی مسلمانوں کی قومی زندگی کا آغاز محمد علی کی قومی زندگی کے ساتھ ہی ہوا۔ محمد علیؒ نے اپنے خون جگر سے اس پودے کو سینچا۔ اور بالآخر اسی پر قربان ہو گئے۔ محمد علی سے قبل ہماری سیاست کے دفتر عمل میں صرف یہی دو لفظ تھے۔ وفد اور عرضداشت ——— عرضداشت اور وفد ——— محمد علی نے ہماری سیاست کو ایک غیور اور زندہ قوم کی سیاست میں بدل دیا۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں کی کوئی قابل ذکر تحریک نہیں جس کی قیادت محمد علی نے نہ کی ہو اور قیادت بھی اس شان سے کہ صرف وہی ایک قاید نظر آتے تھے۔ ان کے سب رفقا جو جلالتِ قدر میں آج کے بیسیوں لیڈروں پر بھاری ہیں لیڈری کو نہیں اس قاید کی اقتدا کو ہی اپنے لئے سرمایہ فخر سمجھتے تھے۔ طرابلس کی تحریک، مسجد کانپور کا ہنگامہ، تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات ہماری قومی و سیاسی زندگی کے چار سنگ میل ہیں۔ اور ان سبھی منزلوں میں قافلہ سالار محمد علی تھے۔ خلافت کا ہنگامہ محمد علی کے دم سے تھا۔ لیگ کی گرمی بازار محمد علی کے باعث تھی اور کانگرس کو کانگرس اور گاندھی کو

گاندھی بنانے والا بھی محمد علی ہی تھا۔ وہ ایک پارس تھا جسے چھو گیا سونا بنا گیا۔

محمد علی کی شخصیت کے متعلق کیا عرض کیا جائے؟ افسوس کہ قوم نے اس گوہر یکدانہ کی قدر نہ کی۔ ہماری قومی زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس میں محمد علی نے انقلاب نہیں پیدا کیا؟ مگر ہم میں سے اکثر کو ابھی تک اس کے صحیح مقام اور اس کی حقیقی عظمت کی خبر ہی نہیں۔ حالانکہ اللہ کا یہ بندہ جس محفل میں جا نکلا اللہ کے فضل سے چھا گیا۔ ترک موالات کا یہ ہنگامہ آفرین لیڈر ہندوستان میں مسلمانوں کے واحد آزاد تعلیمی ادارہ کا بانی اور پہلا پرنسپل ہے جنہیں اس کی شاگردی کا فخر حاصل ہے یہ کہتے ہیں کہ وہ صرف ایک عوامی لیڈر ہی نہیں بلکہ ایک قابل اور شفیق استاد بھی تھا۔ تقریر میں اپنے زمانہ میں انگریزی ہو یا اردو کسی دوسرے کا چراغ اس کے سامنے کبھی نہ جل سکا۔ اور تحریر میں یہ کمال کہ اردو تو خیر اس کی اپنی زبان تھی۔ انگریزی میں یہ مرتبہ کہ وائسرائے سبکدوش ہو کر ولایت واپس گئے تو "کامریڈ" کے فائل ساتھ لیتے گئے کہ دوست ہندوستان کے تحفہ کا مطالبہ کرینگے تو یہ پیش کروں گا کہ اس سے بہتر ہندوستان میں کوئی تحفہ نہیں!

دل اور دماغ کی جو صلاحیتیں بیک وقت محمد علی میں جمع ہو گئی تھیں ان کی نظیر مدتوں کہیں نہیں ملے گی۔ لیکن لیڈر محمد علیؒ مقرر محمد علی اور ایڈیٹر محمد علیؒ سے بھی بلند شخصیت انسان محمد علی کی تھی۔ کیر یکٹر کی جو مضبوطی محمد علیؒ میں تھی مسلمانوں میں جنہیں کیریکٹر کے معاملہ میں دوسری قوموں کے لئے نمونہ ہونا چاہیئے تھا اس کی مثال شاذ و نادر ہی کہیں ملے گی۔ انہوں نے جس بات کو حق سمجھا برملا کہا۔ یہ نہیں سوچا کہ حکومت چین بجبیں ہو گی کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ رفقا ناراض ہونگے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی کہ عوام بگڑ جائینگے جس محمد علی نے کراچی کے تاریخی مقدمہ میں جابر حاکموں کے متعلق وہ خیالات ظاہر کئے جن کے اظہار سے آج بھی بڑے بڑے حریت پسند ڈرتے ہیں۔ اسی محمد علیؒ نے کانگرس کے سب سے بڑے لیڈر گاندھی کے متعلق یہ کہا کہ عقیدے کے لحاظ سے ایک فاسق و فاجر مسلمان بھی گاندھی سے بہتر ہے۔ کانگرس کو صحیح معنوں میں کانگرس بنانے والا محمد علیؒ وقت آنے پر پوری قوت کے ساتھ کانگرس کے خلاف کھڑا ہو گیا اور آخر وقت تک اس کے خلاف لڑتا رہا۔ اس کی قوم نے اس سے منہ موڑا مگر اس نے جادۂ حق

سے منہ نہ موڑا۔ اور اس سے بھی بددل نہ ہوا۔ کہ کل تک جو اس کے نام کے نعرے لگاتے تھے آج اسے گالیاں دیتے ہیں۔

آخر عمر میں اس کی یہ حالت ہو گئی۔ کہ افلاس کے باعث پریشانی اور امراض کی کثرت نے اس کی صحت تباہ کر ڈالی مگر اس حال میں بھی کہ ڈاکٹروں نے اس کے سفر کو موت کا سفر قرار دے کر اسے انگلستان جانے سے روکا محمد علی نے جس چیز کو فرض سمجھا اسے نباہا۔ اور چشم فلک نے احسان ناشناسی کا یہ مظاہرہ بھی دیکھا کہ قوم کے مخلص ترین فرزند کو سٹریچر پر ڈال کر جہاز پر سوار کیا جا رہا ہے۔ اور قوم سیاہ جھنڈیاں ہلا رہی ہے۔

گول میز کانفرنس میں بھی محمد علی لالۂ صحرا کی طرح "درمیان انجمن" تنہا تھا لیکن کلمۂ حق کہنے کی توفیق قدرت نے اس کے مقدر میں کر رکھی تھی۔ محمد علی کے آخری الفاظ یہ تھے:۔

"میں یہاں اس غرض سے آیا ہوں کہ آزادی کی دستاویز لے کر واپس ہندوستان جاؤں۔ غلام ملک میں واپس جانے سے آزاد ملک میں مرنا بہتر ہے۔ اگر تم نے مجھے ہندوستان کی آزادی کا پروانہ نہ دیا تو تمہیں میری قبر کے لئے دو گز زمین دینا ہو گی"

اور اس نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ خدا نے اسے انگلستان میں نہیں اس مقدس سرزمین میں آخری آرام کے لئے جگہ عطا کی کہ فرشتے بھی اس پر رشک کریں۔ آج اس مرد مجاہد کا یوم وفات ہے۔ خدا اس کی تربت پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

اخبار نویس کی موسم سرما اور وہ بھی دہلی کا موسم سرما اور وقت صبح ۵ بجے شوکت بھائی (یعنی مولانا شوکت علی) چند ماہ پہلے مجھے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دلا کر یہاں لے آئے تھے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء کی اس صبح کو ۵ بجے کلکتہ کی سکونت ترک کر کے پہلی دفعہ دہلی آرہے تھے۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور میں چیلوں کے کوچہ سے بھاگم بھاگ چاندنی چوک تک پہنچا۔ اس وقت کوئی تانگہ بھی میسر نہ آیا۔ اس لئے ریلوے اسٹیشن تک کا فاصلہ تقریباً دو میل بھاگتے بھاگتے طے کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ میری عمر ۲۲ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس لئے

دلی میں دسمبر کی کڑکڑاتی سردی میں ایک جوان جسم پر پسینہ کا لطف دوبالا ہوگیا تھا۔ اس وقت تک تو
میں شوکت علی سے خوب واقف تھا اس لئے کہ وہ میری شادی کے دن میرے سسرال میں (مولوی
محمد یعقوب کے مکان پر) اس وقت تشریف لائے تھے جب میں دولہا بنا بیٹھا تھا۔ اور پہلا کام انہوں نے یہ کیا
تھا کہ میرے سامنے سلامی کا جس قدر روپیہ رکھا تھا وہ سب اٹھا کر مسلم یونیورسٹی کے چندہ میں شریک کر لیا
تھا مگر محمد علی کو میں نے ایک دو مرتبہ ہی دور سے دیکھا تھا البتہ اب دسمبر کی اس ٹھنڈی صبح سے میرا ان کا وہ
رابطہ شروع ہوتا ہے جو ان کی زندگی کے غروب آفتاب تک قائم رہا۔ کامریڈ والے محمد علی سے اس قدر قریب
آنے کا شوق میری جوانی کو بے تاب کر رہا تھا۔ اور دلی ریلوے سٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر دسمبر کی وہ صبح میری
زندگی کا ایک نیا باب شروع کر رہی تھی۔ ہوڑہ ایکسپریس اپنے مقررہ وقت کے چند منٹ بعد پلیٹ فارم پر پہنچی
اور ٹرین کی ایک آخری گاڑی سے ایک سرمئی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے مسٹر محمد علی برآمد ہوئے۔ میری جوانی
اس زمانہ میں لباس اور فیشن کی ترغیبات سے ہم آغوش تھی۔ اس لئے پہلی چیز جس کا رعب مجھ پر پڑا۔ وہ محمد علی
کے انگریزی لباس کی تراش اور موزونیت تھی۔ آج تک یاد ہے کہ ان کے سرمئی سوٹ کے ساتھ ان کے جوتے
اور موزے بھی سرمئی تھے۔ زندگی کے اس دور میں جوتوں اور موزوں کی رنگ آمیزی ہم نوجوانوں کی معاشرت
کا گویا ایک بہت ہی اہم سفر تھا۔

علی گڑھ میں ہم جامہ زیبی کا سبق پڑھتے رہے اور اس کو اپنی تعلیم و تربیت کا ایک امتیازی نشان سمجھا
کرتے تھے۔ زندگی کی یہ قیمتیں ہمارے لئے اس وقت تک نہ بدلیں جب تک کہ مسٹر محمد علی اپنی عبا و ردا کے ساتھ
مولانا محمد علی نہ بن گئے۔ اس دن صبح کو دہلی کے ریلوے سٹیشن پر جب کہ میں نے اس شخص کو دیکھا جس سے میری زندگی
کو سالہا سال استفادہ کرنا تھا۔ تو وہ نظر صرف اتنی ہی وسیع تھی کہ پہلی نظر آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ محمد علی کے سوٹ
کی تراش اور سوٹ کے ساتھ موزوں اور جوتوں کے رنگ کے ربط پر گئی۔ باقی جو کچھ دیکھا تھا وہ بعد میں دیکھا
۲۲ سال کی عمر تھی جس کا ایک حصہ سرکاری ملازمت میں گزرا تھا ابھی اپنی نظر کوئی زاویہ قائم نہ کر سکی تھی میں کامریڈ

کے مضامین پڑھا کرتا تھا۔ اور ان مضامین کے مطالب سے زیادہ انگریزی زبان پر محمد علی کے قلم کی قدرت کو دیکھا کرتا تھا۔ میرا دل اور میری طرح اس زمانہ کے ہزاروں نوجوانوں کا دل جدید افکار کی وسعتوں اور خیالات کی بلندیوں سے آشنا تھا۔ ہمدرد کے شعبہ ادارت میں جب میں ایک ادنیٰ شاگرد بن کر محمد علی کے سامنے بیٹھا تب کہیں ان چنگاریوں کی گرمی میں نے محسوس کی جو کامریڈ کے جواں سال اور بے باک ایڈیٹر کی شخصیت سے نکل کر ان کے نوجوان شاگردوں کو اذیت کوش ہونے کی دعوت دیتی تھیں۔ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو ہمدرد کا ایک ورق نقیب ہمدرد کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس وقت تک بیرونی ٹائپ کی کافی مقدار وصول نہ ہوئی تھی۔ اس لئے یکم جون ۱۹۱۳ء سے پہلے ہمدرد اپنے پورے حجم کے ساتھ شائع نہ ہو سکا۔ یکم جون ۱۹۱۳ء کے بعد سے شعبہ ادارت کا پورا کام شروع ہوا اور میں نے پہلی دفعہ محمد علی کے مددگار کی حیثیت سے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ ایک ادنیٰ شاگرد کی حیثیت سے میں نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا اور جب تک ۱۹۱۴ء کی جنگ کا ہنگامہ شروع ہوا اور محمد علی کی پدرانہ حیثیت قومی کاموں میں منتقل نہ ہو گئی وہ ہمدرد کے شعبہ ادارت کی نگرانی کرتے رہے۔ یہی زمانہ وہ تھا۔ کہ ایک ایسے اُستاد کی طرح جو بیک وقت شفیق بھی تھا اور سخت گیر بھی۔ ان کا صحافت کے ابتدائی اصول اپنے نوجوان مددگاروں کو سمجھانے کا طریق کار یہ تھا کہ ہفتہ میں صرف ایک یا دو مضامین لکھ دیئے جاتے تھے ہر روز شام کو ادارت کے ارکین کی ایک مجلس مشاورت چیف ایڈیٹر کے کمرہ میں منعقد ہوتی تھی۔ اس مجلس میں مرحوم اپنے ہر مددگار کے لئے ایک مضمون تجویز کرتے تھے۔ پھر اس مضمون کے متعلق کتابوں کی ایک فہرست لکھاتے تھے بہت سی کتابیں اپنے کتب خانہ سے نکال کر دیتے تھے۔ ان کے خاص خاص ابواب اور صفحات کی نشان دہی کرتے تھے اور بار بار اس اصول کو ذہن نشین کرایا کرتے تھے کہ لکھنے سے پہلے اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے بعض دفعہ دس بارہ کتابیں پڑھنے کے بعد ایک اداریہ لکھنا ہوتا تھا میرا پہلا اداریہ ہمدرد کی پہلی جلد کے آٹھویں پرچہ میں، اجون کو شائع ہوا تھا لیکن میں تم بتاؤں کہ وہ لکھا کسطرح گیا تھا تاکہ آپکو معلوم ہو کہ فن صحافت میں محمد علی کے شاگرد کسطرح تربیت حاصل کرتے تھے۔ دس بارہ کتابیں مجھے دی گئی تھیں تاکہ میں ان سب کو پڑھ لوں کچھ نوٹ خود محمد علی نے لکھوا دیئے تھے آدھ دن

دماغ تک میں لکھنے کی تیاری کرتا رہا۔ پھر جب ایک حصہ لکھ لیا تو مسودہ انکے پاس لایا مجھے یاد ہے کہ چند ہی سطریں پڑھنے کے بعد انہوں نے منہ بنایا اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا کہ یہ کیا فضولیات گھسیٹ کر لائے ہو!

میں کیا کہوں کہ اس وقت ایک خام کار نوجوان کی کس قدر دل شکنی ہوئی جسکو اپنے خیال میں بڑا ناز تھا اس بات پر کہ وہ ہمدرد کے ادارتی شعبہ جات میں اپنی خواہش کے اصرار کیساتھ شریک کیا گیا ہے حالانکہ عمر اور تجربہ میں وہ محمد علی کے تمام دوسرے شاگردوں سے کم ہے۔ اگر چیف ایڈیٹر کی رائے میں اسکے پہلے ہی مضمون کا مسودہ فضولیات قرار پایا تو ظاہر ہے کہ اس نوجوان کی خودبینی کو جسقدر بھی صدمہ پہنچا ہو وہ کم ہے۔ بڑی ذلت اور شرمندگی محسوس ہوئی کچھ غصہ بھی آیا مگر اتنی جرأت نہ تھی کہ اس غصہ کا ذرا بھی اظہار کیا جاتا۔ پھر ایک گھنٹہ تک انکا لیکچر سنا۔ پھر بہت کوشش کرکے انکے خیالات کے مطابق از سرِ نو وہ مضمون لکھا پھر بھی ناپسند ہوا مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ پہلی دفعہ۔ ایک دفعہ میں بہت مغموم تھا۔ انکے سامنے پہنچا تو شکایات و حکایات کو بھانپ کر اسطرح رونے لگے کہ مجھ پر ہزاروں گھڑے پانی پڑ گیا۔ میری شکایت ندامت بن گئی اور توبہ کرنی پڑی کہ اب ایسا نہ ہوگا۔ اپنے شاگردوں اور عقیدتمندوں سے محبت کے جواب میں وہ محبت نثار کرتے تھے۔ اور اگر ہم اپنی کم فہمی سے انکی کسی شکایت اور غصہ سے خفا ہو جاتے تھے تو انکے قلب صافی کی سادگی ایسی تھی کہ وہ خود ہی حیران ہو جاتے تھے کہ میں نے یہ کیا کیا جو کچھ اس بے مثل استاد اس محبت کرنیوالے بھائی اس شفیق دوست سے میں نے سیکھا۔ وہ میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے صحافت انکی زندگی کا کوئی واحد مقصد نہ تھا۔ بلکہ وہ تو کسی بہت بڑے مقصد کیلئے محض آلۂ کار تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو محمد علی ہندوستان میں آج سب سے بڑے اور کامیاب صحیفہ نگار سمجھے جاتے۔ ہمدرد کے اجرا کے چند ہی روز بعد انکی قومی مصروفیت نے اپنے لئے بڑے خارزار میدان پیدا کر لئے تھے۔ اس لئے وہ صحافت کو اپنی نظر میں اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھتے تھے کہ:۔

میرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں یہ بھی

چنانچہ رفتہ رفتہ کامریڈ اور ہمدرد کے کالموں سے انکا تعلق بہت کم ہوگیا۔ اور ہمدرد کی ذمہ داریاں بڑی حد تک مجھ پر اور سید جالب مرحوم پر اور کامریڈ کی ذمہ داریاں مرحوم راجہ غلام حسین پر عائد ہوگئیں۔ انکی نظربندی کے بعد بھی خود ان ہی کے ارشاد سے پہلے کلکتہ جاکر وہاں سے روزنامہ جمہور جاری کیا۔ اسطرح میں ان سے دور ہوگیا لیکن بقول استاد مرحوم کے۔ ع

دل کی فضا میں بعد زمان و مکاں نہیں

اقبال کے کلام میں آزادی اور غلامی کا تخیل

از جناب خواجہ عبدالوحید صاحب لاہوری

حضرت علامہ سر محمد اقبال مرحوم نے اپنی تصانیف میں آزادی اور غلامی پر نہایت شرح و بسط سے اظہارِ خیالات فرمایا ہے اور اس موضوع کو اس درجہ واضح اور روشن کر دیا ہے کہ آزاد و غلام افراد و اقوام کے خد و خال کی پوری پوری تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

اقبال کے نزدیک آزادی دوسرا نام ہے زندگی کا۔ اور غلامی "حیاتِ بے شرف" ہونے کی وجہ سے موت کی مترادف ہے۔ اقبال کی نگاہوں میں آزادی کی حالت میں جو زندگی پھیل کر "بحرِ بیکراں" بن جاتی ہے غلامی میں وہی متاعِ بے بہا سمٹ کر ایک "جوئے کم آب" رہ جاتی ہے۔

اقبال آزادی کو اس لئے اچھا جانتا ہے کہ اس کی فضا میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی خوبیاں ابھرتی اور نشو و نما پاتی ہیں۔ اور وہ زندگی کے ہر شعبے میں شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو کر اپنی تخلیق کا مقصد پا لیتا ہے۔ اور غلامی اس کے لئے اس وجہ سے قابلِ نفرت ہے کہ اس کے اثر سے افراد اور جماعتیں ہر لحاظ سے ذلیل و خوار ہو کر اعلیٰ علیین سے اسفل سافلین میں جا گرتی ہیں۔

آزاد اقوام اپنے علم، اپنے تدبر، اپنے تمدن، اور اپنی تہذیب کا عَلَم بلند کر کے کرۂ ارضی کو منور کرتی ہیں اور غلام قومیں علم و تدبر اور تہذیب و تمدن کے خوبصورت چہرے کو اپنی ناپاک زندگیوں سے مکروہ بنا دیتی ہیں

آزادی کی فضا میں انسان کی تمام جسمانی اور روحانی قوتیں بروئے کار آتی ہیں۔ اور غلامی میں وہ یکسر بے کار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

"غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں"

انسان اپنے خالق و پروردگار سے بھی خاطر خواہ تعلق آزادی ہی کی فضا میں قائم رکھ سکتا ہے۔ غلامی میں خدا اور بندے کے درمیان ہزاروں طرح کے حجابات حائل ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے تو اسلام نے ایسے مقام سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا ہے جہاں رہتے ہوئے انسان اپنے خالق و پروردگار حقیقی کو خوش نہ رکھ سکتا ہو اقبال اس چیز سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔

از قیام بے حضور من مپرس
از سجود بے سرور من مپرس

جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس
قسمت مردان آزاد است و بس

مرد آزادے چو آید در سجود
در طوافش گرم رو چرخ کبود

لیکن آہ! غلاموں کو یہ چیزیں کہاں نصیب!

ما غلاماں از جلالش بے خبر
از جمال لازوالش بے خبر

از غلامے لذت ایماں مجو
گرچہ باشد حافظ قرآں مجو

مسلم است و پیشہ آذری است
دین و عرفانش سراپا کافری است

غلام تو خدا کے حضور میں حاضر ہونے کی اہلیت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔

دگرگوں کشور ہندوستان است
دگرگوں آں زمین و آسمان است

مجو از ما نماز پنجگانہ
غلاماں را صف آرائی گراں است

مذہب جو آزاد انسان کے لئے زندگی کی عزیز ترین متاع ہے۔ غلام کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے آزاد شخص مذہب کے مقابلے میں زمین و چاند و سورج ستاروں، غرض تمام کائنات کو ہیچ سمجھتا ہے لیکن غلام

اپنے تنورِ شکم کے لئے ایندھن فراہم کرنے کے لئے اسے سستے داموں بیچ دیتا ہے۔

دین و دانش را غلام ارزاں دہد
تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

گرچہ بر لبہائے اُو نام خدا است
قبلۂ او طاقتِ فرماں رواست

وہی عبادت جو آزادی کی فضاء میں قوم کے لئے گوناگوں سعادتوں کے دروازے کھول دیتی ہے۔ اور اسے منظم بنا کر شان و شکوہ پیدا کر دیتی ہے۔ غلامی میں قوم کو ایسی بھیڑ بنا دیتی ہے جس کے مدِ نظر کوئی مقصد اور جس کی حرکت میں کوئی نظم نہیں ہوتا۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین

وہی قوم جسے آزادی کی فضا میں خود اپنے لئے زندگی کی تعمیری مصروفیتوں میں منہمک رہنا تھا غلامی میں شرفِ حیات کھو کر دوسروں کے لئے سرو سامانِ حیات مہیا کرنے میں لگ جاتی ہے۔ اس کی وہ طبعی و فکری قوتیں جو آزادی میں اپنے کام آئیں۔ غلامی میں حکمرانوں کے مفاد میں صرف ہونے لگ جاتی ہیں۔ اور وہی دل و دماغ جو آزاد قوموں کے استقلال کا باعث بنتے ہیں غلامی میں اغیار کی گرفت

وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر
کارِ اُو تخریبِ خود تعمیرِ غیر

قوتِ فرمانروا معبودِ اُو
در زیانِ دین و ایماں سودِ اُو

دینِ اُو عہدِ وفا بستن بہ غیر
یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر

وہ وظائفِ حیات جو آزادی میں قوم کے لئے سربلندی اور سروری و جہانبانی کا سرو سامان پیدا کرتے ہیں غلامی میں بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ سرو سامانِ حیات جو آزادی میں ہمت کا علو اور تخیل کی بلندی پیدا کرتے ہیں غلامی میں ہمتوں کو پست اور خیالات کو ذلیل بناتے ہیں۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّاں کی اذان اَور مجاہد کی اذان اور

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اَور

میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے

زندگی کی وہ دلچسپیاں جو آزادی میں فنونِ لطیفہ اور علومِ نافعہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ غلامی میں اپنی جگہ کو بدذوقی اور بے بصری کو دے جاتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

غلام قوموں کے فنونِ لطیفہ زندگی کے عناصر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ موسیقی میں

نغمۂ او خالی از نارِ حیات — ہمچو سیل افتد بدیوارِ حیات
از دلِ افسردۂ او سوز رفت — ذوقِ فردا لذتِ امروز رفت
از نئے او آشکارا رازِ او — مرگِ یک شہرست اندر سازِ او

فنِ مصوّری کا یہ حال ہے کہ:۔

مے چکد از خامہ ہا مضمونِ موت — ہر کجا افسانہ و افسونِ موت

ایجاد اور ندرت و اجتہاد کی جگہ کورانہ تقلید غلام قوم کا شیوہ بن جاتی ہے۔

در غلامی تن زجان گردد تہی — از تنِ بے جاں چہ امیدِ بہی!
ذوقِ ایجاد و نمود از دل رود — آدمی از خویشتن غافل شود
کیشِ او تقلید و کارش آزری ست — ندرت اندر مذہبِ او کافری ست
تازگیہا وہم و شک افزایدش — کہنہ و فرسودہ خوش مے آیدش

اسی طرح

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے — نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں — آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

غلام افراد بالآخر بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق اُن کو آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

اور ان کی حالت بہائم سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔

آدم از بے بصری بندگیِ آدم کرد گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد

یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو کر بلند ترین شخصیتیں اعلیٰ علیین سے تحت الثریٰ میں پہنچ جاتی ہیں

جبرئیلے را اگر سازی غلام برفتد از گنبدِ آئینہ فام

اقبال کو آزاد اور غلام کے درمیان ہر چیز میں اختلاف نظر آتا ہے۔

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید آزاد کا دل زندہ و پُر سوز و طربناک

آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

ممکن نہیں محکوم کو آزاد کا ہمدوش وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

اسی طرح

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات

آزاد کا ہر لحظہ، پیامِ ابدیت محکوم کا ہر لحظہ، نئی مرگِ مفاجات

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور محکوم کا اندیشہ، گرفتارِ خرافات

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

ایک اور جگہ ارشادات ہوتا ہے۔

خودگیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات

محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست — خود مردہ و خود مرقد و خود مرگ مفاجات

اقبال کے نزدیک آزاد قوم کے افراد مرد ہوں یا عورتیں، جوان ہوں یا بوڑھے۔ اپنے دلوں میں جذباتِ عالیہ کی پرورش کرتے ہیں۔ لیکن غلام قوم کے ہر طبقے کے افراد پست ہمت، خود پسند اور عیش طلب ہو جاتے ہیں۔

از حیا بیگانہ پیرانِ کہن — نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن

در دلِ شاں آرزوہا بے ثبات — مردہ زایند از بطونِ امہات

دختران او بزلفِ خود اسیر — شوخ چشم و خود نما و خوردہ گیر

آزادی کی فضا میں زندگی بسر کرنے والے شب و روز معروفِ عمل ہیں۔ اور غلام زندگی کے کاروبارِ حقیقی سے بے نیاز ہو کر لہو و لعب کے لئے فارغ رہتے ہیں۔

مدیرِ "مخزن" سے جا کے اقبال کوئی میرا پیام کہہ دے — جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو — نہیں ہے بندۂ حُر کے لئے جہاں میں فراغ

غلام قوم کے افراد ضمیر کی راہنمائی کھو کر اشیاء و حقائق کی اصلی قدر و قیمت بدل دیتے ہیں

تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

چنانچہ دیکھ لیجئے وہی "جہاد" جو کشمکشِ حیات میں زندہ رہنے کیلئے ناگزیر ہے ہندوستان کے ہر اس مدعئ دین کے نزدیک نامحمود ہے جو اپنے آپ کو فرزندِ دلبند سرکار انگلشیہ کہلوانا پسند کرتا ہے۔

جب ایک سلیم الفطرت انسان کو آزادی کی فضا میسر ہوتی ہے تو اس کے اخلاق بلند ہو جاتے ہیں۔ لیکن غلامی انسان کو اسفل سافلین میں گرا دیتی ہے۔ چنانچہ مردِ حُر کے اخلاقِ عالیہ اور غلام کی پست فطرت کا نقشہ اقبال ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

پادشاہاں در قباہائے حریر | زرد رُو از سہمِ آں عُریاں فقیر
سترِ دیں ما را خبر اُو را نظر | او درونِ خانہ ما بیرونِ در
ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش | او ز دستِ مصطفیٰ پیمانہ نوش
قبلۂ ما گاہ کلیسا گاہ دَیر | او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر
ما ہمہ عبدِ فرنگ او عبدُہٗ | او نگنجد در جہانِ رنگ و بُو
صبح و شامِ ما بہ فکرِ ساز و برگ | آخرِ ما چیست؟ تلخیہائے مرگ
در جہانِ بے ثبات اُو را ثبات | مرگِ اُو را از مقاماتِ حیات

وہ انسان جسے اشرف المخلوقات بنایا گیا تھا جب غلامی کے عذابِ الیم میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو غور کیجئے اقبالؒ اسے کس حال میں دیکھتا ہے۔

از غلامی دل بمیرد در بدن | از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی ضعفِ پیری در شباب | از غلامی شیرِ غاب افگندہ ناب
از غلامی بزمِ ملّت فرد، فرد، | این و آں با ایں و آں اندر نبرد
آں یکے اندر سجود ایں در قیام | کاروبارش چوں صلوٰت بے امام
در رفتہ ہر فرد با فردے دگر | ہر زماں ہر فرد را دردِ دگر
از غلامی مردِ حق زنّار بند | از غلامی گوہرش ناارجمند
شاخِ اُو بے مہرگاں عریاں ز برگ | نیست اندر جانِ اُو جز بیمِ مرگ
کور ذوق و نیش را دانستہ نوش | مُردۂ بے مرگ و نعشِ خود بدوش
روزہا در ماتمِ یک دیگر اند | در خرام از ریگِ ساعت کمتر اند

انتہا یہ ہے کہ غلام قوم اپنے دین میں بھی غلامی کے جواز اور طریقوں کو ڈھونڈنے لگتی ہے۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب   کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ دعیانِ الہام کا الہام بھی ان کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے   غارتگرِ اقوام ہے یہ صورتِ چنگیز

اقبال کے نزدیک غلامی ایک سحر ہے جس میں حکمران محکوموں کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ پھر غلام قوم مسحور ہو کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے۔ جہاں آزاد فرد کی زندگی اور موت چلنا اور پھرنا سب کچھ خدا کیلئے تھا

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ط

غلام قوم حکمرانوں کے کانوں سے سُنتی اور انہیں کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ وہ زندگی کے حقائق سے بےخبر اور اپنے متعلق گوناگوں غلط فہمیوں میں مبتلا کر دی جاتی ہے۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الملوک   سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر   پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز   دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

اقبال جانتا ہے کہ حکمران غلاموں کو کبھی آزادی کا احساس نہ ہونے دیں گے۔ جب کبھی اس احساس کا امکان پیدا ہوگا حکمران کسی نئے عمل سحر سے اس احساس کو مٹا دینے کی تدبیر کریں گے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر   پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اس لئے اقبال غلاموں کو یقین دلاتا ہے کہ آزادی کے لئے انہیں اپنی محنت اور سعی و طلبِ صادق پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ حکمران چونکہ غلاموں کا خون چُوس کر جیتے ہیں اس لئے اُن کے دلوں میں محکوموں کے لئے رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہونے کی توقع رکھنا نادانی ہے۔

ترا نادان اُمیدِ غمگساری ہا ز افرنگ است   دلِ شاہیں نسوزد بہرآں مرغے کہ در چنگ است

اگر اپنے وطن میں رہ کر بے آبروئی کی غلامانہ زندگی میسر ہوتی ہو تو اقبال اپنے وطن سے بھی بیزار نظر آتا ہے

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا　　چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

اپنے وطن کی غلام آباد سرزمین کا ذکر دیکھئے کس حسرت بھرے انداز میں کرتا ہے۔

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت　　آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے

اور اس کے برعکس دوزخ میں دنیاوی حکمرانوں کی حکومت سے آزادی ہو تو غلام آباد ہندوستان سے

وہ بھی بہتر ہے۔ اس لئے اقبال دوزخی کی زبان سے سنتا ہے:۔

اللہ ترا شکر کہ یہ خطۂ پرسوز　　سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

چونکہ اقبال کے نزدیک غلامی اُم الخبائث ہے اس لئے وہ ان لیڈروں اور اس لیڈر شپ سے بیزار

ہے جو انسانوں میں خوئے غلامی پیدا کرتے ہیں:۔

شاعر بھی ہیں پیدا علماء حکماء بھی　　خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

مقصود ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک　　ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ

بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو　　باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند　　تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

اقبال ایسے راہنماؤں کو ملعون قرار دیتا ہے جو انسانوں کو اپنے ہمجنسوں کی غلامی پر آمادہ کرتے ہیں

ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید　　قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیمِ اللّٰہی

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اُس کی　　جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

وہ غلاموں کو ان کی غلامانہ ذہنیت کے باعث کافر قرار دیتا ہے۔

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن　　تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

غلام کا مستقبل اس زندگی میں تو تاریک ہوتا ہی ہے۔ موت کے بعد وہ اور بھی تاریک ہو جاتا ہے۔

اس قدر تاریک کہ قبر بھی اپنی تمام تاریکیوں کے باوجود اس سے بیزار ہوتی ہے۔ دیکھئے اقبال قبر کی زبانِ حال سے غلام کیلئے کیا کہہ رہا ہے۔

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا — میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک

تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر — تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک

الحذر! محکوم کی میت سے سو بار الحذر — اے اسرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک

لیکن یہ چیز یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال جس آزادی کا خواہاں ہے وہ ایسی آزادی ہے جس میں انسان کی قوائے طبیعیہ و فکریہ بروئے کار آکر کرۂ ارضی کو اس کے لئے فردوس بریں بنا دیں۔ وہ آزادی نہیں جو آج یورپ اور امریکہ کو حاصل ہے۔ اور خود تمدنِ مغربی کی تباہی کا باعث بن رہی ہے۔ اقبال محض مادی ترقی سے بیزار ہے۔ اس کی زبان حق ترجمان پر مغرب کی آزادی کے حق میں یہ الفاظ جاری ہوئے

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائیٔ تعمیر میں رونق میں صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

یہ علم یہ حکمت یہ حکومت یہ تدبر — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہے محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اقبال اس آزادی کو بھی آزادی نہیں سمجھتا جو مُلا کی نگاہوں میں قابلِ قدر ہے۔

مُلا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اقبال اس آزادی کو بھی آزادی نہیں سمجھتا جو حکمران محکوموں کو خوش آئند اصلاحات کی صورت میں دے کر بیوقوف بناتے ہیں۔

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق / طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام / جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں! / یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو / آہ! اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اقبال اس آزادی کو بھی آزادی نہیں سمجھتا جو ہر فرد کو شتر بے مہار بنا دے اور ہر دماغ کو بے راہروی پر آمادہ کر دے۔

اس قوم کی ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک / جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ / آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اقبال کو محض وہ ترقی مطلوب ہے جو اسلام کے ذریعے سے حاصل کی جائے۔

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر / میری دانش ہے افرنگی میرا ایماں ہے زناری

آزادی جب تمام حدود سے متجاوز ہو جائے تو بجائے راحت کے سامان شیون بن جاتی ہے

دہر میں عیشِ دوام آئین کی پابندی سے ہے / موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

اقبال اس ترقی درجات سے ہمیں ڈراتا ہے جو اوصاف حسنہ کو ملیامیٹ کر دے جس سے ہمتیں پست اور پائے عمل لنگ ہو جائیں۔ اور جس سے فرائض حیات میں کوتاہی پیدا ہو۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی / جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اقبال اس ترقی اور آزادی کا طالب نہیں جو حکمران عطا کریں۔

خریدے نہ جس کو وہ اپنے لہو سے / مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

وہ تو اپنے مطلوب و مقصود کے لئے کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنا گوارا ہی نہیں کرتا

مرا از شکستن چناں عار ناید / چو از دیگراں خواستن مومیائی

وہ تو اس آزادی کا طالب ہے جو موجودہ نظامِ حیات کو تباہ و برباد کئے بغیر پیدا نہیں کی جا سکتی

آمتے برآمتے دیگر چرد — دانہ ایں می کاردآں حاصل برد
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است — از تن شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیب نو آدم دری ست — پردۂ آدم دری سوداگری ست
تاتہ و بالا نہ گردد ایں نظام — دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

اقبال کو جس آزادی کی طلب ہے اس کے لئے موجودہ شیطانی نظام کی تباہی ناگزیر ہے۔

ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام — ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود
گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند — می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند؟

اس لئے وہ خدا سے متمنی ہے کہ یہ شیطانی نظام جلد از جلد تباہ ہو۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات؟

اقبال اس نظام کی تباہی و بربادی کا اعلان خود خدا کی زبان سے سن رہا ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے — آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

لیکن اقبال جانتا ہے کہ خدا ان کی مدد کیا کرتا ہے جو دستِ سوال نہیں بلکہ دستِ طلب بڑھاتے ہیں۔ سروری و جہانبانی ان کے لئے ہے۔ جو سعی اور جد و جہد کرتے ہیں۔ جو راہِ طلب میں ہر طرح کی قربانیاں

کرنا جانتے ہیں۔ جو نامساعد حالات اور ناموافق حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس لئے وہ کہتا ہے۔

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز   زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

وہ یہ نہیں کہتا کہ چونکہ ہندی مسلمانوں کو ہمسایہ قوموں کا خطرہ ہے اس لئے انہیں انگریز کی گود میں گرنا چاہیئے۔ آج مجھے اور آپ کو کانگریس کے غلبہ اور ہندو کے استیلا کا غم کھائے جا رہا ہے۔ لیکن بلند خیال اقبال مطلقاً ہراساں نہیں۔ وہ کہتا ہے:۔

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے   جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے   وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

اقبال ہندوستان کے اس مسلمان سے جسے گزشتہ دس برس میں انتہائی طور پر بزدل، کم ہمت اور نامرد بنا دیا گیا ہے اور جو اب اپنے آپ سے مایوس ہو کر اپنی زندگی کا انحصار انگریزی اقتدار پر رکھتا ہے۔ کہتا ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں   نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید۔ نومیدی زوال علم و عرفان ہے   امید مرد مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

اقبال کے نظریہ حیات کو اگر ہماری قوم کے نوجوان تسلیم کر لیں۔ تو دیکھئے بجائے قانونی تحفظات کے ماتحت زندگی بسر کرنے کی خواہش کے ان کی ہمت کتنی بلند۔ ان کے عزائم کیسے رفیع الشان اور ان کی جد و جہد کتنی زبردست ہو جائے گی۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے   یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

پھر ان کے لئے کوئی منزل منزل نہ رہے گی۔ بلکہ سعی و عمل ان کے لئے مقبول و محمود چیز ہوگی

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے   سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے   نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

ایک مسلمان کی زندگی کی کامیابی سعی و طلب کے جاری رہنے ہی میں ہے کسی منزل تک پہنچنے پر اس کی کامیابی کا دار و مدار نہیں۔ راہِ صداقت میں لڑتے ہوئے جان دینے میں اس کی کامیابی ہے۔ اگرچہ میدانِ جنگ میں اس کی لاش ہزاروں لاشوں کے نیچے دبی ہوئی ہو۔ اگر وہ راہ طلب میں دوڑتا ہوا اس فانی زندگانی کو کھو بیٹھے۔ تو بجائے مرجانے کے وہ جاودانی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون

لیکن افسوس کہ آج ہم ان حقائق سے آنکھیں بند کر رہے ہیں۔ اقبال دنیا میں اس لئے آیا تھا کہ سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگائے۔ لیکن آج مسلمان اپنے ہم قوموں کو موت کی نیند میں مبتلا کرنے کی غرض سے اس کے کلام کو استعمال کر رہے ہیں۔ اقبال مسلمانوں کو دنیاوی حکومتوں سے بدگمان اور متنفر کرنا چاہتا تھا لیکن آج ہندوستان کا مسلمان اسی کے کلام سے دوامی غلامی کی سند لینا چاہتا ہے۔ اقبال نے عمر بھر آزادی کا نغمہ گایا۔ لیکن آج دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دشمن کی حمائت کا جواز اسی کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ افسوس

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست　　　که از "یٰسین" او آساں بمیری

آج اقبال کا مقدس نام لے کر رجعت پسند جماعتیں، رجعت پسند لیڈر، اور رجعت پسند اخبار نویس رجعت پسندی کی آگ کو سرزمین ہند میں ہوا دے رہے ہیں۔ اور مدعی ہیں کہ وہ اقبال کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ لیکن وہ مردِ حق آگاہ کیا خوب کہہ گیا ہے۔

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک　　　ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست ایں مسافر　　　چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

ملفوظاتِ اقبال

از جناب محمد عبداللہ قریشی

۱۹۱۴ء میں منشی محمد الدین صاحب فوقؔ مدیر اخبار کشمیری لاہور نے اپنے ہفتہ وار پرچے کے علاوہ ایک ماہوار رسالہ "طریقت" کے نام سے جاری کیا تھا۔ جو پانچ سال تک نہایت کامیابی سے چلتا رہا۔ اس رسالہ میں نہایت اچھے اخلاقی، علمی، تاریخی، مذہبی اور صوفیانہ مضامین ہوا کرتے تھے اس کا پہلا پرچہ جولائی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں ابوالاعجاز حضرت احسان شاہجہان پوری۔ حضرت خواجہ حسن نظامی۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی، خان احمد حسین خان، مہاراجہ سر کرشن پرشاد، خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی جیسے نامور بزرگوں کے مضامین نظم و نثر نظر آتے ہیں۔ چند ایک کے سوا باقی حضرات "باقیات الصالحات" میں شامل ہو چکے ہیں۔ فوقؔ صاحب کے اپنے اداریؔ مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انہوں نے پرچہ نکالنے سے پیشتر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر صوفیائے کرام۔ تصوّف، مراسم عرس، ضرورتِ مرشد اور زیارت قبور وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات دریافت کئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا تھا۔ وہ بھی لکھ لیا تھا۔ اور ان کی نظر ثانی کے بعد رسالہ میں درج کر دیا تھا۔ یہ شراب اگرچہ اب کسی قدر پرانی ہو چکی ہے مگر ابھی خمار کا اثر رکھتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے یہ زرّیں خیالات آج بھی ہر تعلیم یافتہ نوجوان کے غور و مطالعہ کے قابل ہیں۔ اس لئے میں فوقؔ صاحب کے سوالات اور ڈاکٹر صاحب کے جوابات اس رسالہ سے لے کر یہاں پیش کرتا ہوں:۔

فوق صاحب:۔ صوفیوں سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا؟

ڈاکٹر صاحب:۔ اہل تصوف خصوصاً ہندوستان کے صوفیائے عظام نے اسلام کو وہ رونق بخشی اور بجائے تبر و تلوار کے محض حسن عمل اور اخلاق محمدی کے ذریعے اس کی وہ اشاعت کی کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں چھ کروڑ یقیناً ان ہی بزرگوں کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہیں۔

فوق صاحب:۔ صوفیوں سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا؟

ڈاکٹر صاحب:۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی پر صوفیائے کرام نے بہت بڑا اثر ڈالا۔ تمام ایسے اوصاف جو اخلاقی پہلو سے انسانیت کا خاصہ ہیں محض انہی بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے انسانوں کو انسان اور پھر مسلمانوں کو مسلمان بنایا۔

فوق صاحب:۔ مسلم پالیٹیکس کو ان سے کیا فائدہ ہوا؟

ڈاکٹر صاحب:۔ صوفیوں کا گروہ پولیٹیکل معاملات سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہے۔ تصوف کا مقصد تزکیہ نفس، اصلاحِ باطن اور نفس کُشی ہے۔ اس لئے اس نے ملکی الجھنوں میں بہت کم بلکہ بالکل دخل نہیں دیا۔ البتہ بعض بعض سلاطین کو جو اپنے شاہانہ فرائض سے غافل ہو کر ملک میں فتنہ و فساد کا باعث ہوتے رہے ہیں تادیبی ہدایات فرماتے رہے ہیں۔ جیسا کہ تواریخوں کے مطالعہ اور صوفیائے کرام کے حالات سے اکثر ظاہر ہوتا ہے۔

فوق صاحب:۔ اسلامی تصوف دنیاداری کے متعلق کیا تعلیم دیتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب:۔ اسلامی تصوف کی یہی تعلیم ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کو بھی رکھے۔ اسلام رہبانیت کے خلاف ہے۔ اور گھر بار، اہل و عیال کو ترک کر کے جنگلوں اور بیابانوں میں زندگی بسر کرنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلامی تصوف ایسے لوگ کو جو صرف اپنی ذات کے لئے ہو ایک بے فیض اور خشک چشمہ سے تشبیہہ دیتا ہے۔ بے شک یکسوئی حاصل کرنے کے لئے خلوت و عزلت نشینی کی ضرورت

ہے۔ لیکن تمام لوگ اس کے اہل نہیں ہوتے۔ اور درحقیقت ترکِ دنیا ایک برا نمونہ ہے اہلِ دنیا کے کاروبار کے لئے۔ بلکہ صریح خلاف ورزی ہے قانونِ الٰہی کی۔ جو انسانی نسل کے بڑھتے رہنے اور اس کے پھولنے پھلنے کا متمنی ہے۔

ذوق صاحب:۔ عرس کی رسم کب سے جاری ہے؟

ڈاکٹر صاحب:۔ عرب اور دیگر ممالکِ اسلامیہ کی تو خبر نہیں۔ لیکن ہندوستان کے عرسوں کے متعلق بہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں میں چونکہ جاترا کی رسم عرصہ دراز سے چلی آتی ہے اور وہ دور دراز ممالک سے بعض خاص تیرتھوں پر جاترا کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس لئے جب وہ رفتہ رفتہ مشرف بہ اسلام ہونے لگے تو ان کو اسلام سے مانوس کرنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے گئے جو ان کے مذہبی اور قومی شعائر سے کسی قدر مشابہ تھے۔ یہ میرا قیاس ہے یقین نہیں ہے۔

ذوق صاحب:۔ عرس کا مقصد کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب:۔ عرس کا مقصد تو دراصل یہ ہے کہ جس بزرگ کا عرس ہو اس کے سبق آموز حالات بیان کئے جائیں۔ لوگوں کو اس کے اچھے عمل کی تقلید و پیروی کی ترغیب دی جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ عرسوں کا بیشتر حصہ اپنے اصلی مقصد سے دور ہٹ چکا ہے۔ اور محض بے اثر ہے۔

ذوق صاحب:۔ صوفی لوگ موجودہ زمانہ کی جدوجہد میں ہمارے لئے کس طرح مفید ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب:۔ اہلِ تصوف خصوصاً ان بزرگوں کا جو صاحبِ اثر ہیں اور اپنے عقیدت مندوں کا بہت بڑا حلقہ رکھتے ہیں۔ یہ نہایت ضروری فرض ہے کہ وہ اپنے معتقدوں اور ارادت مندوں کو اپنے اثر میں رکھیں۔ اور ان کی زندگی کو مذہبی اور اخلاقی پہلو سے ایک کامیاب زندگی بنا دیں۔ سوشل ترقی کے لئے جدوجہد کرنا بھی ایک قسم کی بیداری ہے۔ اور یہ بیداری جب بھی ہوگی حضرت صوفیاء کے پاک نفوس ہی سے ہوگی۔

فوق صاحب :- اطبیاء کی کرامتوں کے متعلق کیا خیال ہے ؟

ڈاکٹر صاحب :- میں کرامتوں کا قائل ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ پاک نفوس جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص دل اور خاص دماغ عطا کیا ہے ۔ اور وہ تزکیۂ نفس میں صاحبِ کمال ہیں۔ تیر از کماں جستہ اور آب از جُو رفتہ واپس لا سکتے ہیں۔

فوق صاحب :- قبروں پر جانا چاہیئے یا نہیں ؟

ڈاکٹر صاحب :- اگر مراد اس سے قبر پرستی ہے یعنی صاحبانِ قبور سے حاجات طلب کی جائیں جس طرح خدا کو حاضر ناظر سمجھ کر کی جاتی ہیں۔ تو میں اس کے خلاف ہوں ۔ بلکہ اس کو سخت گناہ سمجھتا ہوں۔ اور اگر قبروں پر جانے سے مطلب صرف فاتحہ پڑھنا اور عبرت حاصل کرنا اور موت کو یاد کرنا ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ ایسا ضرور ہونا چاہئے ۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی قائل ہوں کہ قبرستانوں پر خصوصاً کسی صاحبِ دل کے مزار پر جانے سے صفائی باطن بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

فوق صاحب :- پیر کی ضرورت ہے یا نہیں ؟

ڈاکٹر صاحب :- پیر یا مرشد کی سخت ضرورت ہے ۔ اس کے بغیر انسان کوئی صحیح اور کامل راستہ نہیں دیکھ سکتا ۔ روحانی فائدہ تو ان بزرگوں سے صرف انہی لوگوں کو ہوگا جو اہلِ دل ہیں۔ جن کے دل میں درد ہے ۔ جن کے قلب میں گرمی اور جن کی روح میں تڑپ ہے لیکن کم سے کم اخلاقی فائدہ تو ہر مرید حاصل کر سکتا ہے پیر کی صحبت سے (بشرطیکہ وہ پیر دکانداری نہ کرتا ہو) ہر مرید اپنا اخلاق سنوار سکتا ہے اور جس کا اخلاق درست ہے جس کے افعال ٹھیک ہیں اور جس کے اعمال "اعمالِ حسنہ" کہے جاتے ہیں اس سے بڑھ کر کون بہترین انسان ہو سکتا ہے۔

فوق صاحب : سازمنہ سلف کے سے اب پیر کیوں نہیں آتے ؟

ڈاکٹر صاحب:۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی ان اوصاف سے معرا ہے جن سے ایسے نیک وجود پیدا ہو سکتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں بڑے بڑے عالم، فلاسفر اور موجد پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ دنیا کی کاروباری زندگی میں مشینوں، انجنوں، اور نت نئی ایجادوں کے ذریعے جس قدر انقلاب ان لوگوں نے پیدا کیا ہے اس نے تمام دنیا اور بالخصوص اہل ہند کو عالم حیرت میں ڈال دیا ہے۔ مگر اس پر کبھی غور بھی کیا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے عالموں، فلاسفروں اور موجدوں کی طرح اور ممالک میں ایسے لوگ کیوں پیدا نہیں ہوتے! اس کے جواب میں سوا سوسائٹی کے تاثرات کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں علم و ہنر کا چرچا نہیں۔ جہاں دماغوں کے سوچنے اور غور کرنے کا کام نہیں لیا جاتا۔ وہاں ایک فلاسفر ایک عالم اور ایک موجد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے!

لیکن بعض مستثنیات بھی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ دکھانے کے لئے بعض دفعہ ایسے امور کا اظہار بھی کر دیتا ہے کہ سوسائٹی کا اثر بالائے طاق رہ جاتا ہے۔ اور انسان کو اپنی عاجزی اور بندگی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً گوتم بدھ کا ایک بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونا اور پھر فقیری اختیار کر لینا سوسائٹی کے اثر پر اگر غور کیا جائے۔ تو گوتم کے گرد و پیش جس قسم کی سوسائٹی تھی وہ دکھ، بیماری، فقر و فاقہ اور دردِ دل سے بالکل لاعلم اور عیش و عشرت اور تفریح و مسرت میں مست و مخمور رہا کرتی تھی۔ ایک بادشاہ کا بیٹا دکھ کو محسوس کرتا ہے۔ ایک عالم کی تکلیفوں کو اپنی ذاتی تکلیف سمجھتا ہے۔ اور اسی قلق سے مضطرب ہو کر سلطنت کو ترک کر دیتا ہے۔

عرب جیسے جاہل اور اجڈ ملک میں جہاں دنگہ فساد، خون خرابہ، لڑکیوں کا قتل اور دنیا جہاں کے دیگر عیوب ایک معمولی بلکہ تفریح کی بات سمجھے جاتے تھے وہاں ایک شخص درگاہ رب العزت سے اس قسم کا غیر معمولی دل و دماغ لے کر آتا ہے۔ جو ایک عالم میں نہ مٹنے والا انقلاب اور دلوں سے نہ محو ہونے والی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ میری مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ جو دنیا کے

سب سے بڑے آدمی اور اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص کا ایک روشن نمونہ تھے۔ ان کے گردو پیش اور نواحیات میں جس قسم کے حالات تھے ان کا خاکہ مولانا حالی نے اپنی ایک نظم میں اتارا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اہل عرب بات بات پر لڑتے تھے۔ اور لڑائی کا سلسلہ صدیوں تک جاری رکھتے تھے۔ ایک خدا کی جگہ کئی کئی خدا اور اپنے ہی ہاتھ کے بنائے ہوئے بت پوجتے تھے۔ شخصیت کا دور دورہ تھا۔ شراب اور فواحشات کی گرم بازاری تھی۔ انصاف اور قانون کا نام و نشاں نہیں تھا۔ ان حالات کی موجودگی میں ایسے رحمت اللعالمین کے وجودِ ذی جُود کی توقع کس طرح ہو سکتی تھی۔ جس نے عرب ـــ جاہل عرب ـــ کو وہ قابلِ فخر خطہ بنا دیا کہ آج دنیا کے مسلمان سرزمین عرب کو دنیا کا بہترین و افضل ترین خطہ تصور کرتے اور مکہ اور مدینہ پر جان فدا کرنے کو تیار ہیں۔

درحقیقت یہ ایک الٰہی قانون ہے کہ بڑے بڑے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں ان کے پیدا ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہوتی۔

وجودِ باری کا اعتراف

از جناب ابوالبیان حمادؔ صاحب

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ چیز ودیعت فرمادی ہے کہ وہ کائنات ارضی و سماوی کی بوقلمونیوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی ہستی کا معترف ہو جاتا ہے۔ انسان ہوش سنبھالنے کے بعد جب اپنے گرد و پیش کے حالات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی عقل سلیم اس کی شہادت دیتی ہے کہ اس عظیم الشان کارخانے میں کسی اقتدار بالا کی غیبی قوتیں کارفرما ہیں ؎

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

گو ہماری محسوس نگاہیں اس ذاتِ بالا و برتر کے مشاہدہ سے عاجز و درماندہ ہیں لیکن اس کی بے شمار تجلیات جو سطح عالم پر بکھری ہوئی ہیں اور ثوابت و سیاروں کی گردش اور سب سے بڑھ کر خود ضمیر کی آواز بھی مجبور کرتی ہے۔ کہ خدائے واحد کو تسلیم کریں لیکن چونکہ ہمارے اندر اور باہر بہت سی شیطانی قوتیں موجود ہیں جو ہر وقت ہمارے حق شناس جذبات سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ اور ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتی ہیں اس لئے بعض وقت انسان گمراہی کے راستہ پر جا پڑتا ہے۔ اور اُسے خدا کی ضرورت کا احساس نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ہمیشہ پیغمبر آتے رہے ہیں تاکہ انسان کے ذہن سے وعدۂ الست کا ذہول نہ ہونے پائے انہوں نے شیطانی قوتوں سے مقابلہ کرنے کے طریقے سکھائے۔ اور ضمیر کی آواز کو اُجاگر کر دیا جو شخص دامن انبیاء کرام کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے وہ یقین و ایمان کی روشنی میں اُن کے نقشِ قدم پر چل کر سعادت کی منازل طے کر لیتا ہے۔ اگر کوئی انبیاء کی راہنمائی کو قبول نہ کرے اور

جمیع مسائل حیات کو اپنی عقل کے بل بوتے پر حل کرنا چاہے تو اُسے قدم قدم پر لغزش کھانی پڑیگی کسی شخص کے لئے قطعاً اس کی گنجائش نہیں ہے کہ سرے سے وجود باری ہی کا انکار کر دے۔ جب کہ زندگی کے اکثر معاملات میں غیبی قوت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

تاریخ اقوام عالم کے مطالعہ سے بھی یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ایک مافوق الفطری طاقت کا اعتقاد انسانوں میں پایا جاتا رہا ہے صورتیں کتنی ہی مختلف رہی ہوں۔ تعیین و تعبیر میں کتنا ہی تفاوت پایا جاتا رہا ہو۔ لیکن مقصود سب کا ایک رہا ہے اور وہ ہے اپنی عبدیت کا احساس اور قوت مقتدرہ کا اقرار، درحقیقت یہ اُسی فطری داعیہ کا اقتضا ہے جو انسانی طبیعت میں مرکوز ہے اس میں وحشت و بربریت اور تہذیب و تمدن کا کوئی سوال نہیں ہے۔ کیونکہ زمانۂ قدیم کی اقوام جو تہذیب و شائستگی سے کوسوں دور تھیں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی شکل اور کسی نہ کسی رنگ میں اللہ کو مانتے تھے اور اس کی عبادت و بندگی کا حق بجالاتے تھے پیغمبر اس لئے نہیں آتا کہ از سرِ نو انسان کو اللہ کے وجود سے آشنا کرائے بلکہ اس کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ فطرت پر جو حجابات طاری رہتے ہیں انہیں ہٹا کر خدا ای کے جذبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے پھر اُسی کے ساتھ احکام شرعی اور جزئیات دین کی تعلیم دے۔ جن سے انسان نبی کی بعثت سے پہلے وجود باری کے اعتراف کے باوجود ناآشنا رہتا ہے۔ مشرک اور کافر انسانوں کو بھی کبھی اس کی جرأت نہ ہوئی وہ صاف طور پر اللہ کے وجود ہی کا انکار کردیں۔ وہ اس جرم کے ضرور مرتکب ہوتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں اصنام و اجرام کی پرستش کرتے ہیں اور ماسوا سے نصرت و تائید کے خواستگار ہوتے ہیں مگر پھر بھی اُن کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ حقیقت میں سب کا مالک اللہ ہی ہوتا ہے چنانچہ کفار مکہ کے متعلق قرآن میں مذکور ہے

قل من یرزقکم من السمآء والارض امّن یملک السمع والابصار ومن یخرج الحیّ من المیّت ویخرج

اے نبی! آپ کافروں سے پوچھئے کہ تمہیں زمین و آسمان سے رزق کون دیتا ہے کان اور آنکھوں کا مالک کون ہے

المیت من الحی ومن یدبر الامر فسیقولون اللہ فقل افلا تتقون (سورہ یونس)

مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو کون نکالتا ہے اور یہ تمام معاملات کون سرانجام دیتا ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ اللہ ہی ہے آپ کہئے کہ پھر کیوں شرک سے بچتے نہیں ہو۔

اور جب اُن سے بازپرس کی جاتی کہ اللہ ہی کو جب تم کائنات کا حقیقی فرمانروا مانتے ہو تو پھر اس کے ساتھ دوسروں کو کیوں شریک ٹھہراتے ہو اور کیوں اُن کی پوجا کرتے ہو اسکا جواب وہ دیتے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لیقربونا الی اللہ زلفا ہم بتوں کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ اُن کے ذریعہ بارگاہ الٰہی میں ہمیں تقرب حاصل ہو خدا کے بارے میں کافروں کی یہی وہ زبردست غلط فہمی تھی جس کو رفع کرنے کے لئے ہر نبی کو بے حد جانفشانی سے کام لینا پڑا اور تو اور بڑے سے بڑے سرکش انسان بھی جو خدائی کے دعویدار تھے اس حقیقت سے بیگانہ نہیں تھے کہ کائنات کا مالک صرف ایک اللہ ہے چونکہ حکومت کا نشہ غرور اُنکے سروں میں سمایا رہتا تھا اس لئے تفوق کی لذت حاصل کرنے کے لئے خدائی کا ڈھونگ رچایا کرتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے مابین خدا کی ہستی کے متعلق جو مناظرہ ہوا تھا اُس میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی تھی کہ خدا وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں حیات و ممات کی باگیں ہیں یہ سنکر اُس نے بھی ایک ایسی صورت ظاہر کی جو بادی النظر میں صفت احیاء و امانت سے یک گونہ مشابہت رکھتی تھی چنانچہ اُس نے ایک ایسے مجرم کو جو گردن زدنی تھا رہا کر دیا اور ایک بے گناہ کو مروا ڈالا نمرود اس قدر احمق نہیں تھا کہ وہ ایک معمولی سیدھی سی بات کو سمجھنے کی بھی اپنے اندر صلاحیت نہیں رکھتا تھا بلکہ انجان بن کر اُس نے آپ کو فریب دینا چاہا تھا پھر آپ نے پہلو بدل کر ایک دوسری صورت اس کے سامنے پیش کی جس کا وہ ہر روز مشاہدہ کیا کرتا تھا یعنی یہ کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اگر تو بھی خدائی کے منصب پر فائز ہے تو اُسے مغرب سے نکال کر دکھا یہ سنکر وہ ہکا بکا رہ گیا اور اُس کا کوئی جواب اُس سے بن نہ پڑا اسی طرح فرعون نے بھی خدائی کا دعویٰ کرتے ہوئے کبھی یہ نہیں کہا

کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے چاند سورج میں نے بنائے ہیں کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ ان سب کا خالق بجز اللہ کے اور کوئی نہیں ہے مگر چونکہ اُس نے قبولیت حق کے جذبہ کو کچل دیا تھا اس لئے خود ہی رب ہونے کا مدعی تھا الغرض انسان کی فطرت اُس سے تقاضا کرتی ہے کہ اللہ کے وجود کا دل سے اعتراف کرے مگر آج چونکہ عقلیات کی ترقی کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اس لئے کچھ ایسے حضرات پیدا ہو گئے ہیں جو اپنی روشن خیالی کے پردہ میں وجود باری کا انکار کرنے سے بھی نہیں چوکتے انہوں نے اپنی فطرت کو مسخ کر رکھا ہے اس لئے انہیں خیر و شر اور حسن و قبح میں کوئی امتیاز نہیں رہا۔ اُن کا زعم یہ ہے کہ یہ ہنگامۂ کائنات بخت و اتفاق سے یوں ہی برپا ہو گیا ہے پس پردہ کوئی قوتِ فاعلہ نہیں ہے جس کے ہاتھ میں اس کی زمام ہو یہ سلسلہ ہمیشہ یوں ہی چلتا رہیگا کبھی اس پر فنا طاری نہ ہوگی اگر منکرین ٹھنڈے دل سے سوچتے اور کارخانۂ عالم کے نظم و قرار میں غور اور تدبر کرتے تو اُن پہ یہ حقیقت منکشف ہو جاتی کہ اقرارِ خداوندی کے بغیر زندگی بسر کی ہی نہیں جا سکتی کیونکہ اُس کے انکار کا معنی یہ ہے کہ اُس نے زندگی بسر کرنے کے لئے جو طور طریق مقرر کئے ہیں انہیں ترک کر دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہے انسان کی فطرت میں وجودِ باری کا جو داعیہ موجود ہے اس کا مکمل ظہور ایسے اوقات پر ہوتا ہے جب کہ زندگی کے لالے پڑ جاتے ہیں اور موت آنکھوں کے سامنے رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے عموماً یہ صورتِ حال بحری سفر کے دوران میں پیش آتی ہے جب کہ بادِ مخالف کے تھپیڑے جہاز کو صحیح سمت سے ہٹا دیتے ہیں۔ اور جہاز کسی خطرناک گرداب میں گھر جاتا ہے اور بظاہر بچاؤ کی کوئی صورت نہیں رہتی اُس وقت کٹر دہریہ بھی مجبور ہوتا ہے کہ کسی ایسی قوت کو پکارے جو اُسے ورطۂ ہلاکت سے نجات دلائے اور جب نجات مل جاتی ہے تو پھر وہی عصیان و تمرد کی کیفیت عود کر آتی ہے چنانچہ قرآن میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللّٰہ مخلصین لہ الدّین	جب وہ جہاز میں سوار ہوتے ہیں تو اخلاص کے ساتھ اُسے
فلما نجّٰھم الی البرّ اذا ھم یشرکون (عنکبوت)	پکارتے ہیں اور جب خشکی کی طرف اللہ انہیں پہنچا دیتا ہے

تو شرک کرنے لگتے ہیں۔

جب تک انسان کو اللہ کے وجود پر اور اس بات پر کہ وہ ہر شخص سے اعمال کے متعلق باز پرس کریگا یقین نہیں ہوتا اُس سے کسی قسم کی نیکی کا صدور ممکن نہیں ہے اور نہ وہ اپنی انسانیت کی نشو و نما کر سکتا ہے خدا کا انکار کرنا اپنی فطرت کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔

مُسلمان کی حالتِ زار

مسلماں کا قرآں پہ ایماں نہیں ہے — وہ سب کچھ ہے لیکن مسلماں نہیں ہے

ازل میں جو باندھا تھا اُس نے خدا سے — اُسے یاد وہ عہد و پیماں نہیں ہے

جمائے ہوئے ہے وہ غیروں پہ نظریں — محمدؐ سے وابستہ داماں نہیں ہے

وہ دنیا کو عقبےٰ پہ دیتا ہے ترجیح — طلبگارِ فردوس و یزداں نہیں ہے

وہ ہو کس طرح موردِ رحمتِ حق — گناہوں پہ اپنے پشیماں نہیں ہے

تن آسانیاں رنگ لائیں بالآخر — کہ پہلی سی اب عظمت و شاں نہیں ہے

نہیں ہے اُسے دعویٰ عشق زیبا
کہ جس کا جنوں، چاک داماں نہیں ہے

(از ابوالبیان حمّاد)

معرکۂ اسلام و جاہلیت:۔ حق و باطل کی آویزش کی دیرینہ داستان۔ از قلم جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی جس کا دیر سے انتظار تھا، شائع ہو گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ۱) ۔

زیغی تاویلات

علامہ اقبال کے ایک مصرع کی تشریح

ع۔ ہر لئیمے رازدارِ دیں شد است

(از مرزا عزیز فیضانی دہالپوری)

(۱)

یہ کچھ آج کا نہیں بلکہ پرانا مرض ہے کہ قرآنِ حکیم کو تاویلاتِ فاسدہ اور بے اصول تفسیری موشگافیوں کی آماجگاہ بنایا جاتا ہے گو مندرجہ ذیل ایک شعر یا اور دوسرے لفظوں میں غیر شرعی شاعرانہ ہرزہ سرائی ہے اسلئے نا قابلِ التفات سہی مگر ایسے شعروں کا اثر نثر سے کہیں زیادہ ہوتا ہے نثر کو لوگ بھول جاتے ہیں مگر شعر زبان زدِ خلائق ہو جاتے ہیں ؎

لا تقربوا الصلوٰۃ زنہی ام بخاطر است

خامر یاد مانده گلوا واشربوا مرا

گویا "فی قلوبھم زیغ" والوں میں ایک شاعر نے بھی اپنا نام لکھا لیا۔ مگر اسے چھوڑیے بیچارہ تو مسخرگی کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ کوئی اقبال مرحوم ایسے بزرگ شاعر سے ایسی لغزش ہوتی (اور ایسے نیک شاعر سے ایسی لغزش خدانخواستہ کیوں ہونے لگی تھی) تو بہرحال افسوس بھی کرتے مسخرگی پر کیا افسوس۔ افسوس تو اُن پر ہے جو مفسر ہونے کے مدعی ہو کر یا مناظر و مصنف و مقررین کر قرآنِ حکیم کو "زیغی تاویلات" کا شکار بنانے سے نہیں چوکتے ان میں کچھ تو "بھولے بھالے" ہوتے ہیں جن پر یہ مصرع صادق آتا ہے ع

بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی

بھولے بھالے سے مراد یہ ہے کہ وہ بدنیتی سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے نیک نیتی سے تفسیری نکتہ بیان فرماتے ہیں مگر کم علمی کی وجہ سے لغزش ایسی ہوتی ہے کہ زیغ قلب والوں سے مشابہت تام ہو جاتی ہے یہ لوگ ملت کے نادان دوست ہیں۔

دوسرے وہ مفسدہ پرداز لوگ ہیں جو جان بوجھ کر وار کرتے ہیں ان لوگوں سے خدا بچائے۔ کہنے کو تو ہم انہیں دانا دشمن کہہ دیتے ہیں مگر کیا کریں ہمارے بہت سے مخلص مسلمان ان کے فریب میں آ کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ سخت مضر ہیں مقابلے میں چونکہ قرآن حکیم کو پڑھنے سمجھنے یا پڑھانے سمجھانے والے عموماً ہوشیار چوکیدار رہیں الا ماشاء اللہ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دانا دشمن ہمارے بھولے بھالے نادان دوستوں سے بہتر ہیں بالخصوص ایسے زمانے اور ان حالات میں کہ کس مپرسی کا عالم ہے آزادگی حد سے بڑھ رہی ہے ملت کے سب علوم خود ملت کی طرح لاوارث ہیں اور مقابلے میں طاغوتی اور "زیغی" طاقتیں خوفناک بلاؤں کی طرح منہ کھولے ہوئے چھا رہی ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر کا حال کیا نہ ہوگا دروازے بند نہیں چوکیدار محو خواب یا نیم بیدار ہیں چور صاحب ارادہ اور ان حالات سے واقف ہے پھر متاع قوم کی سلامتی معلوم!

(۲)

اگر ہمارے وہ حضرات جن کے ذمے علوم اسلامیہ کی حفاظت و نگرانی ہے (اشاعت و تبلیغ تو آجکل نصیب اعدا، صرف حفاظت و نگرانی ہی ہو سکے تو غنیمت ہے) بالکل سوئے ہوتے تو زیغی تاویلات کی ضرورت دشمنان دانا کو شاید نہ ہوتی وہ جو چاہتے بے اصل اور مہمل پیرائے ہی میں کہہ جاتے (گو ایسا بھی ہو رہا ہے) اور قوم امنا و صدقنا کہہ دیتی مگر یہ تو کچھ خدا کا فضل ہے جو "نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون" کی برکت کی وجہ سے ہے کہ ہمارے نگران کچھ نہ کچھ جاگتے ہیں اس لئے چور کو ہوشیاری سے کام لینا

پڑتا ہے یعنی تفسیر بالکل مہمل یا غلط ملط بلا دلیل نہیں کی جاتی بلکہ غلط تاویلات کی نشر و اشاعت کے لئے خاص الخاص ڈھنگ اختیار کئے جاتے ہیں مثلاً اصطلاحات کو یک قلم موقوف کرنے اور مصطلحات کے لغوی معنی پر زور دیکر شانِ نزول کا خیال نہ رکھتے ہوئے عام احوال پر ہی بنیاد قائم کرکے بلا آیات کے صرف مفید مطلب ٹکڑے لے کر مطالب کو بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔

یہ قصہ طویل ہے مگر چونکہ لذیذ نہیں اس لئے دراز تر بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر تفصیل و تشریح کی ضرورت اس لئے ضرور ہے کہ عوام الناس ان ارباب الحیل کے ہتھکنڈوں سے واقف ہو جائیں

(۳)

اس صحبت میں آیات کے ٹکڑے یا ماقبل مابعد (سیاق و سباق) کے بغیر آیات کو پیش کرکے مطلب کو بے مطلب اور بے ربط بنا دینے کی چند دلچسپ مثالیں جو سامنے آگئی ہیں بیان کرنے پر اکتفا کیا جائیگا باقی امور بشرطِ فرصت انشاء اللہ بعد میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔

سیاق و سباق کا خیال رکھنا تفسیر کے ضروری اصول میں سے ہیں یعنی ایک آیت کے اردگرد اور آیات کو بھی دیکھنا لازمی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کس موضوع پر آیات آرہی ہیں قرآن حکیم کوئی مجموعہ غزلیات نہیں کہ ایک ایک شعر کو الگ بھی پڑھ کر یا گا کر مجالس میں وجد طاری کیا جا سکے۔ اگر تو خوش الحانی سے قرآن حکیم پڑھوا کر لذت لینا مقصود ہے تو آپ ایسا کر سکتے ہیں اور اگر بمصداق

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر

(یعنی ہم نے البتہ قرآن حکیم کو آسان کر دیا سمجھے جانے کے لئے۔ پس کیا کوئی ہے سوچنے والا)

یہ ضروری ہے کہ قرآن حکیم کی کسی آیت کا مطلب سمجھا جائے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ ماقبل مابعد کو بھی دیکھ لیا جائے بلکہ قرآن حکیم میں کسی اور جگہ اس مضمون کی کوئی آیت ہے تو اُسے بھی زیرِ نظر رکھا جائے۔

مگر قہر تو یہ ہے کہ صرف ایک آیت ہی نہیں اُس کا بھی کوئی ٹکڑا پیش کر دیا جائے تو وہاں کیا کیا جائے

مثلاً اگر شاعر نے کہا کہ اُسے اوامر قرآن حکیم میں سے صرف "کُلُوْا وَاشْرَبُوْا" (یعنی کھاؤ پیو) یاد ہے گویا اُسے اُسکے ساتھ "وَلَا تُسْرِفُوْا" (یعنی فضول خرچی نہ کرو) یاد ہی نہیں اور نواہی میں سے اُسے صرف "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ" (یعنی نماز کے قریب نہ جاؤ) یاد ہے تو اُسے آپ مسخرہ سمجھ کر چھوڑ سکتے ہیں بھلا اگر اسی قسم کی حرکت کوئی مولوی صاحب کر گذریں تو پھر؟ آہ مگر نہیں، شاعر کو سُنکر تو آپ ہنس دیں گے اور واہ وا بھی کریں گے اور مولوی صاحب کی تاویل کو سُنکر جزاك الله کہہ دیں گے وہاں ادب ہے یہاں عقیدت ہے گویا آپ ادب نوازی وعقیدت مندی میں لگے رہیں اور قرآن حکیم کی تفسیر کا حال پتلا ہوتا رہے ع

ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

(۴)

ایک صاحب نے رسول مقبول صلعم کے وجود مبارک میں نعوذ باللہ باری تعالیٰ کا حلول ثابت کرنے کے لئے یہ آیت بطورِ دلیل پیش کی۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال)

(یعنی اے رسولؐ آپ نے کنکریاں نہیں پھینکی تھیں جبکہ آپ نے پھینکی تھیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھیں)

گو اسی میں ہے " إِذْ رَمَيْتَ " یعنی آپ نے پھینکیں اور یہ ٹکڑا اس فاسد تاویل کی تردید خود ہی کر رہا ہے کیونکہ یہ کنکریاں پھینکنے کا اثبات ہے مگر ان باتوں سے ایسے مولوی صاحبان کی تسلی کب ہوتی ہے اس لئے اگر وہ تکلیف فرما کر اس آیت کے پہلے حصہ کو دیکھتے تو وہاں لکھا ہوا ملتا کہ اصحابُ النبیؐ نے کفار کو قتل نہیں کیا (فلم تقتلوھم) بلکہ " وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ " یعنی اللہ تعالیٰ نے قتل کیا تو مولوی صاحب کی دلیل بازی کے اصول پر معاذ اللہ اصحابؓ رسولؐ کے جسموں میں بھی اللہ تعالیٰ کا حلول ثابت ہوا اور جو یہاں نہیں تو وہاں کیوں؟ مگر ما قبل مابعد کو تو وہ دیکھے جسے خطرہ ہو کہ تفسیر بیان کرتے ہوئے وہ غلطی کا شکار نہ ہو جائے جو نیک نیت اور محتاط ہو۔ جس کی نظر گہری ہو اور فکرِ سلیم یہاں تو منطق کا وہ اصول کار فرما ہے کہ

پہلے ایک بات دل میں ٹھالی جائے پھر اُس کے لئے دلائل کی تلاش شروع ہو بھلا نیت ہی یہ ہو تو ہدایت کس طرح اور کہاں سے ملے ہدایت تو اُسے ملتی ہے جو دلائل و شواہد سے یا غور و فکر سے اُسے تلاش کرے نہ کہ اُسے جو پہلے ہدائیت کی ایک صورت خود ہی تجویز کر کے دل میں ٹھالے پھر اُس کے لئے شواہد ڈھونڈے۔

(۵)

اسی طرح صرف اتنا ہی پڑھ کر کہ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (یعنی آگاہ رہو کہ اولیاء اللہ کو نہ تو خوف ہے نہ وہ غم کرتے ہیں) اولیاء اللہ سے مراد جس کی جو مرضی ہے وہی لے لی جاتی ہے عوام الطلاق کے اعتبار سے الفاظ " وہابی " اور " اولیاء " برابر مظلوم ہیں وہابی بھی اُس کو سمجھ لیا جاتا ہے جسے لوگ وہابی کہنا شروع کر دیں یعنی ذرا سا اختلاف نظر آیا تو وہابی کہہ دیا اسی طرح جس شخص میں فقیروں کی سی کوئی بات بھی نظر آگئی وہ ولی ہے خواہ شریعت کی راہ پر چلتا ہو یا نہ چلتا ہو مگر اس کا علاج آسان ہے بشرطیکہ شخص نیک نیت اور صاحب بصیرت ہو کر احتیاط کی راہ چلے اور یہ چاہیے کہ اولیاء کے معنی قرآن حکیم ہی سے متعین کرائے چنانچہ سیاق و سباق کے اصول کے مطابق اس آیت کے ساتھ ہی آگے اولیاء اللہ کی تشریح بھی کر دی گئی ہے فرمایا اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ یعنی اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جو تقوےٰ اختیار کرتے ہیں۔

(۶)

غرضیکہ کئی مثالیں مل سکتی ہیں مگر کاغذ کی گنجائش نہیں البتہ ایک پھڑکتی ہوئی مثال عبرتناک خاتمہ کے طور پر ضرور دی جائیگی اور وہ یہ کہ " مسلمان " نادان دوستوں کی دیکھا دیکھی غیر مسلم دشمنان دانا کو بھی جرأت ہوتی ہے اور سچ یہ ہے کہ خوب ہوتی یہاں تک کہ آریہ گزٹ لاہور کے ایک پرانے پرچہ ۱۹ جیٹھ سمت ۱۹۸۰ " کا ایک ٹکڑا دیکھ کر تو خواہ مخواہ منہ سے نکل گیا ؎

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

صاحب مضمون یہ ثابت کرنے کے لئے کہ "مسلمانوں کو حکم ہے کہ ان لوگوں کو قتل کردو جو اسلام نہیں لاتے یعنی وہی "اسلام بزورِ شمشیر" اسلام لاؤ ورنہ قتل ہونا قبول کرو" یہ آیت پیش کرتا ہے۔

"قاتلوا الذین لا یومنون باللّٰہ ولا بالیوم الاٰخر ولا یحرمون ما حرم اللّٰہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق"

ترجمہ:۔ "جنگ کرو ان کے ساتھ جو ایمان نہیں لاتے خدا پر اور نہ قیامت پر اور حرام نہیں جانتے جن کو خدا اور پیغمبرؐ نے حرام کیا اور سچے دین کو اختیار نہیں کرتے"

اس سے اُس نے بزعم خود ثابت کرلیا کہ جو لوگ بھی اسلام قبول نہیں کرتے اُن سے جنگ کرو اور اُس کی تشریح وہ یوں کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کو قتل کردینے کا حکم ہے حالانکہ یہ جنگ کا حکم ہے اور اس کے ساتھ بھی ایک شرط لگ رہی ہے جس کا بیان مضمون نگار نے عمداً چھوڑ دیا پھر لطف یہ ہے کہ آیت یہاں ختم بھی نہیں ہوئی اگلا ٹکڑا بلا فصل ہے اور وہ یہ ہے۔

حتّٰی یعطوا الجزیۃ عن یدٍ وّھم صاغرون

یعنی یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے درآں حالیکہ وہ مغلوب ہوں یعنی ایسے لوگوں کے متعلق حکم ہے جن سے جنگ ہو اور حکم یہ ہے کہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ یا تو وہ مسلمان ہو جائیں فاخوانکم فی الدین۔ یا جزیہ دینا قبول کریں اور ہر جنگ میں دنیا کی اقوام یہی کرتی آئی ہیں یا لڑ مرو یا ماتحتی قبول کرو۔

(۷)

القصہ ہمارے محافظین کو خوابِ غفلت سے نکل کر ہوشیار رہنا لازمی ہے مگر شرطِ اول یہ ہے کہ خود بھی سیاق وسباق کا خیال رکھتے ہوئے (اور خدا سے ڈرتے ہوئے) احتیاط سے تفسیر کیا کریں ورنہ اُنکو دیکھ کر غیر مسلم دشمنانِ دانا کو جو پہلے ہی تیار ہیں کھیل کھیلنے کا موقع ہاتھ آجائیگا۔

صوفی قرآن اور اقبال

کلام حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر یکے از اکابر صوفیا (قدس اسرارہم)

غازی بر ہِ شہادت اندر تگ و پوست ۔۔۔ غافل کہ شہید عشق فاضل تر ازو است

در روز قیامت ایں بداں کے ماند ۔۔۔ کیں کشتۂ دشمن است وآں کشتۂ دوست

کلامِ خدا

فضل اللہ المجاہدین علی القاعدین اجراً عظیما۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے جانباز سپاہیوں (مومنین) کو بیٹھے رہنے والوں پر اجر عظیم والی بزرگی بخشی ہے (النساء)

فضل اللہ المجاہدین باموالہم وانفسہم علی القاعدین درجۃ ط اللہ نے اپنے مال وجان سے جنگ و جہاد میں حصہ لینے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر درجہ و مرتبہ میں بزرگی عطا فرمائی ہے (النساء)

اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن اٰمن باللہ والیوم الاخر وجاھد فی سبیل اللہ۔ لایستوٗن عند اللہ واللہ لا یھدی القوم الظالمین (التوبہ)

کیا تم نے حاجیوں کی خدمت اور مسجد بیت اللہ میں نمازیں پڑھ لینے کو اللہ و یوم آخر پر ایمان رکھنے کے ساتھ اس کی راہ میں جنگ و جہاد کے برابر سمجھ رکھا ہے اللہ کے نزدیک یہ دونو باتیں برابر نہیں ہو سکتیں یعنی اسلام کے سپاہیوں کا درجہ تمام دوسرے نیک عمل مسلمانوں سے بہت بڑا ہے لیکن اللہ ناانصاف و غلط کار اور اپنی غلطی پر ضد کرنیوالے لوگوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

فرحین بما اٰتٰھم اللہ من فضلہٖ عالیمقام شہدائے جنگ و جہاد فرحاں و شاداں ہیں اُن کو

مراتب و نعیم پر جو خدا نے اپنے فضل و کرم سے انہیں عطا فرمائے ہیں یستبشرون بنعمة من اللہ و فضل و ان اللہ لا یضیع اجر المؤمنین مسرور ہو رہے ہیں اللہ کی نعمتوں اور اُس کی بخشی ہوئی عظمت و مرتبت سے اور اس بات کے مشاہدہ سے کہ اللہ مومنین مجاہدین کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا (آل عمران)

الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃً عند اللہ و اولٰئک ھم الفائزون (التوبہ) جو لوگ اللہ کے آقا اور مولا ہونے پر ایمان لائے اور جنہوں نے اُس کی حمایت میں وطن چھوڑا اور اپنے مال و جان سے اُس کی جنگیں لڑیں اللہ کے حضور اُن کا درجہ سب سے بڑا ہے اور ایسے ہی لوگ اس دنیا میں بھی فائز المرام ہونگے یبشرھم ربھم برحمۃ منہ ورضوان جنّٰت لھم فیھا نعیم مقیم خالدین فیھا ابدا ان اللہ عندہ اجرٌ عظیم (البرأۃ) ان کا پروردگار انہیں اپنی رحمت و خوشنودی کی بشارت دیتا ہے اور نیز اُن سرسبز زمینوں کی حکومت کی .... اور اللہ کے حضور تو ایسے لوگوں کے لئے بہت ہی بڑا اجر ہے۔

الا ان اولیآء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون الذین آمنوا وکانوا یتقون لھم البشرٰی فی الحیٰوۃ الدنیا والآخرہ (یونس) اللہ جنہیں دوست رکھتا ہے ان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں کی شادکامی و سُرخروئی عزت و حکومت اور راحت و عالیمقامی یقینی ہے۔ اللہ کی دوستی کے دعویداروں کی شناخت بھی یہی ہے کہ وہ اس کے ایسے کام میں حصہ لینے کو مستعد رہتے ہوں جنہیں جان کا خطرہ اور خون کی ضرورت اور شجاعت کا مطالبہ ہوتا ہے۔ فتمنّوا الموت ان کنتم صادقین۔

انّ اللہ اشترٰی من المومنین انفسھم واموالھم بانّ لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون۔ (البرأۃ)

کلامِ اقبال

اندازِ بیاں گرچہ بہت خوب نہیں ہے   شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ۔۔۔ یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست ۔۔۔ یہ مذہبِ ملّا و نباتات و جمادات

ہندی و مطل قسم کے مسلمانوں سے:۔

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور ۔۔۔ ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

خدا مست لوگوں کی نماز کے بارے میں:۔

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی ۔۔۔ اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

مسجدِ قرطبہ سے:۔

ہے تری شان کے شایاں اُسی مومن کی نماز ۔۔۔ جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود
اب کہاں میرے نفَس میں وہ حرارت وہ گداز ۔۔۔ بے تب و تابِ دروں میری صلوٰۃ اور درود
ہے مری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ ۔۔۔ کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلمان کا سجود

طارق کی دعا کے تحت میں

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے ۔۔۔ جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا ۔۔۔ سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن ۔۔۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی..
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو ۔۔۔ ہلاکت نہیں موت اُن کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے ۔۔۔ وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لا تذر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

خدنگِ آخریں

رودِ کاویری کا میا۔ اں جس کی جولانگاہ تھی
جس کی شمشیرِ دودم تھی مشعلِ برق کوہسار

ہے شہادت جس کی دنیا کے لئے درسِ حیات
جس کی بربادی پہ روتے ہیں دکن کے آبشار

جس کے مرتے ہی فقیروں کو نوید سلطنت ملتی گئی
جس کے اُٹھتے ہی اُٹھا دنیا سے پھر اہل وقار

جس کی تکبیروں سے گونجی سرزمینِ دکن تھی
گونجتے دشت و جبل تھے کوہسار و جوئبار

آج تک خونی قبا ہے کیوں دکن آفتاب؟
نہا نہایا خون میں یاں آخری اک تاجدار

دلہنیں اک رات کی بیاہی ہوئی بیوہ ہوئیں
میرِ صادق نے یہاں کھیلا تھا اُمت کا شکار

دفن اک مردِ جری ہے سرزمین دکن میں
دفن ہے یاں عز و جاہ اور دفن ہے وقار

ہم نے کھوئیں اس جگہ جملہ صفاتِ برتری
ہم نے دیکھی اس جگہ غداریوں کی تھی بہار

ظلمت و ادبار کی چھائی گھٹائیں چار سُو
قلب مومن تک بھی جن سے ہوگیا ہے تیرہ و تار

خود فروشی نے بھلایا حرم و قرآن و خدا
جامۂ احرام کو ہم نے کیا خود تار۔ تار

حق تعالےٰ سے جو ٹوٹے یاں تلک رسوا ہوئے
ہے جہادِ زندگانی سے ہمیں اب ننگ و عار

اک حماقت سے جو چھوٹے پھر حماقت ہم نے کی
غفلتوں کا رہ گیا اپنی نہ کچھ حد و شمار

صورِ اسرافیل بھی جن کو جگا سکتا نہیں
حشر تک سوتے رہینگے آہ! یہ غفلت شعار

ظلمتوں تاریکیوں کے ابر ہیں چھائے ہوئے
مشعلِ راہِ ہدایت ہے مگر تیرا مزار

دیکھ اے دل سطوتِ اسلام یاں مدفون ہے
"روئے یاں دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار"

(حافظ سراج الدین محمود بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ٹھکوی بہاولپور)

سید جمال الدین افغانی علیہ الرحمۃ

ذیل کا مضمون مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی نے اپنے اخبار "ہند" میں شائع کیا ہے مولانا کے شکریہ کے ساتھ ہم اسے "پیغام حق" میں شائع کر رہے ہیں - علاوہ ازیں یہ بھی طے کیا ہے کہ پیغام حق کا پرچہ بابت ماہ مارچ "جمال الدین افغانی" نمبر ہوگا - اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ اس پرچہ کے لئے ہمیں مضامین بھیجکر شکرگزاری کا موقع دینگے - (ایڈیٹر)

سید جمال الدین افغانی علیہ الرحمۃ افغانستان کے ایک مقام اسعد آباد میں ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے اور قسطنطنیہ میں ۱۸۹۷ء میں اپنے پروردگار سے جا ملے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سلطان عبد الحمید نے انہیں زہر دے کر مروا ڈالا۔

یہ بات اب تک تحقیق نہ ہو سکی کہ انہوں نے قدیم دینی و عقلی علوم و عربی زبان و ادب کی کہاں تعلیم حاصل کی۔ نہ افغانستان میں اس درجہ تبحر علمی کا سامان موجود تھا نہ ہندوستان ہی میں جہاں اوائل عمر میں ان کا صرف پشاور یا پنجاب تک آنا بیان کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ تمام قدیم علوم کے وہ امام تھے۔ اور عربی زبان میں تو خود مصر وغیرہ اسلامی ممالک میں مجدد تسلیم کئے جا چکے ہیں کیونکہ انہوں نے مر چکنے کے بعد اس زبان کو زندہ کیا اور شیخ محمد عبدہ اور زغلول جیسے انشا پرداز پیدا کر دیئے۔ در حقیقت ان میں ہر قسم کی علمی استعداد خداداد تھی خصوصاً زبانوں میں بہت جلد کمال حاصل کر لیا کرتے تھے چنانچہ ترکی زبان میں صرف چھ ماہ کے اندر تقریر کرنے لگے تھے عربی۔ فارسی۔ پشتو۔ انگریزی۔ ترکی۔ فرانسیسی۔ روسی زبانوں میں کامل تھے۔

لیکن جمال الدین کی عظمت صرف علوم و فنون اور زبان دانی تک ہی محدود نہ تھی ان کی زندگی کا

کا مشن یہ تھا کہ مشرقی خصوصاً اسلامی قوموں کو بیدار کر کے یورپ کی غلامی سے نجات دلائیں اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اپنا یہ مشن عام سیاسی لیڈروں کی طرح نہیں بلکہ پیغمبرانہ شان سے پورا کیا۔

جمال الدین افغانیؒ آزادی کے پیغامبر تھے انہوں نے کبھی شادی نہیں کی ان کی زندگی صرف ان کے مشن کے لئے وقف تھی۔ اور اپنے اندر اس قدر زبردست روحانی اثر رکھتے تھے کہ جہاں کہیں پہنچ جاتے تھے فوراً نوجوان ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور آزادی کی رُوح سے لبریز ہو جاتے تھے۔

مصر۔ ترکی۔ ایران۔ روس اور ہندوستان کے مسلمانوں سے وہ ملے اور یہ واقعہ ہے کہ جو شخص ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ گیا اپنے ہمعصروں سے ممتاز ہو گیا وہ گویا پارس تھے کہ اس سے مس ہوتے ہی ہر لوہا سونا بن جاتا تھا۔

جمال الدین کی شخصیت سے ان کے ہمعصر بادشاہ لرزتے تھے۔ ایران کے ظالم بادشاہ ناصرالدین شاہ قاچار کو انہی نے قتل کرایا سلطان عبدالحمید کا دبدبہ ساری دنیا کو معلوم ہے مگر یہ جابر اور قاہر سلطان بھی سید جمال الدین سے بید کی طرح کانپتا تھا۔

ذیل میں چند واقعات لکھتا ہوں جن کا تعلق سلطان عبدالحمید سے ہے اور جن سے قارئین کو اندازہ ہو جائیگا کہ یہ افغانی درویش کس عظمت کا مالک تھا۔

سلطان عبدالحمید کے پیر کا نام شیخ ابوالہدیٰ تھا مگر سید جمال الدّین اسے "شیطان" کہا کرتے تھے جب دونوں کی ناچاقی حد سے بڑھ گئی تو سلطان نے ایک رات اپنے مصاحبِ خاص منیر پاشا کو سید صاحب کی خدمت میں یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "امیر المومنین کی آپ سے التجا ہے کہ ان کے مرشد سے صلح کر لیجئے"

سید صاحبؒ نے غضب ناک ہو کر جواب دیا۔ امیر المومنین سے جا کر کہہ دو کہ اگر جبرئیل امین بھی آئیں اور میرے سر پر اپنے پروں کی ہوا دیں پھر کہیں رب العالمین فرماتا ہے کہ ابوالہدیٰ سے صلح کر لو

تو بھی میں اس شیطان سے صلح نہ کروں"

ایک مرتبہ سلطانی دربار میں سید صاحب شیخ الاسلام کے ساتھ داخل ہونے لگے شیخ الاسلام وزیراعظم سے بھی پہلے داخل ہوتا تھا اور معلوم ہے کہ سید صاحب وزراء سے پہلے دربار میں نہیں جا سکتے تھے چنانچہ وزیر تشریفاتی (چیمبرلین) نے روک دیا سید صاحب اپنی قیامگاہ پر چلے گئے دربار کے بعد سلطان نے پوچھا کہ سید صاحب کہاں ہیں؟ واقعہ بتایا گیا تو سلطان اپنے چیمبرلین پر بہت خفا ہوا فوراً معذرت کے ساتھ شاہی سواری بھیجی اور جب سید صاحب تشریف لائے تو سلطان نے بہت کچھ دلجوئی کے بعد کہا:۔

"یہ دیکھئے تمام شاہی خطابوں کی فہرست موجود ہے جو خطاب چاہئے قبول کر لیجئے یہ دیکھئے تمام تمغے رکھے ہیں جو تمغہ چاہئے اپنے سینے پر لگا لیجئے"

سید صاحب نے مسکرا کر جواب دیا:۔

"جمال الدین افغانی اس سے کہیں اونچا ہے کہ کسی بے معنی خطاب سے اس کا نام اونچا ہو یا پتھر کے کسی ٹکڑے سے اس کا سینہ زینت پا سکے"

ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل کے بعد سے سلطان عبدالحمید سید صاحب سے اور بھی زیادہ ڈرنے لگا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ کسی حسین نازنین عورت سے ان کی شادی کرا دے تمام امیرانہ سامان زندگی مہیا کر دے تاکہ وہ عیش و عشرت میں پڑ جائیں چنانچہ سلطان کے ارشاد سے وزراء و امراء سید صاحب کو ترغیبیں دیا کرتے تھے۔

امیر شکیب ارسلان کا بیان ہے کہ ایک وزیر نے سید صاحب کو بھری مجلس میں سلطان کا پیغام پہنچایا کہ شادی کر لیجئے۔ سید صاحب نے ترش رو ہو کر جواب دیا۔

"میں نے پوری عمر اس پرند کی طرح بسر کی ہے جو کبھی اس ڈال پر بیٹھتا ہے کبھی اڑ کر دوسرے ڈال پر چلا جاتا ہے پھر مجھے بھلا شادی بیاہ سے کیا مطلب؟

ایک اور وزیر نے اسی قسم کی ترغیب دی اور کہا "شادی کر لیجئے تاکہ اولاد ہو اور نام چلے۔ سید صاحب مارے غصہ کے لال ہو گئے جب وزیر چلا گیا تو حاضرین مجلس سے فرمانے لگے :۔

"مسلمانوں کی اس قوم نے کبھی فلسفہ و حکمت کی بو تک نہیں سونگھی یہ مادہ پرست سمجھتے ہیں کہ آدمی کا نام اولاد ہی سے چلا کرتا ہے" پھر فرمایا :۔

"مسلمانوں کی نجات ناممکن ہے جب تک بارہ برس کی عمر سے زیادہ کے تمام مسلمان بیک وقت مر نہ جائیں کیونکہ فساد ان کی رگ رگ میں بیٹھ چکا ہے"

سید صاحب مال و دولت کو حقیر سمجھتے تھے جب مصر سے جلا وطن کئے گئے تو اس حال میں تھے کہ صرف ایک لمبا کرتہ پہنے ہوئے تھے کیونکہ سوتے ہوئے پولیس نے اٹھا لیا نہ پاجامہ تھا نہ ٹوپی نہ جوتہ۔ پورٹ سعید میں ایک مالدار ایرانی کو خبر لگ گئی وہ سونے کی تین ہزار اشرفیاں لے حاضر ہوا اور کمال ادب سے عرض کرنے لگا۔

"یہ بہت ہی حقیر رقم ہے جسے میں پیش کرتا ہوں"۔

سید صاحب نے گنیاں اپنے کرتہ کے دامن میں ڈال لیں دونوں ہاتھوں سے اچھالتے تھے اور ہنس ہنس کر فرماتے تھے۔ یہ کیا ہے! یہ کیا ہے! پھر کہنے لگے۔ تمہاری محبت کا شکریہ! اگر تم اس کے زیادہ حاجتمند ہو لے جاؤ اپنے کام میں لاؤ میں شیر ہوں اور شیر جہاں جاتا ہے اپنا شکار پا جاتا ہے۔

نصیر الدین شاہ جب پیٹرز برگ (لینن گراڈ) پہنچا تو سید صاحب وہیں تھے۔ مستبد شہنشاہ نے حکم بھیجا کر میرے حضور میں حاضر ہو! سید صاحب　یہ حکم سن کر ہنسنے لگے اور قاصد سے فرمایا۔ جا کر اپنے آقا سے کہہ دو کہ جمال الدین فرعونوں سے ملاقات نہیں کرتا۔

زار روس سید صاحب کا بہت معتقد تھا۔ شاہ نے زار سے سفارش کرنے کی درخواست کی اور سید صاحبؒ نے اس شرط سے ملاقات منظور کر لی کہ شاہ انہیں اپنا وزیر اعظم بنائے گا اور ایران میں اصلاح جاری کرنے دے گا۔ شاہ نے یہ مطالبہ منظور کر لیا۔ ملاقات ہوئی پھر سیدؒ صاحب طہران گئے مگر چھ ماہ بھی نہ

گزرے تھے کہ شاہ سے عداوت ہو گئی۔ سخت بیمار تھے مگر شاہ نے یہ سزا دی کہ پیروں میں رسی باندھ کر سڑکوں پر کھنچوایا۔ اور گدھے پر سوار کر کے سرحد پار کر دیا۔ ایران سے جاتے وقت سید صاحب نے کہا۔ "اس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک شاہ کو قبر میں نہ پہنچا دوں گا۔" یہ دھمکی کھوکھلی نہ تھی سید صاحب نے سچ مچ عمل کر کے دکھا بھی دیا کیا خوب فرمایا ہے علامہ اقبال نے بال جبریل میں۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ

یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ!

یا حیرت فارابی یا تاب و تب رومی
یا فکر حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ!

یا عقل کی روباہی یا عشقِ ید اللٰہی
یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ!

یا شرعِ مسلمانی یا دیر کی دربانی
یا نعرۂ مستانہ کعبہ ہو کہ بتخانہ

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأت رندانہ!

(بال جبریل صفحہ ۹۸)

قائدِ ملّت کی یاد

مکرمی و محترمی سید محمد شاہ صاحب مدظلکم۔ اسلام علیکم ورحمۃ اللہ

"پیغامِ حق" میں علامہ اقبالؒ کے مضامین کا جو ترجمہ شائع ہو رہا ہے اس سے اُردو داں طبقہ کو علامہ مرحوم کے خیالات سے استفادہ کا ایک اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ حضرت قائدِ ملت لسان الاُمتؒ بڑے سخن لطیف اور بذلہ سنج السان تھے۔ ساتھ ہی محفلِ شعر و سخن میں وہ اک بڑے اچھے سخن فہم اور نقاد بھی تھے کبھی طبیعت موزوں ہو جاتی تو فی البدیہہ کچھ سنا بھی دیتے تھے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً مرحوم کی زبانی جو رباعیات سنی تھیں۔ وہ جناب کی خدمت میں مرسل ہیں براہِ کرم ان کو اپنے پرچہ میں جگہ دیجئے تاکہ محفوظ رہیں۔ ایک قطعہ اور تین رباعیات مع کچھ تفہیمی نوٹ کے حاضر ہیں۔

فقط والسلام

غلام محمد بی۔ اے۔ حیدرآباد (دکن)

۷۸۶

۱۶؍ رجب ۱۳۶۶ھ "یومِ خود مختاری سلطنتِ آصفیہ" کا جلسہ ہو رہا تھا" دار السلام" میں علاوہ اژدہامِ کثیر کے قائدِ ملت اور ان کے شرکاء موجود تھے۔ تقاریر کا سلسلہ جاری تھا اتنے میں مولوی سید محمد قاسم صاحب رضوی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ) صدرِ مجلس اتحاد المسلمین تعلقہ لاتور نے کاغذ کا ایک پُرزہ قائدِ ملت کی خدمت میں پیش کیا یہ کہتے ہوئے کہ "ابھی میں نے یہ رباعی کہی ہے" رباعی درج ذیل ہے۔

پنجرے کی فضا میں صیدِ آزاد ہے تو	پرواز پہ آمادہ پہ دل شاد ہے تو
"پنی دو میاں مِٹھو" تو کہہ لیتا ہے	آزادی کی بھولی ہوئی اک یاد ہے تو

قائدِ ملت نے ایک نظر دیکھا مسکرائے اور فوراً جیب سے قلم نکال اسی کاغذ کی پشت پر اس کا فی البدیہ قائدانہ جواب لکھ دیا۔ جو یہ ہے۔

"کیوں اپنا قفس دیکھ کے ناشاد ہے تو	مایوس جو ہو گیا تو برباد ہے تو
گر دل ترا آزاد ہے اے صیدِ قفس	آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے تو"

اسی طرح ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے یہ قطعہ بڑے مؤثر انداز میں سنایا تھا:۔

"دہکتی ہوئی اک انگیٹھی ہے یا دل	جہانِ فسردہ کو گرما رہا ہوں
سنا دو یہ خاشاکِ باطل کو جا کر	سنبھل جائیں میں آگ برسا رہا ہوں"

مرحوم کی دو اور رباعیات درج ذیل ہیں:۔

"آگاہِ رموزِ دینِ فطرت ہوں میں	کچھ مجھ سے سنو لسانِ اُمت ہوں میں
میں خطبہ سرا نہیں تو سونی ہے بزم	شاہنشہِ اقلیمِ خطابت ہوں میں"

"دولت کو جہاں کی آنی جانی سمجھو
عزت کو خدا کی اک نشانی سمجھو

اتراؤ نہ اپنی خوش بیانی پہ خلیق
اس کو بھی خدا کی خوش بیانی سمجھو

نوٹ:۔ حضرت لسان الامت خلیق تخلص فرماتے تھے۔

غلام محمد بی۔اے (عثمانیہ) حیدرآباد (دکن)

پیامِ عمل

یہ کون ہے ماضی پہ بہاتا ہے جو آنسو — کہہ دو کہ اُٹھے حال کو اپنے وہ سنوارے

کہہ دو کہ اُٹھے کام کا ہنگام یہی ہے — ورنہ ابھی آئیں گے نکل چاند ستارے

کہہ دو کہ سفینے کو خدا ہی پہ نہ چھوڑے — کچھ ہاتھ ہلائے ہی کچھ پاؤں بھی مارے

کہہ دو کہ کفن لے کے چلے راہِ طلب میں — ملتا نہیں موتی کبھی دریا کے کنارے

کہہ دو کہ یہ آندھی بھی یہ طوفان بھی تھمے گا — وہ اپنے سوا اور کسی کو نہ پکارے

کہہ دو کہ چلے کھول کے آنکھوں کو جہاں میں — ہر ذرے میں پوشیدہ ہیں حکمت کے اشارے

کہہ دو کہ پلٹ جائے گی تقدیر بھی کامل

تدبیر کے بل بوتہ پہ ہمت کے سہارے

کامل جونپوری

تجلیاتِ اختر

"خلیفۂ ہند" "زہرہ سخن" "سیدہ اختر صدر آل انڈیا زنانہ مسلم لیگ

جن سے ہوا تھا کبھی سینۂ عالم گداز — مجھ کو سنا دیجئے پھر وہ نوا ہائے راز

پھر دلِ بیتاب کو چاہیئے سوز و گداز — مطربِ آتش نفس چھیڑ دے اب اپنا ساز

ذوقِ طلب ہے تو پھر سود و زیاں سے گذر — راہِ وفا میں نہ کر فکر نشیب و فراز

آہی گئی آج نیند سنگِ درِ یار پہ — بیخودیٔ آرزو! عمر ہو تیری دراز

کہہ چکے سب حالِ دل بارگہِ دوست میں

اخترِ خاموش چھیڑ تو بھی حدیثِ نیاز

مسلم سے خطاب

از ابوالبیان حمّاد

تو اے مسلماں جو کرلے درست اپنا حال — خدا کی رحمتیں آئیں گی بہر استقبال

بروزِ حشر فقط پرسشِ عمل ہوگی — نہ کام آئینگے ہرگز وہاں یہ مال و منال

نفس میں گرمئ اخلاص کس طرح آئے — خیالِ صدقِ مقال و نہ فکرِ اکلِ حلال

بجائے شک و تردد یقین پیدا کر — خدا کے واسطے باطل کا خوف دل سے نکال

تو اپنے عہدِ گذشتہ کی یاد کر غافل — جہاں میں چھایا ہوا تھا ترا ہی رعب جلال

بلائیں سر پہ جو منڈلا رہی ہیں گوناگوں — یہ کیا ہے صرف ہماری ہی شامتِ اعمال

ترے جمود و تغافل سے ہے یہ اندیشہ — کہیں نہ کردیں زمانہ کی گردشیں پامال

ملا کے زہر وہ امرت میں دے رہے ہیں تجھے — سمجھ سکا نہ تو اعدا کی چال کو تا حال

غلام سازا زمانہ کا تو غلام نہ بن — ترے غلام ہیں لیل و نہار ماہ و سال

جو چاہے جلوہ حق کا مشاہدہ کرلے — تو اپنے ساتھ لئے جا متاعِ نیک اعمال

زمانہ بھر کو جو پیغامِ حق سنایا تھا — نہ کیوں ہو نازشِ دوراں بایں سبب اقبال

رضائے مولا کی گر ہے تجھے طلب حمّاد

جہاں کو کفر کی تاریکیوں سے جلد نکال

مَیں اور تُو

مرے چمن میں وہ پھولوں کے کارواں نہ رہے
جہاں میں بے خبرِ ہستیٔ خزاں ہو تم

سحابِ درد و محن چھائے ہیں مرے دل پر
شرابِ عیش میں مسرور و شادماں ہو تم

مرے شباب کی رنگینیاں ہوئی ہیں تمام
جہانِ زیست میں لیکن ابھی جواں ہو تم

خیالِ مرگ میں کٹتی ہے زندگی میری
بہت ہی دور ز اندیشۂ زیاں ہو تم

میں اک گدائے گنہگار ہوں زمانے میں
نہیں خبر ہے شہنشاہِ دو جہاں ہو تم

مرے ارادوں سے دنیا کی محفلیں تاریک
سنا ہے مجھ سے گدا پر بھی مہرباں ہو تم

گناہگار ہوں مجھ کو تو ہمکنار نہ کر
تو بحرِ بے کراں ہے فکرِ جوئبار نہ کر
حشر میں پھینک دے مجھ کو اٹھا کے دور کہیں
نگاہِ اہلِ بصیرت میں شرمسار نہ کر

کامل کاشمیری حال علی گڈھ

تنقید و تبصرہ

(از خواجہ عبدالوحید صاحب ریسرچ انسٹیٹیوٹ لاہور)

اقبال اور فکرِ اقبال

علامہ سر محمد اقبال سے ایک مرتبہ ایک شیعہ دوست نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا مظلوم کون ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ میرے نزدیک سب سے بڑا مظلوم قرآن ہے۔ سائل نے فرطِ حیرت سے کہا یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا۔ اس لئے کہ قرآن کا ترجمہ ایسے لوگ کرتے ہیں جو عربی زبان نہیں جانتے۔ مرحوم کا جواب کس حد تک صحیح تھا اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج دنیا کا سب سے بڑا مظلوم خود اقبال ہے۔ اس لئے کہ وہ اقبال جس نے کہا تھا کہ:۔

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

اسی اقبال کے اشعار آج ان جلسہ گاہوں پر آویزاں کئے جاتے ہیں جن کا مقصد دنیا میں شہنشاہیت او

سرمایہ داری کی بنیادیں مضبوط کرنا ہے۔

جب حضرت علامہ بقید حیات تھے اس وقت بھی ہندوستان کی نام نہاد اسلامی جماعتیں اور افراد ان کا نام اپنی اپنی اغراض کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اور اب بھی جب کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں ان کا نام بیچا جا رہا ہے۔ اگر وہ تمام کتابیں جو مرحوم کی وفات سے لیکر آج تک ان کے متعلق اُردو اور انگریزی میں شائع ہوئی ہیں۔ جمع کی جائیں۔ تو وہ سب کی سب (بجز چند ایک کے) ایسی نکلیں گی جن کی تصنیف یا تالیف کا مقصد پیسے کمانا ہے۔ ایسے حالات میں کسی ایسی تصنیف کا منظرِ شہود پر آنا غنیمت ہے۔ جس کے مصنف کا حقیقی مقصد اقبال کی شخصیت اور اس کے پیغام کا تعارف کرانا ہے۔ ایسی ہی ایک قابل قدر انگریزی تصنیف اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یعنی "اقبال ہز آرٹ اینڈ تھاٹ" مصنفہ سید عبدالواحد صاحب بی اے (آکسن) یہ کتاب حیدر آباد کے گورنمنٹ سنٹرل پریس میں طبع ہوئی ہے۔ اور اس کے ناشر لاہور کے مشہور کتب فروش شیخ محمد اشرف ہیں۔

اس کتاب میں سب سے پہلی چیز جو قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس کی ظاہری آب و تاب ہے۔ کتاب کا کاغذ طباعت۔ جلد۔ گرد پوش ہر چیز جاذبِ نظر ہے۔ اور ان چیزوں کو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ ہندوستان میں طباعت کا کام اب مغربی ممالک سے کسی طرح کم نہیں رہ گیا ہے۔ تمام کتاب میں جگہ جگہ کلامِ اقبال سے اُردو فارسی مثالیں مع انگریزی ترجمے کے دی گئی ہیں۔ اور یہ تمام اُردو فارسی اشعار بہت خوبصورت نستعلیق ٹائپ میں ہیں۔ جس سے کتاب کے حسنِ صوری میں گراں قدر اضافہ ہو گیا ہے

زیرِ نظر کتاب ایک مقدمہ، آٹھ ابواب اور انڈکس پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں علامہ مرحوم کے سوانح حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عمومی حیثیت سے یہ باب پُر از معلومات ہے۔ اگرچہ فنِ روایت کے اصولوں پر پرکھا جائے تو اس کی بہت سی باتیں بے اصل ثابت ہوں گی۔ اس باب میں بعض معمولی باتوں کو

غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ اور بعض بے حقیقت چیزوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مثلاً علامہ مرحوم پنجابی زبان میں شعر گوئی فرمایا کرتے تھے۔ علامہ مرحوم ایک زبردست قانون دان تھے۔ مرحوم ایک بلند پایہ ماہر تعلیمات تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے باب میں فاضل مصنف نے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی پر بڑی دلچسپ، مفید اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور تیقن کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس باب کے پورے غور اور توجہ سے پڑھ لینے والا علامہ مرحوم کے تخیل خودی کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو جاتا ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ فاضل مصنف کا اصلی مقصد اقبال کی تنقید نہیں بلکہ افہام و تفہیم ہے۔ انہوں نے اقبال کو خود سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اس نیک مقصد میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ فکر اقبال میں مسئلہ خودی کو جو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس کے مدِ نظر مصنف کی یہ کوشش ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ خودی سے اقبال کی کیا مراد ہے۔ خودی کن عناصر سے بنتی ہے۔ خودی کیوں کر راہ پاتی ہے۔ خودی کی ترقی کے اسباب و وسائل کیا ہیں۔ خودی کے راستہ میں کون کون سے حجابات و موانعات رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے دیگر اہم سوالات ہیں۔ جن کے جوابات اس باب میں دیئے گئے ہیں۔

فاضل مصنف نے اقبال کے فلسفۂ خودی پر جو عالمانہ بحث کی ہے یہاں اس کا خلاصہ بیان کر دینے سے قارئین کتاب کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ فرما سکیں گے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک خودی کی تین خصوصیات ہیں۔ اوّل مکان کی حدود کی پابند نہیں۔ دوم زمان حقیقی فقط اسی کے لئے ہے۔ سوم یہ انفرادی اور لامثال ہستی رکھتی ہے۔ انسانی خودی کرۂ ارضی پر دوگونہ مشن رکھتی ہے۔ ایک طرف یہ اپنے ماحول سے برسرپیکار رہ کر اُسے مسخر کرتی ہے۔ اور دوسری طرف یہ ایک تناؤ کی حالت قائم رکھتی ہے۔ اور اُسی ذریعہ سے بقا حاصل کر لیتی ہے۔ آزادی اور بقا پا کر خودی ایک طرف مکان اور دوسری طرف زمان پر غلبہ حاصل

کر لیتی ہے۔

اس کے علاوہ خودی نوع انسانی کو منازلِ ارتقاء طے کراتی ہوئی انسانِ کامل کی تخلیق کا باعث بنتی ہے اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کی بنیاد ارتقاءِ انسانی کی سہ گونہ حقیقت ہے۔ یعنی انفرادی آزادی ارتقاء ذات اور انسانِ کامل کی تخلیق۔ یہ ارتقاء کیسے پیدا ہوتا ہے۔ خودی کے تحفظ سے۔ انسان کو لازم ہے کہ ہر اُس چیز سے پرہیز کرے جو خودی کو کمزور کرتی ہے۔ اور ہر اُس چیز کو اختیار کرے جو خودی کو مضبوط کرنے والی ہے۔ ہر وہ چیز بُری ہے۔ جو خودی پر بُرا اثر ڈال سکتی ہے۔ اور ہر وہ چیز اچھی ہے۔ جو اُسے فائدہ پہنچا سکتی ہے آرٹ مذہب اور اخلاق ہر چیز خودی ہی کے مفاد کے نقطۂ نگاہ سے پرکھی جانی چاہیئے۔

خودی کی اس ماہیت کے مدِ نظر یہ دیکھنا ضروری ہے۔ کہ اُسے کون کون سے عناصر قوت۔ انضباط اور استحکام بخشتے ہیں۔ کلامِ اقبال کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ عناصر تعداد میں چھ ہیں۔ (۱) عشق (۲) فقر (۳) جرأت (۴) برداشت (۵) کسبِ حلال (۶) جدت پسندی اور شوقِ تخلیق۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ خودی کو کمزور بنانے والے عناصر کون کون سے ہیں۔ کلامِ اقبال میں ایسے عناصر حسبِ ذیل ملتے ہیں۔ (۱) خوف (۲) سوال (۳) غلامی (۴) غرورِ نسب۔ اگر اول الذکر عناصر اخذ کئے جائیں اور مؤخر الذکر عناصر سے پرہیز کیا جائے تو خودی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر ارتقائی سفر میں خودی کو تین منزلوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ اول اتباعِ قانون۔ دوم ضبطِ نفس اور سوم خلافتِ الٰہیہ۔

مذکورہ بالا تفصیل خودی کی انفرادی ترقی سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن خودی کی صحیح ترقی دوسرے افراد کے ساتھ مل کر ہی ہو سکتی ہے۔ انسانِ کامل خلافتِ الٰہیہ کے قیام کے لئے دوسرے انسانی افراد کے ساتھ مل کر کام کرنے پر مجبور ہیں۔ اس اشتراکِ عمل سے خود انسانِ کامل کا بہت بڑا فائدہ مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے اقبالؔ کے نزدیک ناگزیر ہے۔ کہ خودی اور سماج آپس میں ہم آہنگ ہوں۔ ایسا سماج

جو خودی کے لئے مناسب ماحول پیش کر سکے مندرجہ ذیل آٹھ اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔ (۱) اس کی بنیاد روحانی حقائق ہوں۔ جیسا کہ توحید۔ (۲) اس کا مرکزی نقطہ الہامی وجود یا نبوت ہو۔ (۳) اس کے لئے ہدایت ایک قانون ہو۔ (۴) اس کا ایک محسوس اور مادی مرکز ہو۔ (۵) اس کا ایک مقصود ہو۔ (۶) قوائے فعلیہ پر اُسے تفوق حاصل ہو۔ (۷) انفرادی خودی کی طرح اس میں جامعی خودی پیدا ہو۔ (۸) امومت کا تحفظ کیا جائے۔

کتاب کے تیسرے باب میں "اقبال اور مشرقی فکر" کے عنوان کے تحت یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ کون کون سے مشرقی مآخذ ہیں۔ جن سے علامہ اقبال اپنے افکار میں متاثر ہوئے۔ ان میں قرآن کریم سنت نبوی۔ صوفیاء بالخصوص رومی۔ ابن العربی اور عبدالکریم الجیلی۔ متکلمین اور بعض غیر مسلم مفکرین شامل ہیں۔ فاضل مصنف نے تفصیل کے ساتھ اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ کہاں کہاں اقبال کے فکر کے کون کون سے اجزاء ملتے ہیں۔ اس سلسلہ میں شائقین اقبال کی توجہ خاص طور پر رومی کی طرف مبذول کرانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کا بیشتر راہنما رومی ہے تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا علامہ مرحوم نے خود اپنے کلام میں رومی کو اپنا ہادی و راہنما تسلیم کیا ہے۔

نے آں نئے نوازے پاک بازے
مرا با عشق و مستی آشنا کرد

جاوید نامہ میں سیر افلاک کے دوران میں رومی ہی بیشتر شاعر کی راہنمائی کرتا ہے۔ اس بنا پر ضرورت ہے کہ رومی اور اقبال کی فکری مماثلت پر اہل علم غور فرمائیں۔ بقول ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب کے استفادہ اور کسب فیض کے لحاظ سے مجموعی طور پر اقبال نے رومی سے اس درجہ اثر قبول کیا ہے کہ ہم اقبال اور رومی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔[۱]

کتاب کا چوتھا باب "اقبال اور مغربی فکر" اُن حضرات کی توجہ کا خاص طور پر مستحق ہے جو مغرب پرستی

---

[۱] مضمون "اقبال اور رومی" در رسالہ "ماہ نو" بابت ماہ [illegible] ۱۹۴۴ء صفحہ ۱۰۸

کے نشہ میں سرشار رہنے کے باعث اکثر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اقبالؔ اپنے افکار میں فلاں فلاں مغربی مفکر کا خوشہ چین
ہے۔ فاضل مصنف نے بڑی وقتِ نظر کے ساتھ اس چیز کو تفصیل کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ اگرچہ اقبالؔ کے
فکر کے مختلف اجزا دسے ملتے جلتے افکار مختلف مغربی مفکرین کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اقبالؔ
ان میں سے کسی ایک مفکر کا بھی خوشہ چین نہیں۔ اس سے بڑھ کر انہوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ بعض
ایسے مغربی مفکر جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اقبال نے اُن کی تقلید ہی میں سب کچھ کہا اپنے افکار و آرا میں
درحقیقت اقبال سے مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ اس سلسلہ میں مصنف نے نطشے کی مثال پر خوب روشنی
ڈالی ہے۔ اس لئے کہ یہ اکثر سنا گیا ہے کہ اقبال کے ہاں جس "مرد" کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اُس کا چربہ نطشے
کے SUPERMAN سے لیا گیا ہے۔ سید عبد الواحد صاحب نے یہ بات اچھی طرح واضح
کر دی ہے کہ اقبال کا "مرد" نطشے کے SUPERMAN سے بالکل متضاد شے ہے۔ یہ باب پورے
غور و فکر کے ساتھ پڑھے جانے کے قابل ہے۔ اور مغربیت پرست مسلمان نوجوانوں کی خاص توجہ کا مستحق ہے

اس باب کے آخر میں فاضل مصنف نے یہ دعوےٰ کیا ہے کہ علامہ مرحوم نے اپنا زمان و مکان کا
نظریہ آئن سٹائن کے "نظریہ اضافیت" سے بہت پہلے شائع کر دیا تھا۔ اس دعوےٰ کے ثبوت میں تاریخی
شواہد درکار ہیں۔ اس لئے کہ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے علمی دنیا جانتی ہے کہ "نظریۂ اضافیت" ۱۹۱۲ء
میں شائع ہو چکا تھا۔ اور اُس وقت تک علامہ مرحوم کی مثنویاں "اسرار" و "رموز" بھی منصۂ شہود پر
جلوہ ریز نہ ہوئی تھیں۔

کتاب کا پانچواں باب "اقبال کا فنِ شاعری" اور چھٹا باب "اُن کی غزلیہ شاعری" کے متعلق ہیں
اور یہ دونوں باب شاہد ہیں کہ فاضل مصنف نے کلامِ اقبال کا مطالعہ کس قدر شغف اور انہماک کے
ساتھ کیا ہے۔ ساتویں باب کا موضوع "مثنویاں" ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس باب میں فاضل مصنف نے
مثنویوں کی جو فہرست دی ہے اس میں علامہ مرحوم کی نظمیں "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" کیوں شامل

کر لی گئی ہیں۔ اس لئے کہ انہیں ان کی بحر کے مد نظر کسی طرح بھی غلطیاں قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کتاب کا آخری باب علامہ مرحوم کی نثر نگاری پر ہے۔ جہاں تک انگریزی نثر کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے لیکچروں کا مجموعہ انگریزی داں دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ اور پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ایک کتاب کی تصنیف کی بنا پر ڈاکٹر صاحب انگریزی زبان کے بلند پایہ انشا پردازوں کی صف میں شریک ہو گئے ہیں۔ لیکن مرحوم کی اُردو نثر نگاری کے متعلق ایسا دعوےٰ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ ان کی تمام اُردو تحریروں کا سرمایہ بہت قلیل ہے۔ نہ مرحوم نے کثیر تعداد میں اُردو نثر میں کتابیں لکھیں نہ مضامین لکھے نہ پمفلٹ شائع کئے۔ اپنی دو تین کتابوں پر مختصر مقدموں اور "مخزن" مرحوم کے صفحات پر دو یا تین مختصر مضامین کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اُردو نثر میں بہت کم لکھا حیدر آباد سے حال ہی میں "مضامین اقبال" کا جو اُردو مجموعہ شائع ہوا ہے۔ وہ بیشتر مرحوم کے انگریزی مضامین کے تراجم پر مشتمل ہے اقتصادیات پر مرحوم کی ابتدائی کتاب اُردو میں تھی لیکن محض اس کتاب کی بنا پر یہ قرار دینا کہ وہ اُردو بلند پایہ نثر نگار تھے مناسب نہیں۔

بلاشبہ مرحوم کے اُردو مکاتیب کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ لیکن یہ مکاتیب تاحال اس کثرت کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے کہ ان کی بنا پر مرحوم کی نثر نگاری کے متعلق نظریات قائم کئے جا سکیں۔

آخر میں دو ایسی باتوں کا ذکر ضروری ہے جو کتاب کے محاسن پر نامناسب اثر ڈالتی ہیں ایک تو یہ کہ کتاب کے پروف پڑھنے میں بڑی لاپرواہی برتی گئی ہے۔ جس قدر اہتمام کتاب کی طباعت کے دوران میں اس کے دوسرے ظاہری محاسن کا کیا گیا تھا۔ اگر اسی قدر اہتمام پروف کی تصحیح کا بھی کر لیا جاتا تو کتاب کا حسن دو بالا ہو جاتا ہے۔

چند کتابیں جو اسی ہفتہ میں طبع ہو کر آئی ہیں

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں - مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف جو پہلی مرتبہ چھپ کر آئی ہے جس میں الٰہ، رب، عبادت اور دین ان چار قرآنی اصطلاحات کا قرآنی مفہوم مولانا مودودی نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر - یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک نہایت مفید تصنیف ہے جس میں نماز اور روزہ کی حقیقت اور نماز و روزہ کے ادا کرنے والوں کی ذہنی کیفیتوں کا نقشہ مولانا نے اپنے جادو نگار قلم سے کھینچا ہے۔ قیمت ایک روپیہ

تعلیم کا مسئلہ - ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی نے تعلیم کا ایک انقلابی نظریہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ نے نوبل پرائز حاصل کیا ہوا ہے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں ریاضی کے شعبہ کے ہیڈ ہیں۔ اور مسلم لیگ نے جو آل انڈیا تعلیمی کمیٹی بنائی ہے اس کے صدر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے تعلیم سے متعلق بالکل انوکھی اور اچھوتی تجاویز پیش کی ہیں۔ ہر شخص کو یہ کتاب پڑھنی چاہیئے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ابوجعفر منصور - خلافت عباسیہ کے دوسرے نامور خلیفہ ابوجعفر منصور کے سوانح حیات پڑھیئے اور یہ دیکھئے کہ خلافت عباسیہ کو مستحکم کرنے کیلئے خلیفہ منصور نے کیا کیا اور اُن کی سلطنت کہاں کہاں تک تھی۔ تاریخ عباسیہ کا یہ زریں ورق مطالعہ کے قابل ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

القول الجمیل - مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی یہ نایاب کتاب عربی زبان میں طبع ہو کر آگئی ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

پتہ: اقبال اکیڈمی - ۵۴ (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور

علامہ اقبال پر لٹریچر

روح اقبال:۔ مصنفہ ڈاکٹر پروفیسر یوسف حسین خاں ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی اس سے بہتر اردو زبان میں علامہ پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی قیمت پانچ روپے چار آنے

فکر اقبال:۔ علامہ کے متعلق اب تک جو بہترین مضامین لکھے گئے تھے اُن کا ایک قابل قدر مجموعہ قیمت چار روپے

آثار اقبال:۔ ایک نہایت عمدہ کتاب جس کی خوبیاں پڑھنے سے معلوم ہوتی ہیں قیمت چار روپے

فلسفۂ عجم:۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے اُس مضمون کا انگریزی سے اردو ترجمہ جس پر آپ کو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ قیمت تین روپے بارہ آنے

اقبال پر ایک نظر:۔ ڈاکٹر اقبال کے نظریۂ توحید نظریۂ الٰہیات اور آپ کی شاعری پر ایک مکمل تبصرہ قیمت دو روپیہ

شرح اسرار خودی:۔ از پروفیسر یوسف سلیم بی۔اے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

تعلیمات اقبال:۔ بڑی دیر کے بعد دوسرا ایڈیشن طبع ہو کر آیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

اقبال کا تصور خودی:۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی قیمت آٹھ آنے

اقبال اور پیام حیرت:۔ از پروفیسر سلیم چشتی بی۔اے قیمت ۸/

اقبال کا تصور زمان و مکان:۔ از ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم۔بی۔ایچ۔ڈی قیمت ۱۰/

اقبال کے چند جواہر ریزے:۔ علامہ اقبال کے ملفوظات کا ایک قابل قدر مجموعہ قیمت دس آنے

موت و حیات اقبال کے کلام میں:۔ از ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی قیمت ۱

ملنے کا پتہ

منیجر اقبال اکیڈیمی ۵۴ (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور

قارئین پیغامِ حق کی خدمت میں ایک دردناک اپیل

برادرانِ اسلام! میں اس سے قبل دو تین مرتبہ دبی دبی زبان میں اشارہ کر چکا ہوں کہ پیغامِ حق کی اشاعت بہت کم ہے اس کی طرف توجہ کرنا آپ کا فرض ہے مگر مجھے نہایت شرم اور افسوس کے ساتھ آج کہنا پڑتا ہے کہ آپ حضرات کے جمود اور بے حسی کو قطعاً جنبش نہیں ہوئی۔ میری استدعا پر اگر کبھی کسی نے توجہ کی ہے تو وہ میاں علم الدین صاحب پنشنر آف کالاباغ اور خان عبدالحمید صاحب آف سرحد ہیں۔ ان دو حضرات نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ جس سے میں ان کا ممنون ہوں۔ اس کے علاوہ دو ایک اور حضرات نے بھی ٹالنے کی کوشش کی ہے مگر باقی سب حضرات خاموش رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے رسالہ کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔

اگر میں ظاہر کروں کہ پیغامِ حق کو چندہ دے کر پڑھنے والے کتنے حضرات ہیں تو آپ کو یقیناً تعجب ہو۔ نہ صرف تعجب بلکہ شاید شرم بھی آئے کہ ایک ایسے رسالہ کی مالی اعانت اور توسیعِ اشاعت کے لئے آپ نے اب تک کچھ نہ کیا۔ جو رسائل حیا سوز لٹریچر شائع کرتے ہیں ان کی وسعتِ اشاعت کو دیکھئے جو رسائل بے دینی اور الحاد پھیلا رہے ہیں ان کے خریداروں کی تعداد کو دیکھئے تو آپ حیران ہو جائیں آپ کو معلوم ہے کہ ان رسائل کی اشاعت کیوں زیادہ ہے؟ مجھ سے سنئے۔ اس ذوق کے رکھنے والے اپنے ذوق کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ آپ کو اپنے ذوق کے پھیلانے، دین کی اشاعت کرنے اور اشاعت کرنے والوں کی امداد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے اسلئے "پیغامِ حق" اور اس قسم کے رسائل کی اشاعت بہت ہی محدود ہے۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ اگر آپ کسی دفتر میں ملازم ہیں تو اپنے دفتر والوں کو ترغیب دیجئے کہ وہ "پیغامِ حق" خریدیں اور اس کے قابلِ قدر مضامین سے اپنے روح اور قلب کو تر و تازہ کریں اگر آپ کسی دفتر میں ملازم نہیں تو اپنے محلہ یا اپنے حلقہ

زیرِ اثر ہیں رسالہ کی توسیع کی کوشش کیجئے ورنہ شاید ہمیں کبھی نہ کبھی یہ روزِ بد دیکھنا پڑے کہ ہم رسالہ کے بند کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ رسالہ اپنے اخراجات نہیں نکال رہا اور ہر ماہ نقصان میں جا رہا ہے۔ اگر آپ رسالہ کو پسند کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ رسالہ جاری رہے تو پھر آپ کا فرض ہے کہ آپ بھی اس کے لئے کام کریں۔ براہ کرم آج ہی اپنے احباب کو ملئے اور اُن سے رسالہ کا ذکر کر کے اور خریداری کی منظوری لے کر اسی صفحہ پر یا الگ کاغذ پر اُن حضرات کی فہرست بھیج دیجئے جن کو آپ نے خریداری پر آمادہ کر لیا ہے تاکہ میں اُن کے نام رسالہ بذریعہ وی۔پی جاری کرا سکوں۔ والسلام

دعاگو

محمد شاہ

---

(۱) ________________________________

(۲) ________________________________

(۳) ________________________________

(۴) ________________________________

(۵) ________________________________

(۶) ________________________________

(۷) ________________________________

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاکستانی

جیبی جنتری

۱۹۴۵

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم اے

مکتبہ پاکستان

۵۴۔ سرکلر روڈ۔ بیرون موچی گیٹ۔ لاہور

قیمت ۴؍

ترجمان القرآن

...ت حضرت شاہ ولی اللہ ...	۸؍-
معرکہ اسلام و جاہلیت ...	۸؍-
حقیقت نفاق	۸؍-
کتب سماوی پر ایک نظر ...	۸؍-

زیر طبع

اسلام اور وطنیت ...	۸؍-
افادات حافظ ابن قیم ...	۸؍-
اشتراکیت اور اسلام ...	۸؍-

ملنے کا پتہ

اقبال اکیڈمی

۵۴ (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور

تالیفات

سید ابوالاعلیٰ مودودی

تفہیمات	۳/۸/-
تنقیحات	۲/۸/-
پردہ	۲/۸/-
خطبات	۲/۸/-
رسالہ دینیات	۱/۸/-
حقوق الزوجین	۱/۸/-
تجدید و احیائے دین ...	۱/۸/-
مسئلہ قومیت ...	۱/۸/-
سیاسی کشمکش حصہ اول ...	۱/۸/-
" " " دوم ...	۲/۸/-
" " " سوم ...	۱/۱۲/-

ملنے کا پتہ

اقبال اکیڈمی

۵۴(الف) سرکلر روڈ بیرون موچیدروازہ لاہور

مضامین

ابوالاعلیٰ مودودی

نبوت محمدی کا عقلی ثبوت ...	۶/-
اسلامی حکومت	۶/-
اسلام کا نظریہ سیاسی ...	۶/-
اسلام و جاہلیت	۶/-
سلامتی کا راستہ	۶/-
دین حق	۶/-
انسان کا معاشی مسئلہ ...	۶/-
جہاد فی سبیل اللہ ...	۶/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ...	۸/-
اسلامی عبادات پر ایک نظر ...	۱/۰/-

ملنے کا پتہ

اقبال اکیڈمی

۵۴۔(الف) سرکلر روڈ بیرون موچیدروازہ لاہور